چند اہم مضامین

سالانہ چھ روپیہ
Yearly Rs. 6/

فی پرچہ آٹھ آنے
Single Copy As

رجسٹرڈ صفحہ　　۲۹۰

خدا پرستی، انصاف اور امن کا پیامی

ادارۂ تحریر:-
سید اصغر علی عابدی
عمر بن عبداللہ ایم اے

ماہنامہ انوار
حیدرآباد دکن

سالانہ چھ روپے
قیمت فی پرچہ
سہ ماہی
آٹھ آنہ

جلد ۲　　　　شمارہ ۵

مندرجات

مقام اشاعت:- حیدرآباد دکن

آنے والے دنوں میں

انوار کے ہمدردوں کو انوار سے اکثر شکایت رہی ہے کہ پرچہ وقت پر شائع نہیں ہوتا وقت پر پوسٹ نہیں ہوتا وغیرہ لیکن انشاء اللہ آنے والے دنوں میں ایسا نہیں ہوگا۔ انوار وقت پر شائع ہوگا اور وقت پر پوسٹ کر دیا جائے گا۔ بات دراصل یہ ہے کہ جن مشکلات سے ہم دوچار ہیں اور جن حالات میں ہم نے یہ کام شروع کیا تھا ان سے کچھ ہم ہی اچھی طرح واقف ہیں یا پھر وہ رفقاء جو خود بھی کام کرتے ہوں۔ ورنہ عام ناظرین کو کیا معلوم کہ رسالہ نکالنے میں کیسے کیسے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ اور پھر ایک ایسا رسالہ جس میں "مالیات" کو بڑھانے کی جدوجہد تقریباً صفر ہو اور جس کی بقاء اور ترقی کا سارا دارومدار محض رحمت باری پر رکھا گیا ہے۔

ہم بارگاہ رب العزت میں سربسجود ہوتے ہیں کہ اس نے ہمیں جادۂ حق پر ثابت قدم رکھا اور روز بروز ہمارے لئے کامیابی کی راہیں کھلتا جا رہا ہے۔ خیرخواہان انوار سے درخواست ہے کہ وہ ادارے کی ہر جہتی معاونت کریں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کریں تاکہ یہ کام پروان چڑھے اور ہر آنے والے دن میں اشاعت حق کے لئے زیادہ سے زیادہ کارآمد اور مفید بنتا جائے۔

مدیر "انوار"

نوازش نامے

ایک دوست لکھتے ہیں: "تفہیم القرآن زیادہ سے زیادہ شائع کیجئے"
دوسرے دوست لکھتے ہیں: "تفہیم القرآن کی اشاعت روک دیجئے،
کیونکہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ اس کو دیکھتے ہی بدک جاتا ہے اور
"پرانی چیز" سمجھ کر انوار
کے کسی مضمون کا مطالعہ
نہیں کرتا"

بظاہر یہ دو متضاد باتیں
ہیں لیکن مقصد دونوں کا
ایک ہی ہے۔ پہلے رفیق
"تفہیم" کی مدد سے اشاعت
حق کو تیز سے تیز تر کرنے
کے خواہشمند ہیں اور دوسرے
ایک ایسے طبقے میں جو قرآن
کے موضوع پر کوئی چیز پڑھنے
سے گریز کرتا ہے۔ صرف
"ادب" کے ذریعے سے قرآن
کی طرف بلانے کا ارادہ رکھتے
ہیں۔ ورنہ اُس کو قرآن
سمجھانا ان کے بھی پیش نظر ہے
لیکن ہم دونوں رفقاء سے
عرض کریں گے کہ بھائی! کچھ دنوں اور صبر سے کام لیجئے۔ ہم کوشش
کر رہے ہیں کہ انوار کے صفحات میں کچھ اضافہ ہو جائے تو پھر "تفہیم" کے لئے
ایک حصہ الگ ہی مقرر کر دیا جائے اور اسلامی ادبیات کے لئے پورے

سرسری نظر میں

تازہ انوار آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اگرچہ یہ کچھ تاخیر سے حاضر ہو رہا ہے
لیکن "دیر آید درست آید" کے مصداق آپ ایک سرسری نظر ہی میں
جان لیں گے کہ اب کے انوار نے کچھ اور ترقی کی ہے اور راہِ حق میں چند قدم
آگے بڑھ گیا ہے۔ پچھلے سلسلوں
کے علاوہ "اشتراکیت کی
مسیح کاذب" ایک معلومات افزا
اور مفید مضمون ہے جس پر غور
کرنے کی ہم اپنے "انقلابی
ساتھیوں" کو دعوت دیتے ہیں
اور "سماجی انقلاب" کے
کارکنوں کے لئے بھی
غور و فکر کا کافی سامان موجود
ہے۔ اس کے بعد "کیا لکھوں"
میں لکھنے والے نے خون جگر
کو خشک کیا ہے۔ اور "درندہ"
"نغمۂ جاں بخش" "رباعیات"
"فکر و نظر" "سیل فنا" اور
"جہاں تصور" تسکین گوش و
ہوش کے ساز و سامان میں
گلدستوں اور بیل بوٹوں
کی طرح سجے ہوئے ہیں۔ اس قلمی تعاون و ایثار پر ہم اپنے قلم کاروں کے
مشکور و ممنون ہیں۔ آخری بات "خوشگوار تصفیہ" پر ختم ہوتی ہے اور ہونا
بھی یہی چاہیئے کیونکہ اس کے بعد ہی "مسائل حاضرہ" کا خوب حل کر

[illegible] کے لئے

انوار کا "ادبیات نمبر" آ رہا ہے

ادارۂ انوار کی جانب سے گزشتہ اشاعت میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ ادارہ عنقریب اپنے
ناظرین کی خدمت میں اسلامی طرز فکر کے ادبیات کا ایک کارآمد اور مفید مجموعہ پیش کرے گا اور
اس سلسلے میں تحریکِ اسلامی کے ادیبوں اور قلم کاروں سے بھی اپیل کی گئی تھی کہ وہ جلد سے
جلد اپنی بہترین کاوش فکر روانہ کر دیں۔ اب دوبارہ اس امر کی طرف ہم اپنے قلم و قرطاس
کے ساتھیوں کو متوجہ کرتے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ الگ الگ ہر ادیب کی خدمت میں
"درخواست نامہ" روانہ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئیگی۔ اور یہ مضمون سب کے لئے
کافی ہوگا۔ جو رفیق اس کا مطالعہ کریں وہ یہ سمجھیں کہ مخاطبت بس انہی سے ہے۔

چند اہم اصناف ادب

جن پر "ادبیات نمبر" مشتمل رہے گا۔

(۱) ڈرامہ (۲) تنقید (۳) نظم (۴) فسانہ
(۵) انشائے لطیف (Light essay) (۶) "ادب پارے"

ہمیں اُمید ہے کہ ہمارے فن کار ان موضوعات کو ملحوظ رکھکر اپنی اولین فرصت
میں ہمارے ساتھ تعاون کریں گے۔ جتنی جلدی وہ اس طرف توجہ کریں گے اتنی ہی
جلدی یہ انقلاب پرور "ادبیات نمبر" منصۂ شہود پر آجائے گا۔ مدیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

"مسلمانوں کیلئے آئندہ لائحہ عمل؟"

حیدرآباد کے پچھلے نظام کے درہم برہم ہوجانے کے بعد مسلمانوں کا ایک طبقہ "آئندہ لائحہ عمل" کی تلاش میں سرگرداں ہے، اس طبقہ میں کئی قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو کانگریسی اصولوں کے حامی ہیں یا اس کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھ رہے ہیں۔ دوسرے وہ جنھیں اشتراکیت اور کمیونزم میں اپنی نجات کے سامان دکھائی دے رہے ہیں۔ اور تیسرے وہ جو پھر سے اُسی پچھلی "قوم پرستی" کو زندہ کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں اور ہندو قوم کے اختلافات میں سے اپنے لئے ایک نئی راہ نکالنے کے منصوبے باندھ رہے ہیں۔ ان گروہوں اور طبقات کے علاوہ ایک چوتھا "سمجھدار" طبقہ ایسا بھی ہے جو حیدرآباد سے بوریا بستر لپیٹ کر پاکستان چل دینے ہی میں مسلمانوں کی فلاح سمجھتا ہے۔ گویا اس گروہ کے نزدیک مسلمانوں کے لئے "آئندہ لائحہ عمل" پاکستان کی راہ ــــ ہے لیکن درحقیقت یہ لوگ اپنی ذاتی اور نفسانی اغراض کی خاطر در انفرادی جذبۂ تحفظ کے تحت یہ اقدام کر رہے ہیں بعض صورتیں ایسی ہو سکتی ہیں جن میں انفرادی مصالح واقعی اہمیت رکھتے ہوں لیکن ان پاکستان جانے والوں میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے۔ جن کو عام مسلمانوں سے نہ تو کوئی ہمدردی ہے اور نہ وہ ان کے لئے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کے سامنے صرف اپنا ذاتی مفاد ہے اپنے اہل و عیال اور اپنے افراد خاندان کی بہتری' اور صرف اپنے لئے ترقیوں کی راہ ہموار کرنا۔ اور ان رنگین خوابوں کو شرمندۂ تعبیر ہوتے دیکھنا جن کو انھوں نے حیدرآباد کے گذشتہ دور میں بستروں پر لیٹے لیٹے دیکھا تھا۔

آج کے لمعات میں ہمیں ان چوتھے درجے کے اصحاب سے کوئی گفتگو نہیں کرنی ہے۔ اپنی قوم کے لئے وہ کون سا مفید کام کر رہے ہیں اس کا اندازہ خود ان کے ضمیر ہی کر سکتے ہیں البتہ ان کے علاوہ جو تین گروہ مختلف نظریات اور اصولوں میں اپنی پناہ کی جگہ تلاش کر رہے ہیں آج ہمیں انہیں سے کچھ کہنا ہے۔

پچھلے دنوں جو مصیبت حیدرآبادی مسلمانوں پر نازل ہوئی اس کے چند مخصوص اسباب تھے، جن پر ہم گزشتہ لمعات میں کافی تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ اس لئے آئندہ اگر مسلمان کوئی ایسا راستہ معلوم کرنا چاہتے ہیں جس میں اُن کے لئے تباہی و ہلاکت کی ایسی راہ ہموار نہ ہو جس پر چل کر ایک بار پھر وہ قعر مذلت میں جا گریں تو اس کی واحد صورت صرف یہ ہو سکتی ہے کہ جن غلط نظریات اور

غلط اصولوں پر انھوں نے گذشتہ دور میں زندگی گذاری تھی اُن کو وہ پھر سے دہرانے کی جسارت نہ کریں۔ گذشتہ زمانے میں جو فاش غلطیاں اُن کی قوم سے سرزد ہوئیں وہ یہ تھیں کہ ایک طرف انھوں نے غیر اسلامی طرز حکومت کو "اسلامی حکومت" کا نام دے کر سراہا اور اس متبرک نام کے پردے میں ایک مخصوص گروہ کو اپنی اغراض نفسانی اور خواہشات حیوانی کی تکمیل کے لئے بے لگام چھوڑ دیا دوسری طرف مسلمانوں نے مغربی ممالک اور خود اپنے ملک کے قوم پرستوں کی پیروی میں ایسی سیاست ایجاد کی جو مسلمان قوم کے مزاج، اس کی اصولی حیثیت اور انبیا علیہ السلام کی دعوت کے نہ صرف منافی تھی بلکہ اُس کی تخریب اور کامل تباہی پر اس غیر اسلامی سیاسی تنظیم کی عمارت کھڑی ہوتی تھی چنانچہ جب مسلمانوں نے اپنی اصل کو فراموش کر کے، اپنے مسلمان ہونے اور دوسرے انسانوں سے ممیز و ممتاز ہونے کے اسباب کو نظر انداز کر کے دنیا کی دوسری ناخدا شناس قوموں کی حیثیت اختیار کر لی تو عذاب اور تنبیہ کی وہ وجوہات جن کے باعث اللہ تعالیٰ اپنی اس زمین پر کئی اور قوموں کو ہلاک کر چکا ہے ان کے لئے بھی فراہم ہو گئیں اور مسلمان دیکھتے ہی دیکھتے اس سرے سے اُس سرے تک پامال کر کے رکھ دئے گئے۔

ضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ وباءُ بغضب من اللہ ذالک بانھم کانو یکفرون بآیت اللہ۔

"ان پر ذلت اور محتاجی مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کے عذاب میں گھر گئے یہ اس لئے کہ وہ خدا کی آیات سے کفر کرنے لگے تھے۔"

یہ کائنات اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے۔ اسی کی با جبروت ہستی کے ہاتھ میں اس کا سارا نظام ہے وہی اپنی منشا اور اپنے اصولوں کے مطابق اس کا نظم چلاتا ہے۔ اس لئے اگر ہم اس کائنات کی حقیقی حیثیت کو نظر انداز کر کے اپنے طور پر اس کو کچھ اور حیثیت دے لیں تو اس سے حقیقت نفس الامری میں کوئی فرق نہیں آجاتا۔ خدا نے عذاب اور تنبیہ کا جو قانون مقرر کر رکھا ہے اس کے مطابق اس کے مخفی ہاتھ اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور کسی کو بر سر عروج لاتے اور کسی کو تباہیوں کے گہرے غار میں پھینک دیتے ہیں۔ مسلمانوں سے خداوند کریم نے جو وعدے فرمائے تھے وہ ان کے مومن ہونے کی شرط سے مشروط تھے؛ لا تھنو ولا تحزنوا انتم الاعلون ان کنتم مومنین۔ ورنہ مسلمان کوئی اونچی ذات کی قوم نہیں تھی۔ جو خدا کی بلا وجہ لاڈلی ہو، اور دنیا کے دوسرے انسان کچھ برہما کے پیر سے پیدا نہیں ہوئے تھے کہ ان پر خواہ مخواہ ذلت و مسکنت طاری کر دی جاتی؛ اور مسلمانوں کو ان پر حکمرانی کا دائمی اجارہ حاصل ہو جاتا۔ پس مسلمان اگر اپنے زخمی جسم اور پراگندہ ذہن کو پھر سے بحال کرنا چاہتے ہیں اور اس بات کے متمنی ہیں کہ وہ زندہ رہیں اور انسانیت کی مفید خدمت انجام دیتے رہیں تو انھیں پھر سے اپنی اصلی پوزیشن پر لوٹ آنا ہوگا۔ انھیں سیدھے سیدھے اسلامی اصولوں کو اپنی پوری زندگی میں اختیار کرنا ہوگا۔ اور انھیں دوبارہ اسلام قبول کر لینا پڑے گا۔ اگر آج مسلمان اپنی دنیاویت (Secularism) کو چھوڑ دیں، اپنی نفسانی اور قومی اغراض کو پیش کر کے دوسرے انسانوں سے دوری کی جنگ

ما نگنے یا ...علی کے لئے لڑنے کے طریقوں کو ترک کردیں اور صرف ان اصولوں کی بقا اور تحفظ اور قیام کے لئے جدوجہد کرنے والی جماعت (PARTY) بن جائیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ تمام انسانوں کی فلاح و بہبود کے لئے بھیجے ہیں تو پھر اس جماعت مسلمین سے کئے ہوئے وعدے بھی خداوند کریم کی طرف سے پورے ہو سکتے ہیں۔ ورنہ اس کے بغیر یہ قطعاً ناممکن ہے کہ ایک طرف مسلمان دنیاویت، کو اختیار کئے رہیں اور پھر بھی اللہ تعالیٰ اُن کو نوازتا رہے، مسلمان اسلام کی غلط نمایندگی کرتے رہیں اور خدا کی رحمتیں اُن کے اوپر برابر برستی رہیں، نعوذ باللہ خدا کچھ ناانصاف اور ظالم نہیں ہے جو کسی نفسانی خواہش کے تحت دوسروں پر خواہ مخواہ ظلم کرنے اور مسلمانوں کو کھلی چھٹی ہو کہ اُس کی سلطنت میں جس طرح چاہے رہیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب انسان برابر ہیں۔ اس کے نزدیک اگر کوئی باعزت ہے تو صرف وہ جو اُس سے ڈرے۔ (اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ)۔

جو لوگ حیدرآباد میں اور حیدرآباد کے باہر پورے ہندوستان میں ___ مسلمانوں کو کانگریس کی طرف بلا رہے ہیں انہیں اس بات کا شعور نہیں ہے کہ مسلمان فی الواقع کس قسم کے گروہ کو کہتے ہیں اور مسلمان کون کونسے کام کرکے مسلمان رہ سکتا ہے۔ یہ لوگ مسلمانوں کو اسی طرح کی ایک جامد قوم یا گروہ تصور کرتے ہیں جیسا کہ مسلم لیگ سمجھتی تھی اور ___ ان لوگوں کے پیش نظر بھی اُسی قسم کے مادی فائدے اور وقتی بھلائیاں ہیں جیسے مسلم لیگ یا اتحاد المسلمین کے سامنے تھیں - یہ بھی دانستہ یا نادانستہ مسلمانوں کو وہی پیٹ اور معدے کے راستے پر لئے جا رہے ہیں۔ اور ان کا نقطۂ نظر بھی اُتنا ہی پامال اور اسلام کی شاہراہ سے ہٹا ہوا ہے جتنا کہ ان سے قبل کے رہنماؤں کا تھا۔ اور جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں مسلمان کی تباہی کا اصلی سبب یہی ہے کہ اس نے ایک دفعہ خدا سے اپنی مسلمانی کا عہد کرکے اُسے توڑ دیا اور وہ اپنے اس وعدے سے پھر گیا جو اس نے موت کے بعد دوسری دنیا میں حاضر ہونے اور اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے اعمال کی جواب دہی کے تصور سے لرز کر کیا تھا۔ کانگریس کے نقیبوں اور پچھلے مسلم لیگیوں میں اگر کوئی فرق ہو سکتا ہے تو صرف یہی کہ یہ "نئے" لوگ کانگریس سے مل کر حکومت کی خوشامد اور چاپلوسی کرکے' اپنی اغراض کی تکمیل چاہتے ہیں جن کو مسلم لیگ خم ٹھونک کر اور میدان میں دو بدو لڑ کر حاصل کرنا چاہتی تھی ورنہ حقیقت میں دنیاویت اور غرض پرستی ان دونوں کی قدر مشترک ہے۔ پس کیا صرف طریقۂ کار کے اختلاف پر ہم ایک کو اچھا اور دوسرے کو بُرا قرار دیدیں؟ اور کیا "دنیاویت" کے تجربے سے ابھی اتنا خسارہ نہیں ہوا ہے کہ ہم دوبارہ اسے آزمانے کی جرأت کریں؟

ہمارے "کانگریس پسند" احباب اکثر یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر ہم نے کانگریس میں شریک ہو کر اُس کو طاقتور نہ بنایا تو پھر دوسری جماعتیں میدان پر چھا جائیں گی اور وہ کانگریس سے زیادہ ہمارے لئے نقصان کا باعث ہوں گی" یہ خیال ایک حد تک بہت وزنی اور معقول معلوم ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ پوری ہمدردی اور دردمندی کے ساتھ مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہو ___ لیکن ایسا کہنے والے دراصل نظری طور پر اور واقعاً

کا ایک بہت ہی سرسری سا جائزہ لے کر یہ بات اپنی زبان سے نکالتے ہیں۔ کانگریس اس وقت جس کل انتشار سے دوچار ہے اور اس کو جن اندرونی اور بیرونی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے وہ اس کی فطری اور اصولی کمزوری کا نتیجہ ہے۔ آزادی ہند سے قبل وہ بھیڑ جو کانگریس کے ساتھ ہو گئی تھی اس میں سماجی، معاشی، سیاسی، اور مذہبی و اخلاقی نقطۂ نظر کے اعتبار سے لاتعداد مخالف گروہ تھے۔ اور یہ سب گروہ صرف اس لئے کانگریس کے ساتھ ہو گئے تھے "کہ آزادی" ان سب کا مشترکہ ورثہ تھا، لیکن اب "آزادی" حاصل ہو چکی ہے۔ اور وہ مشترکہ مقصد سب کو مل گیا ہے جس کے لئے سب جمع ہوئے تھے لہٰذا اب ان کا منتشر ہو جانا اور الگ الگ پلاٹ فارموں پر چڑھ جانا ایک فطری امر ہے۔ اگر کانگریس نے آزادی" سے قبل ہندوستان کے مختلف رجحانات رکھنے والے گروہوں کے سامنے کوئی ایک نظام فکر، رکھا ہوتا اور کسی ایک باقاعدہ اور ہمہ گیر نظام زندگی کے بندھن سے ان کو باندھ دیا ہوتا اور ان کے آپس کے اختلافات کو یک قلم دور کر دیا ہوتا تو اس بات کا امکان تھا کہ آزادی کے بعد بھی وہ کانگریس ہی کے جھنڈے تلے جمع رہتے اور اسی کی تعریف میں میٹھے میٹھے نغمے الاپتے۔ لیکن اب ایسی کوئی صورت موجود نہیں ہے اس لئے اگر مسلمان اس گرتی ہوئی عمارت کا ساتھ دیں تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ اس کے ملبے کے نیچے دب کر وہ بھی ختم ہو جائیں گے۔ وہ لوگ جو آج کانگریس کے مخالف ہیں، مسلمانوں کو اپنے اختلاف کا سب سے پہلے نشانہ بنائیں گے۔ اور جس طرح اس سے قبل "مسلم لیگ دشمنی" میں مسلمانوں پر مظالم ڈھائے گئے اسی طرح آج "کانگریس دشمنی" میں مسلمانوں کو ایک بار پھر کچلا اور روندا جا سکتا ہے۔ ایک اور لحاظ سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کی کانگریس میں شرکت خود کانگریس کے لئے بھی نقصان دہ ہے۔ اگر ہماری نظر آزادی ہند کے بعد کے واقعات پر ہے تو ہم بآسانی اس چیز کو سمجھ سکتے ہیں کہ جتنا مسلمان کانگریس سے قریب ہوئے ہیں اتنا ہی ایک خاص نقطۂ نظر کا طبقہ کانگریس سے کٹا ہے، اسی طرح جتنا کانگریس مسلمانوں سے قریب ہوئی ہے اتنا ہی وہ طبقہ کانگریس کا دشمن بلکہ اس کے خون کا پیاسا تک بن گیا ہے — کیا گاندھی جی کا قتل اس بات پر کھلی ہوئی شہادت نہیں فراہم کر رہا ہے؟ پس جو لوگ ان تمام حالات سے آنکھیں بند کر کے مسلمانوں کو کانگریس کی طرف بلا رہے ہیں وہ نہ صرف مسلمانوں کے بلکہ کانگریس کے حق میں بھی سخت برا کر رہے ہیں۔ وہ دانستہ یا نادانستہ سب سے بڑے کانگریس دشمن ہیں۔ ناتھو رام گوڈسے مہاسبھا کا رکن نہیں تھا وہ.... تو دراصل ان مسلمان بزرگوں میں پوشیدہ ہے جو کانگریس کی مسند پر تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔!

مسلمانوں اور ہندوؤں میں جو منافرت پیدا ہو گئی ہے اُسے بے شک دور ہونا چاہیئے اور مسلمانوں کو خالص غیر فرقہ وارانہ تنظیم کے تحت یہ کام کرنا ہوگا کیونکہ تنگ نظری چاہے وہ کسی قسم کی ہو آج اُس کی قلعی کھل گئی ہے اور اب وہ زیادہ دنوں تک دنیا میں نہیں چل سکتی۔ لیکن اس کی صورت وہ نہیں ہے جو کانگریس سے جھوٹی ہمدردی رکھنے والے بیان کر رہے ہیں۔ مسلمانوں نے ہندوستان کی دوسری قوموں سے جو دشمنی مول لی ہے اُس کی پشت پر ایک تو گذشتہ دس سالہ غلط سیاسی جدوجہد کا بوجھ ہے اور پھر اس سے بھی بڑا بوجھ وہ ہے جو پچھلے سات آٹھ سو سال کے عرصے میں نام نہاد مسلمان فرمانرواتاریخ کے طویل راستے پر چھوڑ

آئے ہیں۔ یہ وہ بھاری بوجھ مسلمانوں کو اپنے کندھوں سے اتار پھینکنا ہیں اور اس کی صورت صرف یہی ہوسکتی ہے کہ مسلمان من حیث الجماعت خالص اسلامی اصولوں پر اپنی جداگانہ تنظیم کریں اور انسانوں کی بے لوث اور بے غرضانہ خدمت کرکے یہ دکھا دیں کہ حقیقت میں وہ وہ نہیں ہیں جو اب تک دنیا ان کو سمجھتی رہی ہے یا جیسا اب تک مسلمان بادشاہوں اور مسلمانوں کی سیاسی جماعتوں نے اُن کو پیش کیا ہے ۔ وہ تو دراصل ایک "خیر امت" ہیں جس کا کام لوگوں سے اپنی خواہشات نفسانی کے لئے لڑنا نہیں بلکہ خود نیکی کے راستہ پر چلنا اور دوسرے انسانی بھائیوں کو نیکی کی طرف دعوت دینا ہے ، خود برائی سے بچنا اور دوسروں کو برائی سے بچانا ہے ۔ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر۔

دشمنی ، رشک وحسد اور نفرت وحقارت کی وہ آگ جو اس وقت ملک کے ہندو حضرات یا اور دوسرے گروہوں میں مسلمانوں کے خلاف بھڑک اُٹھی ہے صرف اسی طرح ٹھنڈی ہوسکتی ہے، اور تاریخ کا وہ بھاری بوجھ جو عہد وسطیٰ کے غلط کار اسلاف نے ان کے اوپر لاد دیا ہے صرف اسی طرح اُن کے کندھوں سے اُتر سکتا ہے۔ ورنہ اس کے بغیر اگر مسلمان اپنی اس غلط حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے کسی اور جماعت میں شریک ہوجائیں تو اس سے نہ تو مسلمانوں کو اور نہ خود اُس جماعت ہی کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے کیونکہ ایسی صورت میں پچھلے غلط اعمال کا بوجھ تو مسلمانوں پر برابر لدا ہوا رہے گا اور اُس پر نئی خام کاریوں اور نئی غلط کاریوں کا ایک بوجھ اور چڑھ جائے گا جو ان کے کمزور کندھوں کو بالکل ہی جھکا دیگا۔ پھر یہ دوہرا تہرا بوجھ لاد کر مسلمان جب دوسروں کے ساتھ ہوں گے تو اُن کے لئے بھی ایک بہت بڑا اور خطرناک بوجھ بن جائیں گے۔

کیمونزم یا اشتراکیت کی طرف لپکنے والے گروہ کی حالت فکری اعتبار سے بہت ہی خستہ ہے۔ ان لوگوں میں ایک طبقہ تو وہ ہے جو نسلی قوم پرستی کے محاذ پر ہاری ہوئی جنگ کو اس نئے محاذ پر لڑکر جیتنا چاہتا ہے اور اس بات کا متمنی ہے کہ رضاکار نہیں کیمونسٹ بن کر ہی اپنے جذبۂ انتقام کی پیاس بجھائے ! لیکن اس جاہل اور خوش فہم طبقہ کو یہ نہیں معلوم کہ مسلمان جو لڑائی بھی باطل کے مورچے سے لڑے گا۔ اُسے بہرحال شکست ہوگی۔ کیونکہ جب "مسلمان" کسی باطل طریقے کو اختیار کرلیتا ہے اور اسی غلط اصول پر چلتا ہے تو وہ غیر ارادی طور پر اس حق پر ضرب لگاتا ہے جس کو اس نے مسلمان کا لقب اختیار کرکے قبول کیا تھا۔ اور جب خود ایک داعی حق یہ بدترین کام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو دی ہوئی تمام مراعات چھین لیتا ہے اور اس کے تمام حقوق سلب کرلے جاتے ہیں اور اُسے ذلت اور پستی میں گرا دیا جاتا ہے۔ ہم پچھلے دور میں یہ دیکھ چکے ہیں کہ ہم نے خود غرضانہ لڑائی لڑکر، اور غیر اسلامی مقاصد کے لئے جد وجہد کرکے شکست کھائی ہے اور تباہ و برباد ہوگئے ہیں تو پھر آیندہ یہ کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ انھیں اغراض ومقاصد کو لے کر ایک دوسری پارٹی کے ساتھ جد وجہد کی جائے تو کامیابی ہوجائے گی۔ اور مسلمان کیمونزم

کے ذریعہ سربلند اور سرفراز ہو جائے گا! وہ بنیادی غلطی جو ہم نے کی تھی اگر اب بھی موجود رہے تو یہ قطعی امر ہے کہ ہم اور زیادہ مٹیں گے اور زیادہ پامال ہوں گے۔ ایک اور بے وقوفی جو یہ لوگ کر رہے ہیں وہ اپنی خواہشات کی تکمیل سے زیادہ اپنے دوستوں کی اغراض کی تکمیل ہے جب مسلمانوں نے کمیونسٹوں کے ساتھ مل کر لڑنا شروع کر دیا تو وہ کمیونسٹوں کی لڑائی رہی۔ ان کی لڑائی وہ ہوئی کب۔ جس طرح ہندوستان کی آزادی سے قبل ہندوستانی سپاہی انگریزوں کی فوج میں بھرتی ہو کر ان کی تقویت کا باعث ہوتے تھے اور اپنی جانیں دے دے کر لندن کو تازہ خون فراہم کرتے تھے اسی طرح آج کے احمق مسلمان بھی محض جہالت اور جذباتیت کا شکار ہو کر اپنے خون سے دوسروں کو موٹا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور اگر انہیں اس کا علم ہو جائے کہ کمیونزم اسلام کے حق میں کیا رائے رکھتی ہے اور جہاں جہاں وہ پہنچی ہے اس نے اسلام کو کس طرح مٹایا ہے تو انہیں معلوم ہوگا کہ کتنا بڑا جرم ہے جو ان سے سرزد ہو رہا ہے اور کس قدر گھناؤنی برائی ہے جس کو وہ انجام دے رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کمیونزم کا یا اس کی پہلی اشتراکیت کا ساتھ دے کر مسلمان اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھودنے کا مجنونانہ فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ جس لیڈرشپ نے ان کے سامنے یہ خیال رکھا تھا کہ "اگر ہم پر حملہ کیا گیا تو ہم کمیونسٹوں سے مل جائیں گے" وہ ایک نہایت ہی غیر دور اندیش۔ احمق۔ جاہل۔ اسلام دشمن اور بدبخت لیڈرشپ تھے۔ اس جذباتی لیڈرشپ نے قوم کو جس طرف چلا دیا ہے اس کے نتائج اگر ابھی تک لوگوں کے سمجھ میں نہیں آئے ہیں تو چند دنوں بعد اگر مسلمانوں کی موجودہ ذہنیت میں خاطرخواہ کوئی انقلاب ہوا تو پوری وضاحت کے ساتھ اُن کے سامنے آجائیں گے۔

دوسرا طبقہ جو مسلمانوں میں سے کمیونزم کی طرف کھنچ رہا ہے وہ ایک تعلیم یافتہ مگر چالاک اور مکار طبقہ ہے اس طبقہ نے دراصل اسلامی اصول و نظریات کے مقابلہ میں جان بوجھ کر کمیونزم کو ترجیح دی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس نے اسلام کو سمجھنے میں غلطی کی ہو اور اس کا صحیح لٹریچر اس کے سامنے نہ آیا ہو، لیکن اب اس گروہ کو اسلام سے کوئی ہمدردی نہیں رہی ہے اور کمیونسٹ افکار اس کے ذہن پر اس قدر چھا گئے ہیں کہ وہ دوبارہ اسلام پر غور کرنے کے لئے تیار نہیں ہے بلکہ اس وقت تو اس کی یہ عین خواہش ہے کہ اسلام کو نیست و نابود کر دیا جائے اور اس کے ایک ایک اثر کو مٹا دیا جائے۔

ہم بھی اس گروہ کو اسلام کی طرف دعوت دینے کے لئے تیار نہیں ہیں ان لوگوں کے سامنے اسلام پیش کرنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ ہم اپنے غیر مسلم ہمسائیوں تک جائیں اور انہیں خدا کا یہ پیغام پہنچائیں۔ لیکن ہم ان حضرات سے اتنی گذارش ضرور کریں گے کہ اگر آپ اسلام کے دشمن ہیں تو کھل کر میدان میں آئیے اور منافقت کے رویہ کو ترک کر دیجئے۔ کمیونزم اور اسلام کے ڈانڈے ملا کر مسلمانوں کو فریب دینے کی کوشش نہ کیجئے اب یہ ترکیب زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتی۔ اسی طرح مسلم سوسائٹی سے استفادہ کرنے۔ اس میں رہنے بسنے۔ شادی بیاہ کرنے اور اپنے مسلمان باپوں کی جائداد سے ورثہ پانے کا بھی آپ کو کوئی حق نہیں ہے اگر آپ اپنے دین میں سچے ہیں تو کمیونزم ہی کے مومن بن جائیے۔ ورنہ یہ کسی سنجیدہ اور دیانتدار

آدمی کا شیوہ نہیں ہے کہ اُس کا ایمان تو ایک چیز پر ہو لیکن وہ خواہ مخواہ ایک دوسری چیز سے چپکا رہے۔ یہ تو سراسر بد دیانتی منافقت اور خیانت ہے۔ یہ ایک طرح کی بزدلی اور کم ظرفی بھی ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ جس اصول پر آپ یقین رکھتے ہیں اور جس سے آپ انکار کرتے ہیں اس کو کھل کر پیش نہیں کر سکتے، بلکہ آپ کی سیرت اس قدر ڈھیلی اور پلپلی ہے کہ آپ چکر اور ہیر پھیر کے راستے اختیار کرتے اور لوگوں کو دھوکا اور فریب دے کر کام نکالنا چاہتے ہیں۔ یہ کردار شجاعت جوانمردی اور علو ہمتی کی عین ضد ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ جلد از جلد اس کردار کو ترک کر دیں اور کھل کر میدان میں آئیں تاکہ حق و باطل کے درمیان دو ٹوک فیصلہ ہو سکے۔ کیا ہم توقع رکھیں کہ آپ جلد ہی اپنے چہرے سے نقاب اُلٹ دیں گے اور اپنی دو رنگی سیرت کو خیرباد کہہ کر یک رنگ ہو جائیں گے؟

ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک تیسرا گروہ ایسا بھی ہے۔ جو نسبتاً سنجیدہ اور عقلمند ہے اور کسی تعصب یا جذبات کے تحت نہیں بلکہ غلط فہمی کا شکار ہو کر کمیونزم اور اشتراکیت کی طرف جا رہا ہے۔ یہ گروہ دل سے موجودہ نظام سے متنفر ہے۔ زمانہ کا سرد و گرم سہہ چکا ہے اور ایک نئے نظام کا خواہش مند ہے اس کے اندر اچھی صلاحیتیں ہیں اور اچھی کارکردگی ہے اور بڑی حد تک وہ دیانتداری سے غور کر رہا ہے، لیکن اس گروہ کی خامی یہ ہے کہ اس نے ابھی نہ تو ان نئی تحریکوں کو پوری طرح سمجھا ہے اور نہ اس کو اسلام کا حقیقی علم ہے بلکہ یہ دونوں طرف کا محض سرسری سا علم رکھتا ہے اور ایک طرف صرف تحریک "نئے نظام" کے زور دار اعلانات اور "نئے نظام" کے بلند بانگ دعاوی سے مسحور ہو کر فطرتاً اسی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس طبقہ کو اپنی انقلاب پسندی مبارک لیکن اس کے اس بھولے پن پر تعجب اور حیرت کہ اس نے ایک چیز کے حق اور درست ہونے کا اعلان صرف "اشتہار" دیکھ کر ہی کر دیا حالانکہ آجکل جھوٹے اشتہار بازوں کی بڑی کثرت ہے، اسی طرح اس نے ایک اور چیز کو صرف اس لئے "ناحق" قرار دے دیا کہ اُس کا کوئی اعلان کرنے والا نہیں تھا اور اس کو "نئے نظام" کی حیثیت سے کسی نے پیش نہیں کیا تھا۔ لیکن وہ تو اس کی اپنی شے تھی اس کو چھوڑنے سے قبل اسے خود ہی غور کرنا چاہیئے تھا کہ جس چیز کو وہ ترک کر رہا ہے وہ کیسی ہے۔ ابتداء میں اگر اس کے آباؤ اجداد نے اسے قبول کیا تھا تو کیوں؟ کیا وہ واقعی ایک غلط چیز تھی، یا صرف وہی ایک ایسا آبِ حیات ہے جس سے انسانیت کے سسکتے ہوئے جسم میں جان پڑ سکتی ہے اور اس کی ساری بیماریوں اور دکھوں کا علاج ہو سکتا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ حقیقی اسلام سے ناواقفیت کا سب سے بڑا سبب مسلمانوں کی موجودہ غیر اسلامی سوسائٹی ہے۔ مگر اپنی چیز کی جانچ پڑتال اور اس سے واقف ہونے کی ذمہ داری تو انفرادی ہے۔ ہر وہ شخص جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے خدا کے سامنے اس بارے میں جواب دہ ہے کہ اس نے اس دعوے اور اعلان کے بعد اسلام کو سمجھنے کی کس حد تک کوشش کی اور اپنی صلاحیتوں کو اس غرض کے لئے کتنا صرف کیا۔ بہرحال ہم ان تمام افراد کو جو ٹھنڈے دل سے کسی بات پر غور کر سکتے ہیں۔ اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ اسلام کا اصلی لٹریچر دیکھیں براہ راست قرآن اور

حدیث کا مطالعہ کریں اسوہ رسولؐ اور اسوہ صحابہ کا جائزہ لیں۔ اور ان کے برپا کئے ہوئے انقلاب کو سمجھیں۔ اس غرض کے لئے اردو زبان میں اب بہت اچھا لٹریچر تیار ہو گیا ہے اور تحریک اسلامی کا لٹریچر بھی اُن کی کافی مدد کر سکتا ہے پھر اس کام کے ختم ہو جانے کے بعد وہ خوب غور کر کے یہ..... فیصلہ کریں کہ وہ دائرہ اسلام میں رہنا چاہتے ہیں یا اس سے باہر ہو جانے کے خواہشمند ہیں؟ ایک سچا تعمیری انقلاب کیونزم برپا کر سکتی ہے، یا اسلام برپا کرتا ہے؟ موجودہ سرمایہ دارانہ اقدار کے مقابلہ میں اسلام زیادہ نیا ہے یا کمیونزم زیادہ نئی ہے؟ جو لوگ یہ اصولی طریقہ اختیار کرنے کے بجائے صرف چلتی ہوئی رو کا ساتھ دینا چاہتے ہیں اور وقت کے بگولوں کے پیچھے دوڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں، کوئی تعجب نہیں اگر وہ اس حماقت کی وجہ سے کسی گڑھے میں جا گریں!

اب رہا وہ طبقہ جو کانگریس ہندو قوم کے تنگاؤں میں سے سر اونچا کر کے جھانکنا چاہتا ہے اور پھر سے اسی غلط طریقے کو ملک میں دہرانا بھی چاہتا ہے جس کے نتیجے کے طور پر اُسے یہ دن دیکھنا پڑا تو شاید اس گروہ سے زیادہ سادہ لوح اور احمق کوئی نہیں۔ ان لوگوں کو غالباً ابھی تک اس بات کا احساس نہیں ہوا ہے۔ کہ جس ردعمل سے اُن کی قوم پچھلے دنوں میں دوچار ہوئی ہے اس کی بہت بڑی ذمہ داری ان کی اس غلط سیاسی تحریک پر عائد ہوتی ہے جسے یہ بڑی خوش فہمی کے ساتھ چلا رہے تھے۔ وہ ان کی قومی خود غرضی ہی تو تھی جس کے مقابلہ کے لئے ایک گروہ نے اپنی تمام قوت صرف کر دی، اور ... ان کی خواہشات نفس کی پرستش ہی تو تھی جس نے اُن کی قوم کے ایک حصّے کو مسان کی سیر کرا دی کیا آج سے دس بارہ سال پہلے بھی ہندوؤں اور مسلمانوں میں وہی منافرت تھی، جو آج پائی جاتی ہے؟ کوئی شخص بھی جو حالات سے واقف ہے۔ اس بات سے انکار کرے گا لیکن اس کے بعد کیا ہوا۔ طرح طرح کی لیگیں اور انجمنیں میدان میں اتریں، نعرے، جھنڈے، جلوس اور یونیفارم فضاؤں پر چھا گئے۔ جوشیلی تقاریر اور بھڑکیلی نظموں نے اسٹیج کو گرما دیا ـــ اپنی دنیوی خواہشات، اور نفسانی اغراض کو مسلمانوں نے خوب بڑھ بڑھ کر پیش کیا اور پھر چھینا جھپٹی۔ تو تو میں میں سے بڑھ کر نوبت "جنگ" تک جا پہنچی اور قوم کی قوم اپنے تمام بلند آہنگ اعلانات کے ساتھ مردوں کی طرح زمین پر سلا دی گئی۔ یہ سب کچھ آخر کس غلط سیاست کا نتیجہ تھا؟ ہو سکتا ہے اور یقیناً ہوا ہے کہ دوسروں نے بھی زیادتی کی ہے اور تالی دونوں ہاتھ سے بجی ہے۔ لیکن دوسروں کے پاس خدا کا سچا پیغام نہیں پہنچا تھا، انھوں نے خدائے آخرت میں اس کی رضا حاصل کرنے کا عہد نہیں کیا تھا۔ انھوں نے باطل کو مٹانے اور سر سے کفن باندھ کر نظام حق قائم کرنے کا بیڑا نہیں اُٹھایا تھا وہ ہوا و ہوس کے راستے پر چل ہی رہے تھے۔ ان کے سامنے حق کا کوئی صحیح تصور تھا ہی نہیں۔ اس لئے ان پر اعتراض کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں ہے۔ بہر حال اگر کچھ لوگ اب بھی مردے کے جسم میں جان ڈالنے کے خواہشمند ہیں تو انھیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ اس "مردے" کو بھوت سمجھ کر دوبارہ جھاڑ پھونک کا عمل بڑی تیزی سے شروع ہو جائے گا اور اسے پھر سے قبر میں دفن کر دیا

جائے گا۔ تعجب اور سخت افسوس ہے کہ ابھی تک حیدرآباد کے مطلع سیاست پر انہی غلط ذہنیت کے بادل منڈلا رہے ہیں جس کے باعث مسلمانوں نے یہ سب کچھ بھگتا ہے۔ یہاں کے بعض ہفتہ وار اور روزانہ اخبارات کا رنگ وہی ہے جو پہلے تھا۔ اور یہ لوگ اب بھی ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر تماشائیوں کا ہجوم دیکھنے کے لئے ادنیٰ افکار اور نچلے درجے کے خیالات کے "فلم" تیار کئے چلے جا رہے ہیں۔ خدا کرے کہ جلد ہی ان کو ہوش آجائے اور یہ بیماری کے اصلی سبب کو سمجھیں اور اس کو دور کرنے کی سعی کریں۔

خوشخبری

اشاعت حق کیلئے ایک نئے دارالاشاعت کا قیام

ناظرین انوار کو یہ معلوم کرکے مسرت ہوگی کہ ادارۂ انوار نے ایک دارالاشاعت "مکتبہ انوار" کے نام سے قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس کے ذریعہ ہم اشاعت حق اور قیام دین متین کے فریضہ کو زیادہ سے زیادہ خوش اسلوبی سے انجام دینے کی سعی کریں گے اور ایسا لٹریچر پیش کریں گے جو ایک طرف نہایت اہم موضوعات پر مبنی ہو اور دوسری طرف کتابت و طباعت کا ایک اچھا نمونہ پیش کرے۔ خدا ہمارے ان منصوبوں کو کامیاب کرے۔

اشتراکیت اور اسلام

مولانا مسعود عالم ندوی کی معرکۃ الآرا تصنیف

اس سلسلے کی پہلی پیشکش ہے جس کے حقوق طباعت ہندوستان کے لئے حاصل کر لئے گئے ہیں۔ اس سے قبل یہ کتاب ۸۰ صفحات کی مختصر ضخامت کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔ لیکن اب بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کو ملحوظ رکھکر مولانا نے اس کو ۲۰۰ صفحات پر پھیلا دیا ہے۔ اس کتاب میں اس جھوٹے پروپیگنڈے کی تردید کی گئی ہے کہ اسلام اور اشتراکیت دونوں ایک ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اسلامی نظام کو اشتراکیت پر کیوں فوقیت اور برتری حاصل ہے جو اصحاب ان دونوں نظامات کا تقابلی مطالعہ کرنے کے خواہشمند ہوں اُن کے لئے اس کتاب میں بہترین مواد موجود ہے مسلم اور غیر مسلم اصحاب یکساں طور پر اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ قیمت اور دیگر تفصیلات کا جلد ہی اعلان کیا جائیگا۔

قواعد ایجنسی

۱۔ تمام معاملات دیانتداری اور خدا کے سامنے جوابدہی کے تصور سے کئے جائیں گے۔
۲۔ زرِ امانت یا پیشگی کی ضرورت نہیں ہم ہر انسان کی انسانیت پر اعتماد کرتے ہیں۔
۳۔ کم از کم پانچ پرچے منگوانا ہوں گے۔
۴۔ کمیشن ہر صورت میں ۲۵ فیصد دیا جائے گا۔
۵۔ پرچے ہمیشہ ذریعہ بک پوسٹ روانہ ہونگے اور اس کا خرچ دفتر کے ذمہ ہوگا
۶۔ وی پی یا رجسٹری منگوانے کی صورت میں خرچ ڈاک ایجنسی کے ذمہ ہوگا
۷۔ ڈاک کی خرابیوں کا دفتر ذمہ دار نہیں۔
۸۔ جو پرچے آرڈر کے مطابق روانہ کئے جائیں گے وہ دفتر کو واپس نہ ہوسکیں گے الا یہ کہ کوئی خاص ضرورت ہو۔
۹۔ آرڈر سے زیادہ روانہ کئے ہوئے پرچے اگر فروخت نہ ہوں تو دفتر کو واپس کئے جاسکتے ہیں اور ان کا خرچ ڈاک بھی دفتر ہی برداشت کریگا۔
۱۰۔ ایجنٹ حضرات جنکو بطور تجربہ پرچے روانہ کئے گئے ہوں ان سے دفتر توقع رکھے گا کہ وہ ان کی اشاعت میں حصہ لیں گے۔ ورنہ انہیں واپس قبول کر لیا جائے گا۔

ہندوستان کے تمام شہروں میں ایجنٹوں کی ضرورت ہے۔

رباعیات

بدر لکھنوی

"اللہ اکبر"

انکار کی تحقیر سے بالا ہے تو
اقرار کی توقیر سے بالا ہے تو
ہستی تری سمجھے تو کوئی کیا سمجھے
افکار کی تقدیر سے بالا ہے تو

"مسلمان"

کیا غم کہ زمانے میں پریشان ہیں ہم
کیا خوف اگر بے سروسامان ہیں ہم
دولت وہی دولت ہے جو ہمکو ہے نصیب
صد شکر خدا صاحب ایمان ہیں ہم

"میں"

مژگاں میں پھر اشک پرونا ہے مجھے
دونین سے کونین ڈبونا ہے مجھے
اے بدر میرا سینہ ہے پر داغ فراق
رو رو کے انھیں داغ کو دھونا ہے مجھے

فکر و نظر

۱

نظر کو ذوق بے تابی عطا کر — جگر کو جذب سیمابی عطا کر
تمنائیں مری ہیں خشک و بے نم — انھیں سامانِ شادابی عطا کر

۲

نہیں تجھ کو خبر اے مردِ خاکی — تجھے فطرت نے کیا عظمت عطا کی
ترا رتبہ ہے برتر قدسیوں سے — ہو تجھ میں گر یقیں کی سوزناکی

۳

جلال مردِ مومن عشق و مستی — جمالِ مردِ مومن حق پرستی
کمال او قیام دین قیم — زوال او زوال بزم ہستی

۴

سحر کے وقت مومن کی اذاں سے — فضا جاگ اٹھتی ہے خواب گراں سے
مگر وائے بنی آدم ہیں غافل — پیام زندگی جاوداں سے

آیا دشاہ پوری

تفہیم القرآن

از:-
مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

البقرہ ـــــ رکوع ۱۵ تا ۱۶

اے[1] بنی اسرائیل! یاد کرو میری وہ نعمت جس سے میں نے تمہیں نوازا تھا، اور یہ کہ میں نے تمہیں دنیا کی تمام قوموں پر فضیلت دی تھی۔ اور ڈرو اُس دن سے جب کوئی کسی کے ذرا کام نہ آئے گا، نہ کسی سے

---

[1] یہاں سے ایک دوسرا سلسلہ تقریر شروع ہوتا ہے جسے سمجھنے کے لئے حسب ذیل امور کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔

(۱) حضرت نوح کے بعد حضرت ابراہیم پہلے نبی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی عالمگیر دعوت پھیلانے کے لئے مقرر کیا تھا۔ انھوں نے پہلے خود عراق سے مصر تک اور شام و فلسطین سے ریگستان عرب کے مختلف گوشوں تک برسوں گشت لگا کر اللہ کی اطاعت و فرماں برداری (یعنی اسلام) کی طرف لوگوں کو دعوت دی، پھر اپنے اس مشن کی اشاعت کے لئے مختلف علاقوں میں خلیفہ مقرر کیے، شرق اردن میں اپنے بھتیجے حضرت لوط کو شام و فلسطین میں اپنے بیٹے حضرت اسحٰق کو اور اندرون عرب میں اپنے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل کو مامور کیا، پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے مکہ میں وہ گھر تعمیر کیا جس کا نام کعبہ ہے اور اللہ ہی کے حکم سے اس مشن کا مرکز قرار پایا۔

(۲) حضرت ابراہیم کی نسل سے دو بڑی شاخیں نکلیں۔ ایک حضرت اسماعیل کی اولاد جو عرب میں رہی۔ قریش اور عرب کے بعض دوسرے قبائل کا تعلق اسی شاخ سے تھا۔ اور جو عرب قبیلے نسلاً حضرت اسماعیل کی اولاد نہ تھے وہ بھی چونکہ اُن کے پھیلائے ہوئے مذہب سے کم و بیش متاثر تھے اس لئے اپنا سلسلہ انہی سے جوڑتے تھے۔ دوسری حضرت اسحاق کی اولاد جن میں حضرات یعقوب، یوسف، موسیٰ، داؤد، سلیمان، یحییٰ، عیسیٰ اور بہت سے انبیاء علیہم السلام پیدا ہوئے، اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، حضرت یعقوب کا نام چونکہ اسرائیل تھا اس لئے یہ نسل بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئی۔ ان کی تبلیغ سے جن دوسری قوموں نے ان کا دین قبول کیا انھوں نے یا تو اپنی انفرادیت ہی ان کے اندر گم کر دی یا وہ نسلاً تو اُن سے الگ رہے، مگر مذہباً اُن کے تبع رہے۔ اسی شاخ میں جب پستی و تنزل کا دور آیا تو پہلے یہودیت پیدا ہوئی اور پھر عیسائیت نے جنم لیا۔

(۳) حضرت ابراہیم کا اصل کام دنیا کو اللہ کی اطاعت کی طرف بلانا اور اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کے مطابق انسانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا نظام درست کرنا تھا۔ وہ خود اللہ کے مطیع تھے، اس کے دیے ہوئے علم کی پیروی کرتے تھے، دنیا میں اس علم کو پھیلاتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ سب انسان مالک کائنات کے مطیع ہو کر رہیں۔ یہی خدمت تھی جس کے لئے وہ دنیا کے امام و پیشوا بنائے گئے تھے۔ ان کے بعد یہ امامت کا منصب ان کی نسل کی اس شاخ کو ملا جو حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب سے چلی اور بنی اسرائیل کہلائی۔ اسی میں انبیاء پیدا ہوتے رہے، اسی کو

فدیہ قبول کیا جائے گا، نہ کوئی سفارش ہی آدمی کو فائدہ دے گی اور نہ مجرموں کو کہیں سے کوئی مدد پہنچ سکے گی۔

(بقیہ سلسلہ حاشیہ صلا) راہِ راست کا علم دیا گیا اسی کے سپرد یہ خدمت کی گئی کہ اس راہ راست کی طرف اقوام عالم کی رہنمائی کرے اور یہی وہ نعمت تھی جسے اللہ تعالیٰ بار بار اس نسل کے لوگوں کو یاد دلا رہا ہے۔ اس شاخ کا مرکز بیت المقدس تھا اس لئے جب تک یہ شاخ امامت کے منصب پر قائم رہی بیت المقدس ہی دعوت الی اللہ کا مرکز اور خدا پرستوں کا قبلہ رہا۔

(۴) پچھلے دس رکوعوں میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو خطاب کرکے ان کی تاریخی فرد قرار دادِ جرم اور ان کی وہ موجودہ حالت جو نزول قرآن کے وقت تھی بلے کم وکاست پیش کردی ہے اور ان کو یہ بتادیا ہے کہ تم ہماری اس نعمت کی انتہائی ناقدری کرچکے ہو جو ہم نے تمہیں دی تھی، تم نے صرف یہی نہیں کیا کہ منصب امامت کا حق ادا کرنا چھوڑ دیا بلکہ خود بھی حق اور راستی سے پھر گئے اور اب ایک نہایت قلیل عنصر صالح کے سوا تمہاری پوری امت میں کوئی صلاحیت باقی نہیں رہی ہے۔

(۵) اس کے بعد اب یہ بتایا جارہا ہے کہ امامت ابراہیم کے نطفہ کی میراث نہیں ہے بلکہ یہ اس سچی اطاعت وفرماں برداری کا پھل ہے جس میں ہمارے اس بندے نے اپنی ہستی کو گم کردیا تھا، اور اس کے مستحق صرف وہ لوگ ہیں جو ابراہیم کے طریقے پر خود چلیں اور دنیا کو اس طریقہ پر چلانے کی خدمت انجام دیں۔ چونکہ تم اس طریقہ سے ہٹ گئے ہو اور اس خدمت کی اہلیت پوری طرح کھو چکے ہو لہٰذا تمہیں امامت کے منصب سے معزول کیا جاتا ہے،

(۶) ساتھ ہی اشاروں اشاروں میں یہ بھی بتادیا جاتا ہے کہ جو غیر اسرائیلی قومیں موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کے واسطہ سے حضرت ابراہیم کے ساتھ اپنا تعلق جوڑتی ہیں وہ بھی ابراہیمی طریقہ سے ہٹی ہوئی ہیں۔ نیز مشرکین عرب بھی جو ابراہیم واسمٰعیل علیہما السلام سے اپنے تعلق پر فخر کرتے ہیں محض نسل ونسب کے فخر کو لئے بیٹھے ہیں، ورنہ ابراہیم واسماعیل کے طریقے سے اُن کا دور کا واسطہ بھی نہیں۔ لہٰذا ان میں سے بھی کوئی امامت کا حق نہیں۔

(۷) پھر یہ بات ارشاد ہوتی ہے کہ اب ہم نے ابراہیم علیہ السلام کی دوسری شاخ بنی اسمٰعیل میں وہ رسول پیدا کیا ہے جس کے لئے ابراہیم واسماعیل نے دعا کی تھی اس کا طریقہ وہی ہے جو ابراہیم اسحاق یعقوب اور دوسرے تمام انبیا کا تھا وہ اور اس کے پیرو تمام ان پیغمبروں کی تصدیق کرتے ہیں جو دنیا میں خدا کی طرف سے آئے ہیں، اور اسی راستہ کی طرف دنیا کو بلاتے ہیں جس کی طرف تمام انبیاءؑ دعوت دیتے چلے آئے ہیں لہٰذا اب امامت کے مستحق صرف وہ لوگ ہیں جو اس رسول کی پیروی کریں

(۸) تبدیل امامت کا اعلان ہونے کے ساتھ ہی قدرتی طور پر قبلہ کی تبدیلی کا اعلان ہونا بھی ضروری تھا۔ جب تک بنی اسرائیل کی امامت کا دور تھا بیت المقدس مرکز دعوت اور وہی قبلۂ اہل حق رہا اور خود نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیرو بھی اس وقت تک بیت المقدس ہی کو قبلہ بنائے رہے۔ مگر جب بنی اسرائیل اس منصب سے باضابطہ معزول کئے گئے تو بیت المقدس کی مرکزیت آپ سے آپ ختم ہوگئی۔ لہٰذا اعلان کردیا گیا کہ اب وہ مقام دین الٰہی کا مرکز ہے جہاں سے اس رسول کی دعوت کا ظہور ہوا ہے اور چونکہ ابتدا میں ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کا مرکز بھی یہی تھا اس لیے اہل کتاب اور مشرکین، کسی کے لئے بھی یہ تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے کہ قبلہ ہونے کا زیادہ حق کعبہ ہی کو پہنچتا ہے، ہٹ دھرمی کی بات دوسری ہے کہ وہ حق کو حق جانتے ہوئے بھی اعتراض کئے چلے جائیں۔

(۹) امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت اور کعبہ کی مرکزیت کا اعلان کرنے کے بعد ہی اللہ تعالیٰ نے انیسویں رکوع سے آخر سورۂ بقرہ تک مسلسل اس اُمت کو وہ ہدایات دی گئی ہیں جن پر اسے عمل پیرا ہونا چاہیئے۔

تمہیں یاد ہے وہ واقعہ کہ ابراہیم کو اُس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا[1] تھا اور جب وہ اُن سب میں پورا اتر گیا تو اس نے کہا "میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔" ابراہیم نے عرض کیا "اور کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے؟" اس نے جواب دیا "میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں[2] ہے۔"

اور یہ کہ ہم نے اس گھر (کعبہ) کو لوگوں کے لئے مرکز اور امن کی جگہ قرار دیا تھا اور لوگوں کو حکم دیا تھا کہ ابراہیم جہاں عبادت کے لئے کھڑا ہوتا ہے اس مقام کو مستقل جائے نماز بنالو، اور ابراہیم اور اسماعیل کو تاکید کی تھی کہ میرے اس گھر کو طواف اور اعتکاف اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک[3] رکھو۔

اور یہ کہ ابراہیم نے دعا کی "اے میرے مالک! اس شہر کو امن کا شہر بنادے، اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور آخرت کو مانیں انہیں ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے۔" جواب میں اُس کے رب نے فرمایا "اور جو نہ مانیگا دنیا کی چند روزہ زندگی کا سامان تو میں اُسے بھی دوں[4] گا مگر آخر کار اُسے عذاب جہنم کی طرف گھسیٹونگا اور وہ بدترین ٹھکانا ہے۔"

---

[1] قرآن میں مختلف مقامات پر ان تمام سخت آزمائشوں کی تفصیل بیان ہوئی ہے جن سے گذر کر حضرت ابراہیم نے اپنے آپ کو اس بات کا اہل ثابت کیا تھا کہ انھیں بنی نوع انسان کا امام و رہنما بنایا جائے۔ جس وقت سے حق ان پر منکشف ہوا اس وقت سے لے کر مرتے دم تک ان کی پوری زندگی سراسر قربانی ہی قربانی تھی۔ دنیا میں جتنی چیزیں ایسی ہیں جن سے انسان محبت کرتا ہے ان میں سے کوئی چیز ایسی نہ تھی جس کو حضرت ابراہیم نے حق کی خاطر قربان نہ کیا ہو، اور دنیا میں جتنے خطرات ایسے ہیں جن سے آدمی ڈرتا ہے ان میں سے کوئی خطرہ ایسا نہ تھا جسے انھوں نے حق کی راہ میں نہ جھیلا ہو۔

[2] یعنی یہ وعدہ تمہاری اولاد کے صرف اس حصہ سے تعلق رکھتا ہے جو صالح ہو۔ اُن میں سے جو ظالم ہوں گے اُن کے لئے یہ وعدہ نہیں ہے۔

[3] پاک رکھنے سے مراد صرف یہی نہیں ہے کہ کوڑے کرکٹ سے اُسے پاک رکھا جائے بلکہ خدا کے گھر کی اصل پاکی یہ ہے کہ اس میں خدا کے سوا کسی کا نام بلند نہ ہو۔ جس نے خانہ خدا میں خدا کے سوا کسی دوسرے کو مالک معبود حاجت روا اور فریاد رس کی حیثیت سے پکارا اس نے حقیقت میں اُسے گندا کر دیا۔ یہ آیت ایک نہایت لطیف طریقہ سے مشرکین قریش کے جرم کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ یہ ظالم ابراہیم و اسمٰعیل کے وارث ہونے پر فخر تو کرتے ہیں مگر وراثت کا حق ادا کرنے کے بجائے اُلٹا اس کے حق کو پامال کر رہے ہیں۔ لہٰذا جو وعدہ ابراہیم علیہ السلام سے کیا گیا تھا اس سے جس طرح بنی اسرائیل مستثنیٰ ہو گئے ہیں اسی طرح یہ بھی اس سے مستثنیٰ ہیں۔

[4] حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب منصب امامت کے متعلق پوچھا تھا تو ارشاد ہوا تھا کہ اس منصب کا وعدہ تمہاری اولاد کے صرف مومن و صالح لوگوں کے لئے ہے، ظالم اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اس لیے انھوں نے جب رزق کے لئے دعا کی تو سابق فرمان کو پیش نظر رکھ کر صرف اپنی مومن اولاد ہی کے لئے دعا کی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے جواب میں اس غلط فہمی کو فوراً رفع فرما دیا اور انھیں بتایا کہ امامت صالحہ اور چیز ہے اور رزق دنیا دوسری چیز۔ امامت صالحہ صرف مومنین صالحین کو ملیگی مگر رزق دنیا مومن و کافر سب کو دیا جائے گا۔

"اور یہ کہ ابراہیم اور اسماعیل جب اس گھر کی دیواریں اٹھا رہے تھے تو دعا کرتے جاتے تھے "اے ہمارے مالک! ہم سے یہ خدمت قبول فرمالے، تو سب کی سننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اے ہمارے آقا! ہم دونوں کو اپنا مسلم (مطیع فرمان) بنا، ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مسلم ہو، ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا، اور ہماری کوتاہیوں سے درگذر فرما، تو بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ اور اے ہمارے پروردگار ان لوگوں میں خود انہی کی قوم سے ایک ایسا رسول اٹھائیو جو انھیں تیری آیات سُنائے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے، اور ان کی زندگیاں سنوارے[1]، تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے۔"

اب وہ کون ہوگا جو ابراہیم کے طریقے سے نفرت کرے؟ جس نے خود اپنے آپ کو حماقت و جہالت میں مبتلا کرلیا ہو اس کے سوا اور کون یہ حرکت کرسکتا ہے! ابراہیم تو وہ شخص ہے جس کو ہم نے دنیا میں خاص اپنی خدمت کے لئے چُن لیا تھا اور آخرت میں اس کا شمار صالحین میں ہوگا۔ اس کا حال یہ تھا کہ جب اُس کے رب نے اُس سے کہا "مسلم[2] ہوجاؤ" تو اس نے فوراً کہا "میں مالک کائنات کا مسلم ہوگیا"۔ اسی طریقہ پر چلنے کی ہدایت اس نے اپنی اولاد کو کی تھی اور اسی کی وصیت یعقوب[3] اپنی اولاد کو کرگیا۔ اس نے کہا تھا کہ "میرے بچو! اللہ نے تمہارے لئے یہی دین پسند کیا ہے لہٰذا مرتے دم تک مسلم ہی رہنا" پھر کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب اس دنیا سے رخصت ہو رہا تھا؟ اس نے مرتے وقت اپنے بیٹوں سے پوچھا "بچو! میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟" ان سب نے جواب دیا "ہم اسی ایک اِلٰہ[4] کی عبادت کریں گے جسے آپ نے اور آپ کے بزرگ ابراہیم اسماعیل اور اسحاق نے اِلٰہ مانا ہے اور ہم اسی کے مسلم ہیں۔"

---

[1] زندگی سنوارنے میں خیالات، اخلاق، عادات، معاشرت، تمدن، سیاست، غرض ہر چیز کو سنوارنا شامل ہے۔ مگر افسوس ہے کہ آج کل تزکیہ کا مفہوم بہت محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

[2] مسلم۔ وہ جو خدا کے آگے سرِ اطاعت خم کردے، جو خدا کو اپنا واحد مالک، آقا، حاکم اور معبود تسلیم کرے، اپنے آپ کو بالکلیہ خدا کے سپرد کردے اور اُس ہدایت کے مطابق دنیا میں زندگی بسر کرے جو خدا کی طرف سے آئی ہو۔ اس عقیدے اور اس طرز عمل کا نام "اسلام" ہے اور یہی تمام انبیا کا دین تھا جو ابتدائے آفرینش سے دنیا کے مختلف ملکوں اور قوموں میں آتے رہے۔

[3] حضرت یعقوب کا ذکر خاص طور پر اس لیے فرمایا کہ بنی اسرائیل براہ راست انہی کی اولاد تھے۔

[4] اِلٰہ معبود، مرکزِ پرستش، وہ جس سے دعائیں مانگی جائیں اور حاجتیں طلب کی جائیں، وہ جس کی پناہ ڈھونڈی جائے، وہ جسے نفع و نقصان کا مالک سمجھا جائے، وہ جو اپنے بالاتر اقتدار کی بنا پر اس کا مستحق ہو کہ انسان اس کی بندگی و اطاعت کرے اور اس کے آگے اپنا عجز و نیاز پیش کرے۔

یہ لوگ گزر گئے، جو کچھ انھوں نے کمایا وہ اُن کے لئے ہے اور جو کچھ تم کماؤ گے وہ تمہارے لیے ہے، تم سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کرتے تھے [1]

یہودی کہتے ہیں یہودی ہو تو راہِ راست پاؤ گے۔ عیسائی کہتے ہیں عیسائی ہو تو ہدایت ملے گی۔ اے نبی! ان سے کہہ دو "ہم تو سب طریقوں کو چھوڑ کر ابراہیم کے طریقے کو لیتے ہیں، اور ابراہیم مشرکوں میں سے نہ تھا[2]۔ مسلمانو! کہو کہ "ہم ایمان لائے اللہ پر اور اُس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور

---

[1] یعنی اگرچہ تم اُن کی اولاد سہی مگر حقیقت میں تمہیں ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان کا نام لینے کا تم کو کیا حق ہے جبکہ تم ان کے طریقہ سے پھر گئے؟ اللہ کے ہاں تم سے اُن کے اعمال نہ پوچھے جائیں گے کہ پدرم سلطان بود کہہ کر چھوٹ جاؤ، بلکہ تم سے خود تمہارے اعمال پوچھے جائیں گے۔ اور یہ جو فرمایا کہ "جو کچھ انھوں نے کمایا وہ اُن کے لئے ہے اور جو کچھ تم کماؤ گے وہ تمہارے لئے ہے" تو یہ قرآن کا خاص اندازِ بیان ہے۔ ہم جس چیز کو فعل یا عمل کہتے ہیں، قرآن اپنی زبان میں اسے کسب یا کمائی کہتا ہے۔ ہمارا ہر عمل اپنا ایک اچھا یا بُرا نتیجہ رکھتا ہے جو خدا کی خوشنودی یا ناراضی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ وہی نتیجہ ہماری کمائی ہے، اور چونکہ قرآن کی نگاہ میں اصل اہمیت اسی نتیجہ کی ہے اس لئے اکثر وہ ہمارے کاموں کو عمل و فعل کے الفاظ سے تعبیر کرنے کے بجائے "کسب" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔

[2] اس جواب میں دو باتیں آگئیں۔ ایک یہ کہ یہودیت اور عیسائیت دونوں بعد کی پیداوار ہیں۔ "یہودیت" اپنے اس نام اور اپنی مذہبی خصوصیات اور رسوم و قواعد کے ساتھ تیسری چوتھی صدی قبل مسیح میں پیدا ہوئی اور "عیسائیت" جن عقائد اور مخصوص مذہبی تصورات کے مجموعہ کا نام ہے وہ تو حضرت مسیح کے بھی ایک مدت بعد وجود میں آئے ہیں۔ اب یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ اگر آدمی کے برسرِ ہدایت ہونے کا مدار یہودیت یا عیسائیت اختیار کرنے پر ہی ہے تو حضرت ابراہیم اور دوسرے انبیاء، اور نیک لوگ جو ان مذہبوں کی پیدائش سے صدیوں پہلے پیدا ہوئے تھے اور جن کو خود یہودی اور عیسائی بھی ہدایت یافتہ مانتے ہیں وہ آخر کس چیز سے ہدایت پاتے تھے؟ ظاہر ہے کہ وہ "یہودیت" اور "عیسائیت" نہ تھی، لہٰذا یہ بات آپ سے آپ واضح ہوگئی کہ انسان کے ہدایت یافتہ ہونے کا مدار ان مذہبی خصوصیات پر نہیں ہے جن کی وجہ سے یہ یہودی اور عیسائی وغیرہ مختلف فرقے بنتے ہیں، بلکہ دراصل اس کا مدار اس عالمگیر صراطِ مستقیم کے اختیار کرنے پر ہے جس سے ہر زمانے میں انسان ہدایت پاتے رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ خود یہود و نصاریٰ کی اپنی مقدس کتابیں اس بات پر گواہ ہیں کہ حضرت ابراہیم ایک اللہ کے سوا کسی دوسرے کی پرستش، تقدیس، بندگی اور اطاعت کے قائل نہ تھے اور اُن کا مشن ہی یہ تھا کہ خدائی کی صفات و خصوصیات میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھیرایا جائے، لہٰذا یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہودیت اور نصرانیت دونوں اس راست سے منحرف ہوگئی ہیں جس پر حضرت ابراہیم چلتے تھے، کیونکہ ان دونوں میں شرک کی آمیزش ہوگئی ہے۔

اولادِ یعقوب کی طرف نازل ہوئی تھی اور جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دوسرے تمام پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی تھی۔ ہم ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے[1] اور ہم اللہ کے مسلم ہیں۔"

پھر اگر یہ لوگ اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم لائے ہو تو ہدایت پر ہیں، اور اگر اس سے منہ پھیریں تو کھلی بات ہے کہ وہ ہٹ دھرمی میں پڑ گئے ہیں۔ لہٰذا اطمینان رکھو کہ ان کے مقابلہ میں اللہ تمہاری حمایت کرے گا، وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

کہو "اللہ کا رنگ اختیار کرو[2]، اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہوگا، اور ہم اس کی بندگی کرنے والے لوگ ہیں۔"

اے نبیؐ! ان سے کہو: "کیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو حالانکہ وہی ہمارا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی ہے؟[3] ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں، تمہارے اعمال تمہارے لئے، اور ہم تو بس اللہ ہی کے

---

[1] پیغمبروں کے درمیان تفریق نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے درمیان اس لحاظ سے فرق نہ کیا جائے کہ فلاں حق پر تھا اور فلاں حق پر نہ تھا، یا یہ کہ ہم فلاں کو مانتے ہیں اور فلاں کو نہیں مانتے۔ ظاہر ہے کہ خدا کی طرف سے جتنے پیغمبر بھی آئے ہیں سب کے سب ایک ہی صداقت اور ایک ہی راہ راست کی طرف بلانے آئے ہیں، لہٰذا جو شخص صحیح معنی میں حق پرست ہے اس کے لئے تمام پیغمبروں کو برحق تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ جو لوگ کسی پیغمبر کو مانتے اور کسی کا انکار کرتے ہیں وہ حقیقت میں اس پیغمبر کے بھی پیرو نہیں ہیں جسے وہ مانتے ہیں کیونکہ انھوں نے دراصل اس عالمگیر صراط مستقیم کو نہیں پایا ہے جسے حضرت موسیٰؑ یا عیسیٰؑ یا کسی دوسرے پیغمبر نے پیش کیا تھا، بلکہ وہ محض باپ دادا کی تقلید میں ایک پیغمبر کو مان رہے ہیں۔ ان کا اصل مذہب نسل پرستی کا تعصب اور آباؤ اجداد کی اندھی تقلید ہے نہ کہ کسی پیغمبر کی پیروی۔

[2] اس آیت کے دو ترجمے ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ "ہم نے اللہ کا رنگ اختیار کر لیا۔" دوسرے یہ کہ "اللہ کا رنگ اختیار کرو۔" مسیحیت کے ظہور سے پہلے یہودیوں کے ہاں یہ رسم تھی کہ جو شخص ان کے مذہب میں داخل ہوتا اسے غسل دیتے تھے اور اس غسل کے معنی ان کے ہاں یہ تھے کہ گویا اس کے گناہ دھل گئے اور اس نے زندگی کا ایک نیا رنگ اختیار کر لیا۔ یہی چیز بعد میں مسیحیوں نے اختیار کی جس کا اصطلاحی نام ان کے ہاں اصطباغ (بپتسمہ) ہے۔ اور یہ اصطباغ نہ صرف ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جو ان کے مذہب میں داخل ہوتے ہیں بلکہ بچوں کو بھی دیا جاتا ہے۔ اسی کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ اس رسمی اصطباغ میں کیا رکھا ہے۔ اللہ کا رنگ اختیار کرو جو کسی پانی سے نہیں چڑھتا بلکہ اس کی بندگی کا طریقہ اختیار کرنے سے چڑھتا ہے۔

[3] یعنی ہم یہی تو کہتے ہیں کہ اللہ ہی سب کا رب ہے اور اسی کی فرمانبرداری ہونی چاہیئے۔ کیا یہ بھی کوئی ایسی بات ہے کہ اس پر تم ہم سے جھگڑا کرو؟

لیئے اپنی بندگی کو خالص کر دینے والے لوگ ہیں[۱]۔ یا پھر کیا تمہارا کہنا یہ ہے کہ ابراہیم اسماعیل اسحاق، یعقوب اور اولادِ یعقوب سب کے سب یہودی تھے یا نصرانی تھے؟[۲] کہو، تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟[۳] اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جس کے ذمہ اللہ کی طرف سے ایک گواہی ہو اور وہ اُسے چھپائے، تمہاری حرکات سے اللہ غافل تو نہیں ہے[۱] وہ کچھ لوگ تھے جو گذر چکے، اُن کی کمائی اُن کے لیے تھی اور تمہاری کمائی تمہارے لیے، تم سے اُن کے اعمال کے متعلق سوال نہیں ہوگا!"

---

[۱] یعنی تم اپنے اعمال کے ذمہ دار ہو اور ہم اپنے اعمال کے۔ تم نے اگر اپنی بندگی کو تقسیم کر رکھا ہے اور اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی الوہیت و ربوبیت کی صفات میں شریک ٹھیرا کر ان کی پرستش اور اطاعت بجا لاتے ہو تو تمہیں ایسا کرنے کا اختیار ہے، اس کا انجام خود دیکھ لوگے، مگر ہم نے تو اپنی بندگی، اطاعت اور پرستش کو بالکل اللہ ہی کے لئے خالص کر دیا ہے۔

[۲] یہ خطاب یہود و نصاریٰ کے اُن جاہل عوام سے ہے جو واقعی اپنے نزدیک یہ سمجھتے تھے کہ یہ جلیل القدر انبیاء سب کے سب یہودی یا عیسائی تھے۔

[۳] یہ خطاب اُن کے علماء سے ہے جو خود بھی اس حقیقت سے ناواقف نہ تھے کہ یہودیت اور عیسائیت اپنی موجودہ خصوصیات کے ساتھ بہت بعد میں پیدا ہوئی ہیں، مگر اس کے باوجود حق کو اپنے فرقوں میں محدود سمجھتے تھے اور عوام کو اس غلط فہمی میں مبتلا رکھتے تھے کہ انبیاء کے مدتوں بعد جو عقیدے، جو طریقے، اور جو اجتہادی ضابطے اور قاعدے ان کے فقہاء، صوفیہ، اور متکلمین نے وضع کئے انہی کی پیروی پر انسان کی فلاح اور نجات کا مدار ہے۔ ان علماء سے جب پوچھا جاتا تھا کہ اگر یہی بات ہے تو حضرات ابراہیم اسحاق، یعقوب وغیرہ انبیاء علیہم السلام آخر تمہارے ان فرقوں میں سے کس سے تعلق رکھتے تھے، تو وہ اس کا جواب دینے سے گریز کرتے تھے کیونکہ ان کا علم انھیں یہ کہنے کی تو اجازت نہ دیتا تھا کہ ان بزرگوں کا تعلق ہمارے ہی فرقہ سے تھا۔ لیکن اگر وہ صاف الفاظ میں یہ مان لیتے کہ یہ انبیاء نہ یہودی تھے نہ عیسائی تو پھر اُن کی حجت ہی ختم ہوئی جاتی تھی۔

نغمۂ جاں بخش

ابوالبیان حماد

مومن ہو تو پیغام خدا سب کو سنا دو
دنیا سے تم ہر ایک برائی کو مٹا دو

قصر ستم و جور کی بنیاد ہلا دو
باطل کے گھروندوں کو اشاروں ہی میں ڈھا دو

تم چاہو تو کھل جائیں گے اسرارِ دو عالم
آنکھوں سے مگر پہلے حجابات اٹھا دو

تن اس کا ہے جاں اسکی ہے اور مال بھی اس کا
اللہ کے رستے میں ہر ایک چیز لٹا دو

دیکھو وہ بلاتی ہے تمہیں منزلِ مقصود
کافی ہے جو دو چار قدم اور بڑھا دو

ہے جن کا ارادہ کہ تمہیں کفر میں جھونکیں
تم ان کی تمناؤں کو مٹی میں ملا دو

اربابِ ہمم کے لئے مشکل نہیں کچھ بھی
ہو کوہِ گراں بھی تو اسے کاہ بنا دو

خاکسترِ دل میں ہیں جو ایماں کے شرارے
تم برق صفت خرمنِ باطل کو جلا دو

آثارِ سحر پھر سے نمایاں ہیں افق سے
ہر شخص کو اب خوابِ تغافل سے جگا دو

گذری ہوئی قوموں نے شفا پائی ہے جس سے
اس دور کی اقوام کو بھی تم وہ دوا دو

طاغوت کے ہر محکمہ سے توڑ لو رشتہ
اللہ کے احکام پہ سر اپنا جھکا دو

پھر شورشِ تاتار کو دہرائے نہ تاریخ
ابھرے کہیں فتنہ تو اسے جلد دبا دو

طوفانِ حوادث میں جو انسان پھنسے ہیں
تم نوح کی مانند انھیں پار لگا دو

حماد کا یہ نغمۂ جاں بخش و دلاویز
ہر مرد و زن ملتِ بیضا کو سنا دو

اشتراکیت کی صبح کاذب

از
عبدالحمید بی۔ اے
اقبال گنج گوجرانوالہ

اشتراکیت اس وقت مظلوم طبقات اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو نظروں کو خیرہ کرنے والا نظام معلوم ہو رہا ہے لیکن جتنا یہ نظام خوبصورت جلد والی کتابوں۔ ترقی پسند ادب کے افسانوں اور گیتوں میں اچھا دکھائی دیتا ہے فی الواقع یہ ویسا دل پذیر اور اپنے نتائج کے اعتبار سے اتنا خوشگوار نہیں ہے۔ عمل کی دنیا میں اشتراکیت کے منبع سے جس قسم کے بیل بوٹے اور پھل پھول نکلے ہیں اگر ہم ان کا جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہاں گل و یاسمن کے بجائے دھتورے اور جنگلی تھوہڑ کی بہار ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ روس میں اشتراکیت کا تجربہ بالکل ناکام رہا۔ انقلابی تحریک کا ریلا ابتدا ہی میں غیر انقلابیت سے شکست کھا گیا۔ اور جدید رنگ میں وہی پرانی استبدادیت چھا گئی۔ زار کے بجائے اسٹالن خدا بن گیا۔ پرانے معاشی طبقے مٹ گئے مگر نئے طبقات نے جڑ پکڑ لی۔ پرانی سرمایہ داری اور جاگیرداری ختم ہو گئی اور اس کی جگہ نئی سرمایہ داری اور عہدہ داری نے لے لی۔ فرق جو کچھ ہوا وہ رنگ اور لیبل کا ہوا نہ کہ برائی کی اصلیت میں کوئی تغیر ہوا۔ یہ حالات روس کو بہت جلد ایک نئے انقلاب کے دروازے پر لا کھڑا کریں گے۔ موجودہ بالشویک حکومت اس قدر سخت گیر ہے کہ عوام کو اپنی مرضی کے مطابق کسی جدوجہد کا موقع نہیں ملتا وہ اپنے احساسات کا گلا سینے کے اندر ہی گھونٹ دینے پر مجبور ہیں۔ البتہ اگر باہر سے روس کے اندر کوئی فکری اقدام کیا جائے تو نئے انقلابی اصولوں کی کامیابی یقینی ہے لیکن یہ امر قطعی ہے کہ یہ اقدام سرمایہ داری یا مارکسزم کے کسی نظریہ کے ذریعہ ممکن نہیں البتہ اگر نئی تحریک خدا پرستی کے اصولوں پر مبنی ہو اور ایک ہمہ گیر نظام لیکر اٹھے تو وہ بہت آسانی سے اس "سرخ قلعے" کی دیواروں کو پھاند جائے گی۔ (ادارہ)

نسل انسانی جب ظلم و ستم کے انگاروں پر لوٹ لوٹ کر جل اٹھتی ہے۔ تو کباب سیخ کی طرح کروٹیں بدلنا شروع کرتی ہے۔ اسی کا نام انقلاب ہے۔ یہ حقیقت کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ عوام نے ہمیشہ ہوش سے زیادہ جوش سے کام لیا۔ اسی لئے کسی طرف کروٹ بدلنے سے پہلے انھوں نے یہ سوچنا تک گوارہ نہیں کیا۔ کہ جس طرف وہ کروٹ بدل رہے ہیں اس طرف جور و ستم کی وہ بھٹی جل رہی ہے جس کی حرارت پہلے سے بھی زیادہ ناقابل برداشت ہے۔

دنیا کی استعماری طاقتیں پوری نوع انسانی کے لئے عرصۂ حیات تنگ کئے ہوئے ہیں۔ فاقہ مستی سے مخلوق خدا دم توڑ رہی ہے۔ ہلاکت نے ہر ملک میں ڈیرے ڈال دیئے ہیں۔ اور ابن آدم اب ایک نئے انقلاب کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ اس انقلاب کی دعوت دینے والوں میں سب سے پیش پیش اشتراکی ہیں۔ اُن کا منتہائے مقصود جور و استبداد کو دنیا سے نیست و نابود کرنا ہے۔ ان کا نصب العین ہر قسم کی معاشی لوٹ کھسوٹ کو دنیا سے ختم کرنا ہے۔ اُن کا مطمح نظر ایک بین الاقوامی سوسائٹی کا قیام ہے۔ غرض ان کے پیش نظر رنگ و نسل کے امتیازات۔ دولت اور ذرائع پیدائش کی غیر منصفانہ تقسیم کو مٹا کر ایک ایسی بین الاقوامی سماج کو معرض وجود میں لانا ہے۔ جس میں ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کے اسباب میسر ہوں۔ لیکن آیئے اور ٹھنڈے دل سے غور کیجئے کہ جس ملک میں اس تعلیم کو عملی جامہ پہنایا گیا ہے۔ کیا وہاں یہی برکات ہیں؟

روس میں حالت زر

علم معاشیات کے مبتدی سے بھی یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ جہاں سماج کے وسائل پیدائش کے استعمال کی عام آزادی ہوگی وہاں اقدار (VALUES) اشیا (COMMODITY) زر (MONEY) تبادلہ (EXCHANGE) اور منڈی (MARKET) سب کے سب الفاظ بے معنی ہوں گے۔ روس میں اوائل انقلاب میں سکہ کے استعمال کو ختم کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔ لیکن ابھی چند سال گذرنے بھی نہ پائے تھے۔ کہ روبل کا بت پھر پوری آب و تاب سے روسی منڈیوں میں پجنے لگا۔ اگر روس کا رخ اس منزل کی طرف ہوتا جس کے سبز باغ آج سادہ لوح عوام کو دکھائے جا رہے ہیں۔ تو سکہ کا استعمال کم سے کم تر ہوتا چلا جاتا لیکن واقعات اس کے برعکس رونما ہوئے ۱۹۲۵ء میں جب اس امر کا احساس کیا گیا۔ کہ جن کارندوں کو ان کی خدمات کا معاوضہ جنس میں دیا جاتا ہے۔ ان کی ضروریات زندگی پوری نہیں ہوتیں تو ایم لارین (M. LARIN) نے روسی حکومت کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرانی چاہی۔ لیکن اسے دار پر لٹکا دیا گیا۔ کیونکہ ان کے نزدیک انقلاب آچکنے کے بعد کئے ہوئے عہد و پیمان کی یاد دہانی بدترین جرم تھا بوچرین (BUCHARIN) نے بھی زر کے استعمال کے خلاف آواز اُٹھائی کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جس سماج کا معبود زر ہو وہاں معاشی مساوات کا حصول ایک ایسا رنگین خواب ہے جس کی تعبیر اس آب و گل کی دنیا میں ناممکنات میں سے ہے۔ اس انسان کو بھی اپنی حق گوئی پر قبر کی آغوش میں پناہ لینی پڑی۔ کریسٹنشی (KRESTINSHI) نے بھی یہی نعرہ بلند کیا۔ اور اسے بھی آخر اسی افسوسناک انجام سے دوچار ہونا پڑا۔ اگر اشتراکی انقلاب انسانی آزادی کے لئے صبح صادق کی حیثیت رکھتا تو لارین اور بوچرین (BUCHARIN) اور اس کے اسی طرح کے دوسرے اشتراکی زعما آج لحد میں منہ چھپانے پر مجبور نہ ہوتے۔ وہ اس کے برعکس کروڑوں اشتراکیوں کے محبوب رہنما ہوتے اور آج قدر و منزلت کے تخت پر متمکن نظر آتے۔ اسی زر کے عام چلن کی وجہ سے اشتراکی روس میں امیر و غریب کے درمیان اختلافات کی ایک وسیع خلیج حائل ہو رہی ہے۔ وہ

ہر آن بڑھتی چلی جاتی ہے۔ سٹالن شاید ہی کسی دنیاوی لذت و آسایش سے محروم ہو۔ لیکن سچ بتایئے کہ کیا وہاں کے عوام بھی اسی طرح کی زندگانی بسر کر رہے ہیں۔ امیر و غریب کے طرز رہائش میں یہ اختلاف کسی اتفاقی حادثہ کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی تدبیر کے تحت ہوا۔ اس کا مقصد صرف زرعی اور صنعتی پیداوار کو بڑھانا نہیں تھا۔ بلکہ روس کے اندر ایک ایسے مفاد پرست گروہ کو جنم دینا تھا۔ جو حکومت کا ہاتھ ہر ظلم و ستم میں بٹانے کے لئے تیار ہو۔ چنانچہ چند سالوں کی کاوش سے روس میں ایک معتدبہ جماعت اس غرض کے لئے قائم ہو گئی ہے اور اس کی خدمات جلیلہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

نئی طبقہ واریت جب سماج کے ہر فرد کی اولین ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ اور عوام اپنے حالات پر قانع ہوں تو ایک مفاد پرست گروہ کو معرض وجود میں لانے کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی۔ مگر جب لوگ صورت حالات پر مطمئن نہیں ہوتے تو حکومت کو عوام میں سے ایسے تھڑدلے اور ضمیر فروش آدمیوں کی تلاش ہوتی ہے جن پر چاندی کی بارش کر کے غریب عوام کے گلے آسانی سے کٹوائے جا سکیں۔ اور وہ ہر انقلاب کے راستے میں زبردست رکاوٹ بن کر کھڑے ہو سکیں۔ روس میں یہ گروہ اعلیٰ فوجی افسران۔ خفیہ پولیس کے بالا حکام اور کارخانہ کے منتظمین اور مصنفین پر مشتمل ہے۔ اس جماعت کے ابھرنے کے دو فوائد ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ ہر ترقی کے راستہ میں حائل رہیں۔ دوسرے غرباء اور امراء میں اس قدر بعد و بیگانگی ہو جائے کہ کبھی وہ سر جوڑ کر سماج کے مسائل پر غور و فکر نہ کر سکیں۔ ۲۴ جولائی ۱۹۴۳ء کو ایک سرکاری اعلان میں بتایا گیا کہ آئندہ فوج میں ترقی صرف جرأت و بہادری کی وجہ سے ہی نہیں ہوا کرے گی بلکہ اب ترقی کے دروازے صرف مخصوص فوجی مدرسوں (SPECIAL MILITARY SCHOOLS) کے تعلیم یافتہ اصحاب کے لئے کھلیں گے۔ ان مدرسوں کے متعلق رالف پارکر (RALPH PARKER) نے نیویارک ٹائمز میں مورخہ ۲ نومبر ۱۹۴۲ء کو لکھا ہے۔ زار کے فوجی سکولوں کی طرح اس میں بھی صرف افسروں کے بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کی اجازت ہوگی۔ جو کہ جنگ میں کام آئے ہیں۔ رالف پارکر نے یہ بھی بتایا ہے کہ سرخ بیڑے میں مستقبل کے فوجی افسران کو اس امر کی سخت ہدایت کی گئی ہے کہ وہ ناچنا سیکھیں کیونکہ وہ روس کے طبقہ کے رہنما بننے والے ہیں۔ لہٰذا انھیں جاننا چاہیئے کہ سوسائٹی میں زندگی کس طرح بسر کی جا سکتی ہے۔ ۱۶ ستمبر ۱۹۴۵ء کے نیویارک ٹائمز میں برک ایٹکنسن (BROOK ATKINSON) نے ماسکو سے بتایا کہ سرخ فوج کا کلب صرف اعلیٰ افسران کے لئے مخصوص ہے۔ اس سے پیشتر فوج کا ہر کس و ناکس اس میں شریک ہو سکتا تھا۔ ریڈ سٹار (RED STAR) کا کہنا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی اور حکومت کی کوششیں اس بات پر مرتکز ہیں کہ افسران کے معیار کو اور بلند کیا جائے۔ میجر جنرل جان آرڈین نے جو روس میں دو سال بسر کر چکا ہے۔ ذکر کیا ہے کہ افسروں اور عام فوجیوں کے درمیان امتیاز دن بدن بڑھ رہا ہے۔ اور امتیاز کا یہ منظر دوسرے ممالک سے زیادہ گھناؤنا ہے۔ یہ تفاوت صرف

دنیا کی استعماری طاقتیں پوری نوع انسانی کے لئے عرصۂ حیات تنگ کئے ہوئے ہیں۔ فاقہ مستی سے مخلوق خدا دم توڑ رہی ہے۔ ہلاکت نے ہر ملک میں ڈیرے ڈال دیئے ہیں۔ اور ایں آدم اب ایک نئے انقلاب کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ اس انقلاب کی دعوت دینے والوں میں سب سے پیش پیش اشتراکی ہیں۔ اُن کا منتہائے مقصود جور و استبداد کو دنیا سے نیست و نابود کرنا ہے۔ ان کا نصب العین ہر قسم کی معاشی لوٹ کھسوٹ کو دنیا سے ختم کرنا ہے۔ اُن کا مطمح نظر ایک بین الاقوامی سوسائٹی کا قیام ہے۔ غرض ان کے پیش نظر رنگ و نسل کے امتیازات۔ دولت اور ذرائع پیدائش کی غیر منصفانہ تقسیم کو مٹا کر ایک ایسی بین الاقوامی سماج کو معرض وجود میں لانا ہے۔ جس میں ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق کھانے پینے اور پہنے اوڑھنے کے اسباب میسر ہوں۔ لیکن آئیے اور ٹھنڈے دل سے غور کیجئے کہ جس ملک میں اس تعلیم کو عملی جامہ پہنایا گیا ہے۔ کیا وہاں یہی برکات ہیں؟

روس میں حالت زر

علم معاشیات کے مبتدی سے بھی یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ جہاں سماج کے وسائل پیدائش کے استعمال کی عام آزادی ہو گی وہاں اقدار (VALUES) اشیا (COMMODITY) زر (MONEY) تبادلہ (EXCHANGE) اور منڈی (MARKET) سب کے سب الفاظ بے معنی ہوں گے۔ روس میں اوائل انقلاب میں سکہ کے استعمال کو ختم کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔ لیکن ابھی چند سال گذرنے بھی نہ پائے تھے۔ کہ روبل کا بت پھر پوری آب و تاب سے روسی منڈیوں میں پجنے لگا۔ اگر روس کا رخ اس منزل کی طرف ہوتا جس کے سبز باغ آج سادہ لوح عوام کو دکھائے جا رہے ہیں۔ تو سکہ کا استعمال کم سے کم تر ہوتا چلا جاتا لیکن واقعات اس کے برعکس رونما ہوئے ۱۹۲۵ء میں جب اس امر کا احساس کیا گیا۔ کہ جن کارندوں کو ان کی خدمات کا معاوضہ جنس میں دیا جاتا ہے۔ ان کی ضروریات زندگی پوری نہیں ہوتیں تو ایم لارین (M. LARIN) نے روسی حکومت کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرانی چاہی۔ لیکن اسے دار پر لٹکا دیا گیا۔ کیونکہ ان کے نزدیک انقلاب آ چکنے کے بعد کئے ہوئے عہد و پیمان کی یاد دہانی بدترین جرم تھا بوچرن (BUCHARIN) نے بھی زر کے استعمال کے خلاف آواز اُٹھائی کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جس سماج کا معبود زر ہو وہاں معاشی مساوات کا حصول ایک ایسا رنگین خواب ہے جس کی تعبیر اس آب و گل کی دنیا میں ناممکنات میں سے ہے۔ اس انسان کو بھی اپنی حق گوئی پر قبر کی آغوش میں پناہ لینی پڑی۔ کریسٹنشی (KRESTINSHI) نے بھی یہی نعرہ بلند کیا۔ اور اسے بھی آخر اسی افسوسناک انجام سے دوچار ہونا پڑا۔ اگر اشتراکی انقلاب انسانی آزادی کے لئے صبح صادق کی حیثیت رکھتا تو لارین اور بوچرن (BUCHARIN) اور اس کے اسی طرح کے دوسرے اشتراکی زعما آج لحد میں منہ چھپانے پر مجبور نہ ہوتے۔ وہ اس کے برعکس کروڑوں اشتراکیوں کے محبوب رہنما ہوتے اور آج قدر و منزلت کے تخت پر متمکن نظر آتے اسی زر کے عام چلن کی وجہ سے اشتراکی روس میں امیر و غریب کے درمیان اختلاف کی ایک وسیع خلیج حائل ہو رہی ہے۔ وہ

ہر آن بڑھتی چلی جاتی ہے۔ سٹالن شاید ہی کسی دنیاوی لذت و آسایش سے محروم ہو۔ لیکن سچ بتایئے کہ کیا وہاں کے عوام بھی اسی طرح کی زندگانی بسر کر رہے ہیں۔ امیر و غریب کے طرزِ رہائش میں یہ اختلاف کسی اتفاقی حادثہ کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی تدبیر کے تحت ہوا۔ اس کا مقصد صرف زرعی اور صنعتی پیداوار کو بڑھانا نہیں تھا۔ بلکہ روس کے اندر ایک ایسے مفاد پرست گروہ کو جنم دینا تھا۔ جو حکومت کا ہاتھ ہر ظلم و ستم میں بٹانے کے لئے تیار ہو۔ چنانچہ چند سالوں کی کاوش سے روس میں ایک معتدبہ جماعت اس غرض کے لئے قائم ہو گئی ہے اور اس کی خدمات جلیلہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

نئی طبقہ واریت | جب سماج کے ہر فرد کی اولین ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ اور عوام اپنے حالات پر قانع ہوں تو ایک مفاد پرست گروہ کو معرضِ وجود میں لانے کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی۔ مگر جب لوگ صورتِ حالات پر مطمئن نہیں ہوتے تو حکومت کو عوام میں سے ایسے تھڑدلے اور ضمیر فروش آدمیوں کی تلاش ہوتی ہے جن پر چاندی کی بارش کر کے غریب عوام کے گلے آسانی سے کٹوائے جا سکیں۔ اور وہ ہر انقلاب کے راستے میں زبردست رکاوٹ بن کر کھڑے ہو سکیں۔ روس میں یہ گروہ اعلیٰ فوجی افسران۔ خفیہ پولیس کے بالا حکام اور کارخانہ کے منتظمین اور مصنفین پر مشتمل ہے۔ اس جماعت کے ابھرنے کے دو فوائد ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ ہر ترقی کے راستہ میں حائل رہیں۔ دوسرے غربا اور امرا میں اس قدر بعد و بیگانگی ہو جائے کہ کبھی وہ سر جوڑ کر سماج کے مسائل پر غور و فکر نہ کر سکیں۔ ۲۴ جولائی ۱۹۴۳ء کو ایک سرکاری اعلان میں بتایا گیا۔ کہ آئندہ فوج میں ترقی صرف جرأت و بہادری کی وجہ سے ہی نہیں ہوا کرے گی بلکہ اب ترقی کے دروازے صرف مخصوص فوجی مدرسوں (SPECIAL MILITORY SCHOOLS) کے تعلیم یافتہ اصحاب کے لئے کھلیں گے۔ ان مدرسوں کے متعلق رالف پارکر (RALPH PARKER) نے نیویارک ٹائمز میں مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۴۲ء کو لکھا ہے۔ زار کے فوجی سکولوں کی طرح اس میں بھی صرف افسروں کے بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کی اجازت ہوگی۔ جو کہ جنگ میں کام آئے ہیں۔ رالف پارکر نے یہ بھی بتایا ہے کہ سرخ بیڑے میں مستقبل کے فوجی افسران کو اس امر کی سخت ہدایت کی گئی ہے کہ وہ ناچنا سیکھیں کیونکہ وہ روس کے طبقہ کے رہنما بننے والے ہیں۔ لہٰذا انھیں جاننا چاہیئے کہ سوسائٹی میں زندگی کس طرح بسر کی جا سکتی ہے۔ ۱۹ ستمبر ۱۹۴۵ء کے نیویارک ٹائمز میں برک ایٹکنسن (BROOK ATKINSON) نے ماسکو سے بتایا کہ سرخ فوج کا کلب صرف اعلیٰ افسران کے لئے مخصوص ہے۔ اس سے پیشتر فوج کا ہر کس و ناکس اس میں شریک ہو سکتا تھا۔ ریڈ سٹار (RED STAR) کا کہنا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی اور حکومت کی کوششیں اس بات پر مرتکز ہیں کہ افسران کے معیار کو اور بلند کیا جائے۔ میجر جنرل جان آرڈین نے جو روس میں دو سال بسر کر چکا ہے۔ ذکر کیا ہے کہ افسروں اور عام فوجیوں کے درمیان امتیاز دن بدن بڑھ رہا ہے۔ اور امتیاز کا یہ منظر دوسرے ممالک سے زیادہ گھناؤنا ہے۔ یہ تفاوت صرف

فوج تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ ہمہ گیر ہے۔ اور زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو اس کے اثر سے محفوظ ہو۔ اسی طرح سویٹ انجینئر بڑے بڑے سرکاری افسر، کارخانوں کے ڈائرکٹر عوام کے معیار سے بہت بلند زندگی بسر کرتے ہیں۔ جنرل موصوف نے لائف (LIFE) میں پوزیر (POZIRER) نامی ایک شخص کی رہائش سے متعلق تذکرہ کیا ہے۔ یہ صاحب لینن گراڈ کے ایک کارخانہ کے منیجر ہیں۔ جنرل موصوف بیان کرتے ہیں کہ پوزیر اس گنجان آباد شہر میں چار کمروں میں رہتا تھا۔ جہاں چار خاندانوں کو ایک کمرہ میسر آسکتا تھا۔ اس کی اپنی کار تھی۔ اپنا ڈرائیور۔ ہوائی جہاز اور بحری جہاز اس کے علاوہ خوراک کا با افراط ذخیرہ بھی اس کے قبضہ میں تھا۔ رقص گاہوں اور سینماؤں میں اس کے لئے بہترین جگہ مخصوص تھی۔ اس کی یہ زندگی ۱۹۴۲ء کی تھی۔ جب روس جرمنی کے ساتھ موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا تھے۔ اس آرام و آسائش کا تصور امن و اماں کے زمانہ میں بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیا یہ وہی عوام کا معیار ہے یہ تسلیم ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں غریبوں کے خون سے امیروں کا گوشت پوست بنتا ہے۔ مگر یہ حالت اس روس میں آخر کیوں پائی جاتی ہے جو عہد حاضر میں آزادی و مساوات کی نیلم پری کا نشیمن ہے! آزادی رائے کا آج وہاں بھی اسی طرح گلا گھٹتا ہے۔ جس طرح کہ دوسرے سرمایہ دارانہ ملکوں میں ہے۔ اور یہ کہنا بالکل مبالغہ آمیز نہیں ہوگا کہ دنیا کے کسی آمرانہ نظام میں ڈکٹیٹر (DICTATOR) کے ہاتھ اتنے مضبوط نہیں جتنے کہ اشتراکی روس میں سٹالن کے ہیں۔ لینن اور اس کے ساتھیوں کے درمیان بھی اختلافات رونما ہوئے۔ لینن نے انھیں حق اور سچ برداشت کیا۔ اور اپنی دماغی قابلیت کے بل بوتے پر انہیں شکست دی۔ مگر سٹالن کا حربہ مختلف ہے۔ جی۔ پی۔ یو (سٹالن کے خفیہ کارندوں) نے سٹالن کے لئے وہ کارہائے نمایاں سرانجام دئے جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں ناپید ہے۔ آج سے چند سال پیشتر کمیونسٹ پارٹی کے مخالفین ٹراٹسکی۔ کمینو۔ زینویو کو یہ اجازت تھی کہ وہ علانیہ اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ وہ کتب اور مضامین کی اشاعت پوری جمعیت خاطر کے ساتھ کر سکتے تھے۔ وہ نہایت ہی آزادی کے ساتھ اشتراکی راہنماؤں کے طریق کار پر تنقید کر سکتے تھے۔ پارٹی کے سرکاری اخبار پرواده (PRA VADA) کا ایک صفحہ اسی بحث کے لئے وقف تھا۔ لیکن اب یہ ساری مراعات محض قصہ پارینہ بن کے رہ گئی ہیں۔ اب کوئی فرد بھی اختلاف رائے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ پارٹی کی رکنیت پر بھی کڑی پابندیاں عاید ہو چکی ہیں۔ اور عوام حکومت کی اس بے رحم مشین کے صرف کل پرزے بن کے رہ گئے ہیں۔ جن کا کام صرف وہی کام کرنا ہے۔ جو حکومت چاہتی ہو۔ سٹالن اس امر سے بالکل بے نیاز ہے کہ وہ عوام سے کوئی مشورہ لے ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۵ء تک جنگ کے پر آشوب حالات میں بھی پارٹی کے اجتماعات سال میں ایک دفعہ منعقد ہوتے رہے۔ لیکن سٹالن کے عنان حکومت سنبھالتے ہی پندرہویں کانگریس پورے دو سال کے بعد منعقد ہوئی۔ سولھویں ۱۹۳۰ء۔ سترھویں ۱۹۳۴ء اور اٹھارویں ۱۹۳۹ء میں منعقد ہوئی۔

اسٹالین کی جباریت

سٹالن کے آہنی ہاتھوں نے اپنے راستے سے مخالفت کے سب کانٹوں کو صاف کر دیا۔ اور اس سے سویٹ کمیونسٹ پارٹی کے وقار اور روح دونوں کو بہت بھاری نقصان پہنچا ہے۔ سٹالن کے

ہر مخالف پر تخریب وطن کا الزام لگایا گیا۔ اور یہ بات نہایت ہی افسوسناک ہے کہ ہزاروں وہ اشخاص جو دوسروں کی موت میں سٹالن کے مدد و معاون ثابت ہوئے خود اپنی جانوں کو بھی اس ظلم سے کسی صورت میں نہ بچا سکے۔ اشتراکیت کے حامیوں کا کہنا ہے کہ سٹالن ۱۹۳۵ سے ۱۹۳۸ تک مجبور تھا کہ غیر ملکی ایجنٹوں کے خلاف سخت کاروائیاں کرتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ سماج کو ہر آلائش سے پاک و منزہ کرنے کے بعد بھی اب شہری آزادی پر کیوں اتنی کڑی پابندیاں عائد ہیں۔ اب خفیہ پولیس اپنے کام کاج کی بساط آخر کیوں نہیں لپیٹ لیتی؟ غیر ملکی اخباروں پر آخر کیوں قدغن ہے۔ بیرونی رسائل و جرائد کیوں ہر کس و ناکس کو پڑھنے کے لئے نہیں دیئے جاتے۔ اور یہ استحقاق صرف چند افراد کے لئے کیوں مخصوص ہے۔ آپ شاید سن کر حیران ہوں گے کہ کوئی شخص ٹراٹسکی (TROTSKY) اور بخارن (BUKHARIN) یا کسی ایسے شخص کی لکھی ہوئی کتاب نہیں پڑھ سکتا ہے۔ جس کے ساتھ سٹالن کا اختلاف تھا۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ سویٹ کے مصنفین۔ سائینس دان اور صنعتی کام کرنے والوں کو دوسرے ممالک میں جانے کی عام اجازت نہیں دی جاتی۔ کیوں روسی عوام کو بیرونی ممالک کے ریڈیو پروگرام سننے کی آزادی نہیں ہے۔ روس کے اندر سوائے چند بڑے فوجی یا سیاسی افسران کے کوئی روسی بھی طاقتور ریڈیو سٹ نہیں رکھ سکتا۔ مبادا وہ غیر ملکی خبریں سن لے۔ اسٹالن کو اپنی رعایا پر اعتماد نہیں ہے۔

سٹالن کی جنبش لب۔ بلکہ تیور ہی روس کا موجودہ قانون ہے۔ وہ جب چاہے بغیر کسی شامت کے اس میں رد و بدل کر سکتا ہے۔ یا جو معانی اس کو پہنانا چاہئے پہنا سکتا ہے۔ ۱۹۳۶ کے دستور کی دفعہ ۱۲۱ کے مطابق۔ سویٹ یونین کے ہر شہری کو تعلیم حاصل کرنے کا پورا پورا استحقاق تھا۔ اور ابتدائی لازمی۔ تعلیم ہر شہری کو میسر تھی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے بھی بیشمار وظائف دئے جاتے تھے۔ تاکہ ہر خاص و عام زیور تعلیم سے آراستہ ہو سکے۔ لیکن ۲ اکتوبر ۱۹۴۰ء کو ایک جنبش قلم نے سارا قانون بدل کر رکھ دیا۔ مفت ثانوی تعلیم ختم کر دی گئی۔ اب بغیر جنس کی ادائیگی کے کوئی شخص بھی ہائی سکولز۔ کالجوں۔ یونیورسٹیوں یا صنعتی اداروں میں تعلیم حاصل کرہی نہیں سکتا۔ دستور میں کسی تبدیلی کی ضرورت پیش نہیں آئی کسی شہری کو جرأت نہیں ہوئی کہ وہ حکومت کے خلاف ایک لفظ بھی کہہ سکے۔ کسی نے چند حروف تک اخبار میں لکھنے کی جرأت نہیں کی۔ آخر یہ جرأت کون کرتا

وہی قاتل وہی شاہد۔ وہی منصف ٹھہرے
اقربا میرے کریں خون کا دعویٰ کس پر

جب پریس حکومت کا ہے۔ رائے عامہ کی مالک حکومت ہے۔ تو لب کشائی کی جرأت کون کر سکتا ہے۔ اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ غربا کے بچوں کے لئے اعلیٰ التعلیم کا حاصل کرنا خون جگر پینے کے مترادف ہوا۔ انھوں نے ہزاروں کی تعداد میں یونیورسٹیوں کو خیرباد کہنا شروع کیا۔ اور امرا کے بچوں کے لئے درس گاہوں کو خالی کر دیا۔ امرا کے یہی بچے بڑے ہو کر مفاد پرست طبقہ کے داعی بنے۔ روسا کے بچے بڑے ہو کر سائینس دان۔ انجینیر۔ پروفیسر اور مصنفین بنے اور غربا کے

بعض باوجود اعلیٰ ذہنی استعداد کے مالک ہونے کے غریب مزدور بن کے رہ گئے۔ اس طبقہ کی اچھی خاصی تعداد تیار کر چکنے کے بعد اور اس کو زندگی کے تمام شعبوں میں راہنمائی دے چکنے کے بعد پھر اسٹالن کی محبت جوش میں آئی اور ۱۹۴۴ میں دفعہ ۱۲۱ پر عمل درآمد ہونا شروع ہوا۔ غربا کو ساری مراعات پھر دے دی گئیں۔ کیونکہ مفاد پرست طبقہ اس گروہ کو رہواری گھوڑے کی طرح زندگی کے ہر میدان میں اب بہت پیچھے چھوڑ چکا تھا۔

آہنی پردے کے پیچھے

روس کے اندر ہر وہ شخص جس کا سٹالن سے اختلاف ہے۔ یا جو سٹالن کا منظور نظر نہیں ہے رجعت پسند ہے۔ حکومت نے محنت کے ساتھ دماغ کو بھی خرید لیا ہے۔ ۶ دسمبر ۱۹۳۶ء سویٹ کے نئے دستور پر ۳۰ روسی زعماء نے دستخط کئے جن میں سٹالین۔ مولوٹوف۔ لٹوینو (LITVINVO) شامل تھے۔ ۱۹۳۹ تک ان میں سے پندرہ۱۵ کو ختم کر دیا گیا۔ اور بیشتر گولی کا نشانہ بنے۔ ظلم کے تختہ مشق بننے والوں میں ایک Marshal Bluehen بھی تھا جو فار ایسٹرن ریڈ آرمی کا کمانڈر ان چیف تھا۔ ان میں ROSTY SHER YEZHOV یوکرین کی کمیونسٹ پارٹی کا لیڈر بھی موجود تھا۔ ان میں جی۔ پی۔ یو کا افسر اعلیٰ ——— بھی تھا۔ اس کے علاوہ LYUBCHENKO یوکرین کا وزیر اعظم بھی تھا۔

روس کا نصاب تعلیم و تربیت انسانوں کو صرف مشین کی طرح کام کرنا ہی نہیں سکھاتا۔ بلکہ ان سے قوت فکر بھی سلب کر لیتا ہے ان کے فکر کا رقاص صرف اشیا کے پیدا کرنے تک ہی محدود رہتا ہے۔ ایک سویٹ ناول میں جس کا نام UNKNOWN ARTIST ہے ایک روسی کریکٹر بیان کیا گیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ کہ اخلاق ایک ایسا لفظ ہے جس کے متعلق مجھے کبھی سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ میں اشتراکیت کی تعمیر میں بے حد مشغول ہوں اگر مجھے اخلاق اور پاجامے میں ایک چیز کے انتخاب کا اختیار دیا جائے تو صرف پاجامہ کو ہی پسند کروں گا۔ یہ الفاظ روسی ذہنیت کی پوری طرح غمازی کر رہے ہیں۔ ڈکٹیٹر اگر مادی اشیاء کی پیدائش کو بڑھا سکتا ہے تو پھر وہ ہر تنقید سے بالا تر ہے۔ چاہئے اس مقصد کے حصول کے لئے کتنے ہی ناپاک ذرائع استعمال میں لائے جائیں اور اپنے نصب العین کو کتنی دفعہ پامال کرنا پڑے۔

سٹالن کے ساتھ یہ بے پناہ عقیدت اور اس کے ہر اشارے پر جاں نثاری ایک منظم تحریک کا نتیجہ ہے۔ اس میں تعلیم و تربیت اور نشر و اشاعت کے ذرائع کو پوری ہوشیاری و عیاری سے کام میں لایا گیا ہے۔ ہر کامیابی کا سہرا اس کے سر ہے۔ اور ہر ناکامی کی لعنت کا طوق اس کے مخالفین کے گلے میں ہے۔ سویٹ نازی جنگ کے پہلے مہینے میں جب کہ روسی افواج بری طرح پسپا ہو رہی تھیں سٹالن لوگوں کی نظروں سے بالکل اوجھل ہو گیا۔ ریڈیو اور پریس میں سٹالن کا نام کبھی نہیں آتا تھا۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا نام شکست کے وقت لیا جائے۔ مگر جونہی سرخ فوج نے بڑھنا شروع کیا سٹالن کا نام شہرت کے افق پر درخشاں نظر آنے لگا۔

حامیانِ اشتراکیت کا ایک سوال

اشتراکیت کے حامیوں کی طرف سے ایک سوال جو عام طور پر کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ روس میں اگر واقعی خستہ حالی ہے تو آخر لوگ بغاوت کیوں نہیں کر دیتے۔ اس سے متعلق عرض ہے کہ کسی نظام کو آزمانے کیلئے ۳۲ سال یا اس سے کم وبیش مدت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ عوام کو انقلاب کے لئے تیار کرنا ایک نہایت ہی کٹھن منزل ہے۔ انقلاب کو برپا کرنے کے لئے کئی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک کاشتکار جنکی ملک میں اکثریت ہے ہروقت حکومت کے دست نگر ہیں تو ان کے اندر آزادی کس طرح کروٹیں لے سکتی ہے کارخانوں میں ملازم حکومت اکٹھی ہے وہ ہڑتال نہیں کر سکتے مزدور یونین ہمارے ملک کی طرح نہیں۔ اس کے علاوہ مفاد پرست طبقے نے حکومت کے ہاتھ نہایت ہی مضبوط کر دئے ہیں۔ اور یہ گرفت آسانی سے ڈھیلی نہیں ہو سکتی۔ جو انسان روس میں کام نہیں کرتا وہ جیل میں جاتا ہے۔ جو اعتراض کرے وہ قید و بند کی مصیبتیں جھیلتا ہے مولوٹوف سے لیکر نیچے تک سب پر تخریب کا الزام لگایا جا سکتا ہے۔ اور بغیر کسی تکلیف کے موت کے گھاٹ اتارا جا سکتا ہے پھر انسان باغیانہ خیالات کی اشاعت کس طرح کر سکتا ہے کیونکہ تمام ذرائع پر تو حکومت قابض ہے۔ باہر کی کوئی قوت بھی روس کی آہنی دیواروں کو پھاند نہیں سکتی۔ سادہ لوح عوام کے دل و دماغ پر یہ بات ثبت کر دی گئی ہے کہ سٹالن بری عن الخطا ہے۔ لہٰذا وہ جو کرتا ہے حق ہے۔ اور جو اس کی مخالفت کرتا ہے وہ دراصل صداقت و حق کی مخالفت کرتا ہے۔

۱۹۳۶ء میں سٹالن کے مخالفین GENERICH YAGODA کے ہاتھوں نیست و نابود کئے گئے لیکن YAGODA خود بھی اس خطرناک انجام سے نہ بچ سکا۔ اس پر بغاوت کا الزام لگایا گیا۔ اور آخر کار اُسے بھی موت کا مزہ چکھنا پڑا۔ جانشین YEZHOV کا بھی یہی حشر ہوا۔ بغاوت کی صرف دو ہی صورتیں ہیں کہ یا تو خفیہ فوج بغاوت کے لئے آمادہ ہو یا فوج اس کام کا بیڑا اُٹھائے۔ لیکن خفیہ پولیس کا مفاد پرست طبقہ پوری ہوشیاری سے روس کے اندر اور باہر کے سفارت خانوں میں ہر وقت سرگرم عمل رہتا ہے۔ اس جماعت کے کارکن ایک دوسرے پر بھی کڑی نگرانی کرتے ہیں اور سٹالن ان سب پر نظر رکھتا ہے۔ وہ ان کی ہر حرکت کو بھانپ لیتا ہے۔ باہر سے جو خبریں آتی ہیں اُن کو سٹالن احتیاط کی چھلنی میں چھان کر لوگوں تک پہنچاتا ہے۔

سب سے پہلی بغاوت

یہ بات کتنی تعجب خیز ہے کہ جنگ کے اختتام پر ہزاروں روسی قیدیوں نے جن کو نازی لے گئے تھے وہیں رہنا پسند کیا۔ اور واپس آنے کے لئے طرح طرح کے بہانے تراشے گئے۔ یلٹا کانفرنس میں سٹالن نے اس چیز کا مطالبہ کیا اور روزویلٹ اور چرچل بدقسمتی سے اس بات پر رضامند ہو گئے کہ روسیوں کو زبردستی واپس بھیج دیا جائے۔ اگر وہ وہاں رہتے تو شاید اس ملک کے حالات ذرا تفصیل کے ساتھ ہمیں مل جاتے۔ ان میں سے بعض نے مزدوروں کی جنت میں واپس جانے کی بجائے موت سے ہم آغوش ہونا اپنے لئے پسند کیا۔ عوام کبھی بھی اتنے فہیم نہیں ہوتے کہ حالات و واقعات کو سمجھ لیں۔ فرنگی استعماریت نے پورے ڈیڑھ سو سال ہندوستانی عوام کا خون چوسا اور اس زرخیز ملک کو فاقہ مست کر دیا۔ یہاں کے رہنے والے زندہ درگور ہو گئے۔ لیکن ذرا اندازہ تو لگائے کہ آخر کتنی بغاوتیں ہوئیں اور کتنی کامیاب ہوئیں۔ فوج کا بیشتر حصہ ہندوستانیوں پر مشتمل تھا۔ لیکن کتنوں نے علم بغاوت بلند کیا ہر ہندوستانی کا دل نفرت سے

بھرا پڑا تھا۔ لیکن اس کے ہاتھ پاؤں آہنی زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے۔ اور ان زنجیروں کے بنانے اور پہنانے والے اپنے ہی تھے۔ جنھوں نے ہماری قوتوں کا پوری طرح اندازہ لگا کر مضبوط ترین حلقے بنائے۔ ہم نے جیل میں آ کر ایک دوسرے کا خون بہایا اپنی بہو اور بیٹیوں کی عصمت کو لوٹا۔ لیکن افسوس جو ان سب برائیوں کا محرک تھا۔ کسی کی آنکھ اس طرف نہ اٹھی۔ اور وہ آج دنیا کا معصوم ترین انسان تصور کیا جاتا ہے۔ وہ آج ہماری عقیدت مندی کا سب سے بڑا بت ہے۔

اسٹالن گراڈ کی جیت

یاد رکھیئے کہ کسی قوم کی فتح و شکست کا انحصار صرف اس کا بہتر نظام زندگی ہی نہیں ہوتا۔ نازی اور جاپانی بھی تو آخر کار لڑے اور بڑی جرأت و مردانگی سے لڑے۔ امریکہ اور برطانیہ نے بھی تو جنگ جیتی۔ تو کیا یہ بات مان لی جائے کہ ان کا نظام حکومت عمدہ ہے۔ سٹالن گراڈ کی جیت صرف نظام کا کرشمہ نہیں تھی بلکہ اس میں حالات کو بھی کافی دخل ہے۔ سٹالن گراڈ پر جرمنوں کو رسد حاصل کرنے میں بڑی مشکل درپیش تھی۔ اور روسی ریزرو فوج بالکل قریب تھی۔ اس کے علاوہ اس وقت تک روسیوں میں قومیت کا جذبہ بھی پوری شدت کیساتھ پیدا ہو چکا تھا اور وہ اپنے ملک کے بچاؤ کے لئے خون کے سمندر میں سے گزرنے اور تلوار کی دھار پر چلنے کے لئے بالکل تیار تھے۔ ہر بڑی سے بڑی قربانی کے لئے وہ کمر بستہ تھے۔ اس کے علاوہ موسم سرما نے بھی معاونت کی۔ اس کے برعکس نازی فلسفہ حیات کچھ اس قدر گھناؤنا تھا کہ دوسرے اس کو کسی صورت بھی لبیک نہیں کہہ سکتے ہیں۔ ان سب اسباب کے ملنے کی وجہ سے روسی کامیاب ہوئے۔ لیکن اس ملک کے سپاہیوں کے سامنے بھی کوئی مقصد نہ تھا۔ وہ دوسرے سپاہیوں سے سیرت و کردار میں کسی طرح مختلف نہیں تھے۔ ان کے پیش نظر بھی صرف دلفریب نعرے اور مادی فوائد ہی تھے۔ چنانچہ تمام دنیا میں معاشی مساوات کے علمبرداروں نے جہاں کہیں بھی قدم رکھا۔ کسی صورت میں دوسروں سے کم نہ رہے۔ برلن کے صنعتی حلقوں میں اشتراکیت کے حامی جرمنوں نے سرخ فوج کا سرخ جھنڈوں کے ساتھ نہایت ہی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ لیکن بین الاقوامیت کے علمبرداروں نے اپنے حامیوں کو بھی نہایت ہی سفاکی سے تاخت و تاراج کیا۔ روسی افواج کسی حیثیت سے بھی دوسروں سے ارفع و اعلیٰ نہیں تھیں۔ وہ بھی بلیک مارکٹ کرنے میں اتنی ہی حریص ثابت ہوئیں جتنی کہ دوسری۔ انھوں نے بھی دوست و دشمن سب کو دل کھول کر لوٹا۔

روس میں صرف ٹراٹسکی ایک ہمہ گیر اشتراکی انقلاب کا آرزومند تھا۔ اور وہ اپنی بیرونی پالیسی اسی نقطہ نظر سے متعین کرنا چاہتا تھا۔ لیکن آج اس نصب العین کا داعی قبر میں آرام کر رہا ہے۔ سٹالن نے اپنی پالیسی کی وضاحت ہاورڈ کے ایک انٹرویو میں صاف ظاہر کر دی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہمارا کوئی ایسا ارادہ نہیں کہ ساری دنیا میں یہ انقلاب برپا کریں۔ جرمنی کی شکست کے لئے اس نے ذلیل قسم کے سرمایہ دار ممالک سے ساز باز کی۔ طبقاتی جنگ کی جگہ تنازع للبقا نے لے لی۔ جنگ کے دوران میں روسیوں کا خیال تھا کہ طبقاتی جنگ جرمنی اور جاپان میں لڑی جائے۔ اور انگریز اور امریکہ اس سے محفوظ رہیں۔ لیکن افسوس ذاتی مفاد نے اصول کو پس پشت ڈال دیا۔ کیا یہی مثالی حکومت ہے۔

استبدادیت کی انتہا

ان سب واقعات سے ہمیں یہ نہ اندازہ لگایا جائے کہ روسی حکومت کا یہ جبر و استبداد اور اپنے رنگین نصب العین سے انحراف محض بخت و اتفاق کا نتیجہ ہے نہیں بلکہ سٹالن ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ کیونکہ اشتراکیت کا مزاج ہی ایک شدید ترین ڈکٹیٹر شپ کا مقتضی ہے۔ اس نظام میں حکومت تمام چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں کو نگل کر خود ایک بہت بڑی سرمایہ دار بن جاتی ہے۔ اور یہ بڑا سرمایہ دار لطیف انسانی جذبات کی اس اقل قلیل مقدار سے بھی خالی ہوتا ہے جو سرمایہ دار افراد میں پائی جاتی ہے۔ وہ بالکل ایک مشین کی طرح افراد سے خدمت لیتا ہے اور ایک بے حس مشین کی طرح پورے استبداد کے ساتھ ان کے درمیان اسباب حیات تقسیم کرتا ہے۔ اس کے پاس نہ ہمدردی ہے نہ قدر و اعتراف۔ وہ انسانوں سے انسانوں کی طرح کام نہیں لیتا۔ بلکہ جیسا میں ذکر کر چکا ہوں مشین کے پرزوں کی طرح کام لیتا ہے۔ اور اُن سے فکر و رائے و عمل کی آزادی بالکل سلب کر لیتا ہے۔ اس شدید استبداد کے بغیر نظام اشتراکی نہ قائم ہو سکتا ہے نہ رہ سکتا ہے۔ کیونکہ افراد کی فطرت اس نظام کے خلاف ہر وقت آمادہ بغاوت رہتی ہے۔ اگر ان کو دائماً استبداد کے آہنی پنجہ میں جکڑ کر نہ رکھا جائے تو وہ اشتراکی نظم کو دیکھتے دیکھتے منتشر کر دیں یہی وجہ ہے کہ روسی گورنمنٹ دنیا کی سب حکومتوں سے زیادہ مستبد اور جابر ہے۔

سرمایہ داری کا ارتقاء

اس ساری بحث سے یہ مراد نہیں ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اس سے بہتر ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو ان دونوں نظاموں کے محرکات یعنی نفع اندوزی اور شکم پروری ہیں سطح بین آنکھ اشتراکیت اور سرمایہ داری میں ضرور ایک عظیم الشان فرق دیکھتی ہے۔ مگر جب ہم چند سطحی اختلافات سے ہٹ کر دونوں محرکات پر غور کرتے ہیں تو ان میں کوئی اختلاف نہیں پاتے۔ محسوس ظاہر اختلافات کے باوجود دونوں میں یگانگت اور مناسبت ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اشتراکیت سرمایہ داری کی ہی ایک ترقی یافتہ شکل ہے اور یہی اسی سلسلے کی ایک نہایت ہی اہم کڑی ہے تو یہ بات کسی طرح بے جا نہیں ہو گی۔ کیونکہ جن عقلی اور اخلاقی عناصر سے ان کی سرشت کا خمیر تیار کیا گیا ہے وہ دونوں میں یکساں اور مشترک ہیں۔ ذہنیت دونوں کے پیچھے ایک ہی کارفرما ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس ذہنیت کو بدلا جائے۔ انسان کے اندر جو انسان کام کر رہا ہے پوری توجہ اس کی اصلاح پر صرف کی جائے۔

لوہے کی مشینوں کی نہیں کوئی خرابی

مٹی کی مشینوں کی کوئی چال غلط ہے

بلند مقاصد

محض جھروں کی کنگروں کے ذریعہ حاصل نہیں ہوتے بلکہ اُن کی خاطر ایک نمونے کی جماعت تیار کر کے، پست مقاصد کے خلاف ایک اصولی جد و جہد کرنا پڑتی ہے، تب کہیں جا کر وہ پروان چڑھتے ہیں اسلام کا خدا پرستی کا مقصد سب سے بلند اور ارفع ہے اس لئے اس کے ماننے والوں کو بھی یہی طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔

"درندہ"

اصغر عابدی

پاؤں میں چھا نجھ چھا چھم کوئی بجتا بھی نہ تھا
اور ابھی محفل رنگیں کے کسی گوشے میں
ستم و جور سے انسان کو روتا بھی سنا!
ستم و جور ہی، نسل و وطن قوم و زباں کا
ستم و جور کے نغمے کو دم مرگ سنا!
"زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا؟"
کیوں مرے دوش پہ ہستی کا وزن رکھتے ہو!
کیوں مجھے اپنا شہنشاہ بنا دیتے ہو!
اور کیوں تخت پہ تم مجھکو بٹھا دیتے ہو!
اور کیوں دہر کی انسانیت کبریٰ کا۔
بوجھ اُٹھانے کیلئے "رہبر کامل" سمجھا!
میری آغوش ہی ہے میرا دامن گندا
میرے دامن پہ ہزاروں ہی پڑے ہیں دھبے
میں تو "انسان" ہوں ایک سب کی طرح ادنیٰ سا!
"عشق اب پیروی عقل خدا داد کرے!"
میں تو انساں بھی نہیں ایک درندہ ہوں میں
میں نے انسانیت، علم و ہنر کو کھویا
میں نے خود عقل کے سر پہ دیا پتھر مار
میں نہیں "عقل پرست" عقل پسند بھی تو نہیں!
علم و قانون کی کتابوں کو ابھی دور رکھو

فلسفہ و حکمت و دانائی ابھی دور رکھو
تم مرے پاس سے بدبو سے خوں کی سونگھو!
جیسے رستے ہوئے ناسور کی ہو تیز سڑاند!
باغ میں بلبل شیریں نہیں گلچیں ہے کوئی!
"کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا!"
زندگی عہد گزشتہ کی فقط یاد ہے اب
اب مجھے "عہد گزشتہ" کی طرف پہنچا دو!
وقت کے گھوڑے کی باگوں کو پلٹ دے ساقی
اور ابھی "عہد گزشتہ" میں مجھے پہنچا دے!
عہد وہ عہد کہ جس عہد میں انساں تھا
ہاں اسی عہد میں جب پھول کھلے تھے ہرسو
اور ایک "ہستی بالا" کے جسے کیا کہیے
ربّ سے انسانیت کبریٰ کا "حق" لائی تھی
"کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں!"
میرے بالیں پہ لب گور کوئی روتا ہے۔
"میں نہ اُس عہد کو مر عہد سے بالا سمجھا
"اور خود عقل کے سر پہ ہی دیا پتھر مار"
میں تو انساں بھی نہیں ایک درندہ ہوں میں!

سماجی انقلاب

از:- جناب انور اعظمی۔

انسانیت کی تاریخ اس حقیقت کی تائید کرتی ہے کہ انسان جہاں کہیں اور جس دور میں بھی رہا ہے اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنے تمدن، اپنی معاشرت، روزآنہ کے معاملات اور ذہنی و فکری زاویوں کی تعیین کرے، انسان اس پھیلی ہوئی دنیا میں۔ دنیا سے الگ ہو کر ۔۔۔ اپنی الگ دنیا نہیں قائم کرسکتا اس لئے کہ اس نے ماں کی گود کا خلوص اور پیار حاصل کیا ہے باپ کے شفقت آمیز ہاتھوں نے اس کی پرورش میں نمایاں دلچسپی لی ہے، بھائی کی محبت۔ بہن کے خلوص سے اس نے فائدہ اٹھایا ہے، خاندان والوں کی مشفقانہ نگرانی میں اس نے زندگی کا ابتدائی سفر طے کیا ہے۔ آگے بڑھئے تو شہری حقوق ہیں، حکومت کے عام سماجی قانون اور زندگی کو برقرار رکھنے والے ضابطے ہیں، ان سب سے انسان نے اپنی زندگی کو پائدار اور مضبوط بنایا ہے ۔۔۔ ہوسکتا تھا کہ انسان دنیا کے اندر قدم رکھے لیکن نہ تو اس کے لئے ان کی پیار سے بھری ہوئی گود ہو اور نہ باپ کا محبت سے پھیلایا ہوا ہاتھ، نہ تو بھائی اور بہن کا خلوص اور محبت ہو اور نہ پڑوسیوں اور خاندان والوں کی ابھری ہوئی دلبستگیاں اور ہمدردیاں، حکومت نہ ہوتی کہ ننھی سی جان کے لئے زندگی کی آسانیوں اور حفاظت کا انتظام کرے۔

لیکن کائنات کے پیدا کرنے والے نے ان تمام وسائل کا انتظام اور اہتمام کیا اور جس دائرہ کے اندر جو بات مناسب تھی اسی کو جگہ دی۔ اس لئے کہ انسان پوری بے فکری اور کمال سہولت کے ساتھ اپنی زندگی کا ابتدائی سفر طے کرے اور آنکھوں کے کھلنے، پیروں میں طاقت اور ہاتھوں میں قوت آجانے کے بعد چلتی ہوئی معاشرت کے قانون کو سنبھالے۔ دماغ کی ہر کاوش، ہاتھ پیر کی ہر حرکت سے سماج کو انسانی جماعت کے لئے حد درجہ سودمند بنا دے ۔۔۔ پھر جس طرح اس نے معاشرہ کے تمام نفع بخش ذریعوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ خود بھی ایک ذریعہ بن کر آنے والی انسانی دنیا کے لئے ایک سہارا بن جائے، اسی لئے اتنا اہتمام کیا گیا کہ ماں کی محبت ہو، باپ کی شفقت ہو، خاندان کا پیار ہو، حکومت کا نگراں فکر ہو۔

انسان کی محبوب زنجیر

یہ تمام نفع بخش اور سودمند ذرائع اور وسائل، انسان کو ایک غیر مرئی مگر محبوب زنجیر میں مقید کر دیتے ہیں اس لئے کہ اگر کوئی انسان ان تمام ذرائع اور وسائل کے حقوق کو ۔۔ جن سے اس نے اپنی زندگی استوار کی ہے ۔۔۔ بالائے طاق رکھ کر یہ چاہے کہ اپنی دنیا تک اپنی تمام فکری اور عملی صلاحیتوں کو محدود کرلے تو یقیناً اس کا دماغ، اس کا دل، اس کا ضمیر ۔۔۔ اگر ان کے اندر زندگی موجود ہے ۔۔۔ اور اس کے آس پاس کی دنیا پھیلی ہوئی کائنات ہر چہار جانب سے اس پر لعنت برسنے لگتی ہے، یعنی اس سے بڑھ کر بے ایمان اور احسان فراموش کون ہوگا، جو اتنی تمام نوازشوں اور احسانوں کا بار گراں سر پر رکھ کر سبکدوش بن کر آزادانہ زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ یہ داغ جو دامن انسانیت

پر حقوق کی پامالی اور حدود کی شکستگی کے بدنما داغ لگ جاتا ہے انسانی جماعت کا کوئی فرد بھی اس داغ سے اپنے دامن کو داغدار کرنے پر تیار نہیں ہو سکتا، اور اسی داغ سے بچنے کے لئے ایک انسان اپنے ماں باپ کا احترام تسلیم کرتا ہے۔ پھر جب کبھی ان میں سے کسی کی عزت اور ناموس کے دامن پر دھبہ پڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے تو لڑکا ہونے کی صورت میں باپ اور ماں کے لئے، فرد ہونے کی حیثیت سے خاندان، گروہ، اور ملک کے لئے ساتھی ہونے کی وجہ سے دوست بیوی اور پڑوسی کے لئے، بھائی ہونے کی علت سے بہن اور بھائی کے لئے، باپ ہونے کے سبب بیٹے، بیٹی اور اپنی پوری نسل کے لئے، ایک ہوشیار اور غیرت مند انسان بیقرار ہو جاتا ہے اور پوری کوشش کرتا ہے کہ آن اور ناموس پر یہ دھبہ جو انسان ہونے کی حیثیت سے لگ رہا ہے، دامن کو داغدار نہ بنانے پائے، چاہے اس جد وجہد میں اس کی زندگی سراپا مصیبت ہی کیوں نہ بن جائے۔

یہی جذبات ـــــ جس کے اثر سے مجبور ہو کر ایک لڑکا، ماں باپ کا احترام، ایک بھائی، بہن اور بھائی کے پیار، ایک شوہر، بیوی کے حقوق، اور ایک فرد، جماعت، گروہ اور ملک کی حدود کو تسلیم کرتا ہے ـــــ معاملات کی دنیا میں آکر ٹھوس معاشرتی بنیاد کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ کبھی بھی انسان عام فطری سماجی اور معاشرتی ضابطوں سے آزاد نہ رہ سکا۔

معاشرتی انقلاب لیکن تاریخ کے مطالعہ سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ معاشرت ہر زمانہ میں اپنا ظاہری رنگ بدلتی رہتی ہے، کھلی بات ہے کہ آج جو سماج برپا ہے چند صدی پیشتر اس کا وجود بھی نہ تھا اور جو سماج چند صدی پیشتر وجود میں آیا تھا، آج اس کے لئے انسانی جماعت اپنے اندر جگہ نکالنے کے لئے تیار نہیں ہے، گروہ بندی، خاندانی قیود، ملوکیت جمہوریت، نراج اور مذہبیت یہ تمام زاویہ ہائے فکر و نظر مختلف قسم کی معاشرت کے نتیجے ہیں۔

پھر معاشرت کے اندر دیکھئے تو تین مسئلے نہایت اہم ہیں، اور جو غور سے نگاہ ڈالئے تو یہی تین مسائل ہیں جن کے بکھرے ہوئے جذبات کو ایک مرکز پر اور ایک ضابطہ میں سمیٹ دینے کا نام سماج ہے معاشرت ہے۔

پہلا مسئلہ ـــــ فرد اور جماعت کا ہے کہ معاشرت کے اندر فرد کی حیثیت کیا ہونی چاہیئے؟ اور جماعتی نظام کس قسم کا ہو؟

دوسرا مسئلہ عورت اور مرد کا ہے کہ سماج عورت کے لئے کیا جگہ متعین کرتا ہے؟ اور مرد کو کہاں تک اختیار دیتا ہے؟

تیسرا مسئلہ ـــــ زمین اور سکہ کا ہے کہ انسان کا قبضہ ان کے اوپر کس صورت میں ہو؟ اور کہاں تک وہ اپنی جائداد اور مالیت کو بڑھا یا سمیٹ سکتا ہے؟ ان تینوں مسائل کی پھیلی ہوئی تاریخ بتاتی ہے کہ کبھی ان میں سے کسی ایک کی صحیح حیثیت متعین نہ ہو سکی۔ کبھی فرد اس قدر آزاد تسلیم کیا گیا کہ جماعتی نظام کی زندگی خطرہ میں پڑ گئی اور کبھی جماعتی نظام اتنا سخت پایا گیا کہ فرد موت کے قریب جا پہونچا۔ بارہا عورت، مرد کی ساتھی اور ہمدوش ہی نہیں بلکہ اس کے خیالات کا، فکر کا اور عمل کا محور بن گئی اور بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ اسے گناہ کا پیکر قرار دے کر مردوں نے پیروں سے روند دیا ہے۔ زمین اور روپیہ کبھی تو سمٹ کر ایک طاقتور

کبھی یہی جاپڑے اور پوری دنیا ایک دردناک عذاب میں مبتلا ہوگئی اور کبھی ان کو اس قدر عام کر دیا گیا کہ ان کا کوئی محافظ ہی نہ تھا اور عورتیں زمین اور سرمایہ ایک وسیع چراگاہ کی صورت میں رہے کہ جب جس کے جی نے چاہا آکر دو چار گھنٹے متمتع ہو کر روانہ ہو گیا یہ تمام مختلف صورتیں بار بار پیش آتی رہتی ہیں۔ اور مختلف سماجی انداز اس کی کھلے طور پر نشان دہی کر رہے ہیں کہ معاشرت میں پیہم انقلاب۔ خواہ وہ ٹھیک سمت میں ہوں یا غلط سمت میں۔ آتے رہتے ہیں، اور نہ جانے کب تک آتے رہیں گے، میں سمجھتا ہوں کہ اس مختصر تقریر کے بعد سماجی انقلاب کے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔

رہ گئی یہ بات کہ یہ انقلاب پیدا کہاں سے ہوتا ہے؟ اور اس انقلاب کی بنیاد کیا ہے؟ اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہ اس انقلاب سے پیدا شدہ معاشرتی اقدار اور ٹھوس سماجی بنیادیں متاثر ہوتی ہیں یا نہیں؟ تو ان کا جواب ہم آئندہ کی سطروں میں دیں گے۔

چار راستے

اس انقلاب کی بنیاد کیا ہے؟ اس کی تعیین میں فکر انسانی نے آج تک چار راستوں کو اختیار کیا ہے۔ میں نے چار ہی تک اس لئے محدود کر دیا کہ بقیہ افکار و خیالات یا تو ابھی سامنے آئے ہی نہیں ہیں اور اگر آئے ہیں تو تھوڑی دور چل کر انھیں چاروں میں سے کسی نہ کسی کا ساتھ دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں،

پہلا گروہ اور اس کی توجیہ

پہلا گروہ اس انقلاب کی بنیادی وجہ یہ قرار دیتا ہے کہ انسان کو ضروریات زندگی کا پھیلاؤ اور سمٹاؤ انقلاب پر آمادہ کرتا رہتا ہے، جس شئے کی ضرورت وسعت اور گہرائی نے زیادہ اثر ڈالا انسان نے اسی کو سامنے رکھ کر معاشرت کو مرتب کر ڈالا اس لئے کوئی مخصوص بنیاد سماج کے لئے متعین نہیں کی جاسکتی چونکہ ہر فرد کو اس کا فطری اختیار ہوتا ہے کہ وہ جس قسم کی زندگی چاہے بسر کرے اس لئے جماعت کے قوانین اور ضوابط اسی حد تک قابل قبول ہیں جہاں تک وہ کسی فرد کی خواہشات اور رجحانات سے ٹکر نہیں لیتے، لیکن جس جماعتی نظام کے اندر فرد کے حقوق کی پامالی ہوتی ہو تو فرد کو اس کا جائز حق پہونچتا ہے کہ وہ جماعتی نظام کو برباد کر دے، تاکہ انسانی برادری کا ہر ایک فرد پوری آزادی کے ساتھ اپنی خواہشات کی تسکین کا سامان فراہم کر سکے، یعنی فرد کی ہر خواہش اور ہر رجحان کا پورا پورا لحاظ کیا جائے اور ان تمام حدود کی تعیین ــــ جن سے جماعتی زندگی عبارت ہے ــــ فرد کے مزاج کے مطابق ہو، یعنی فرد کے بے لگام رجحانات پر اوس ڈالنا اور کسی قسم کی قید لگانا انسانیت اور آزادی فکر و ضمیر کو برباد کر دینا ہے یہ ہے اس گروہ کا محبوب دعویٰ! اس کی دلیل جو یہ گروہ پیش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ انسانی معاشرت کا قافلہ اب اس منزل تک پہونچ چکا ہے کہ جہاں نہ تو اسے خاندانی ضوابط کی ضرورت ہے اور نہ گروہی اور قبائلی نظام کی، اب کسی شخصی دباؤ کی بھی حاجت نہیں اور علیٰ ہذا القیاس کسی مذہب کی بھی ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ یہ تمام قیدیں اسی وقت تک مناسب تھیں جب تک کہ انسانی فکر بچوں کی طرح نفع اور نقصان کو پہچان نہ سکتا تھا اور اس وقت جب کہ انسان کا فکر بیدار اور اس

کی عقل بالغ ہو چکی ہے تو ہر فرد کو اس کا حق ہے کہ وہ اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اور اپنے فکر و نظر کے سامنے جو ضابطہ حیات چاہے اختیار کرے، اسی لئے ہر فرد کو پوری آزادی ملنی چاہیئے کہ وہ جماعتی قوانین کا اسی حد تک پابند ہے جہاں تک کہ اس کے ذاتی وقار کو کوئی ٹھیس نہیں لگتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان فطرتاً حریت پسند ہے، اس کی طبع آزاد کو کسی سماجی اور معاشرتی زنجیر میں مقید کرنا خود فطرت کے خلاف بغاوت ہے، شخصی اقتدار ایک بوجھل زنجیر ثابت ہو چکا ہے جو تمام افراد انسانی کو ان کی خواہشات کی تکمیل سے جبراً روک دیتا ہے، مذہب کی کسی زمانہ میں ضرورت تھی لیکن اس زمانہ حریت پسندی میں وہ بھی ناکارہ ثابت ہوا ہے اس لئے اس کو سامنے آنا انسانی رجحانات کے ساتھ خطرناک مذاق ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب بھی اس فطری ابھار کو دبانے کی کوشش کی جانے لگی ایک مہلک ترین توڑ پھوڑ شروع ہو گئی۔

یہی فطری ابھار تھا جس نے انسان کو ہر دور میں مجبور رکھا کہ وہ ایک کو قبول کرے دوسرے سے اجتناب کرے اور آج جب انسان کو صدیوں اور قرنوں کی تلاش اور جستجو کے بعد اس کی مبہوت فطرت منزل مل چکی ہے تو اس کو منزل کے مل جانے کے بعد منزل سے جدا کرنا انسانیت کے ساتھ شرمناک ناانصافی نہیں تو اور کیا ہے؟

گویا انقلاب کی بنیادی وجہ اس گروہ کے نزدیک یہ ہے کہ انسان کی فطری حریت پسندی نے انسان کو ہر زمانہ میں مجبور رکھا کہ وہ معاشرت کے اندر الٹ پھیر کرتا رہے اور جس قسم کی معاشرت کے اندر اپنی خواہشات کی تکمیل کا زیادہ سامان فراہم کر پائے اسے اختیار کر لے اور جس سماج میں اس کی بھوک رفع نہ ہوتی ہو اس سے قطع تعلق کر لے اور اس کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے اس طرح اس انقلاب کے پیچھے اس خواہشاتی بے چینی کا ہاتھ ہے جس سے ہر انسان مجبور رہے اور اس کے اشارہ پر سرگرم کار ہوتا ہے،

دوسرا گروہ اور اس کی تقریر

دوسرا گروہ جس خیال کی نمائندگی کرتا ہے وہ یہ ہے کہ سماج یا معاشرت کا انقلاب دراصل کسی نئی مشینی پیداوار کا آئینہ دار ہے، کیوں کہ جب تک معاشی وسائل محدود تھے اور انسان پورے طور پر فطرت کی پوشیدہ طاقتوں کو کام میں نہ لا سکا تھا اس وقت تک وہ مجبور تھا کہ ایک دوسرے کا تعاون حاصل کرے، مثلاً ایک کاشتکار صرف غلہ پیدا کر سکتا تھا اور غلہ کے علاوہ دوسری ضروریات زندگی کیلئے اسی طرح دوسروں کا محتاج تھا جس طرح دوسرے افراد غلہ کے لئے اس کے محتاج تھے۔ اسی احتیاج نے ہر فرد کو اس پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ دوسرے کی مدد اور توجہ حاصل کرے اور زیادہ سے زیادہ اس کا ثبوت فراہم کرے کہ وہ سماج، جماعت اور گروہ کے اندر اجنبی نہیں ہے اور افراد معاشرت کے ساتھ کوئی ایسا سلوک اور برتاؤ نہ کرے جس کی وجہ سے اس پر کسی قسم کی سماجی غداری کا شبہ کیا جائے اور اس کی زندگی کی دوسری ضروریات کی تکمیل کا دروازہ اس کے اوپر بند ہو جائے۔

لیکن رفتہ رفتہ انسان نے دوسرے پیداواری وسائل کو دریافت کر لیا، اس لئے پھیلا ہوا کام سمٹ کر چند مشینوں

میں آگیا اور بکھرا ہوا سرمایہ بھی سمٹ کر ایک مخصوص دائرہ میں محدود ہوگیا، یہ وہ وقت تھا کہ جب انسان نے اپنے لیے ملوکیت اور شہنشاہیت کو پسند کیا اس لئے تمام وسائل معاش اور اسباب زندگی انھیں مضبوط اور بے پلک ہتھیوں میں ہوتے تھے، بالفرض اگر کوئی کام بادشاہ کی مرضی کے خلاف کیا جاتا تھا تو اسباب وسائل کی نایابی چند ہی قدم چلنے کے بعد کمر توڑ دیتی تھی اور گھوم پھر کر اسی ایک بادشاہ کی غلامی کا جوا کندھوں پر رکھنا پڑتا تھا۔

ہوتے ہوتے بات یہاں تک پہونچی کہ انسان نے بھاپ کی طاقت کو دریافت کر لیا، اس تحقیق کا عالم گیر اثر پڑا، کشتیوں کی جگہ پر دخانی جہاز سمندروں کا سینہ چیرنے لگے، چھکڑوں اور بیل گاڑیوں کی جگہ موٹروں اور انجنوں نے لی صنعتوں اور دستکاریوں پر ملوں اور کارخانوں نے قبضہ جمالیا کام میں تیزی اور سرعت آگئی، جو چیزیں کئی دنوں میں بازار میں پہونچتی تھیں ان کے لئے محض چند گھنٹے کافی تھے ذرائع آمد و رفت اور وسائل حمل و نقل پر بھی اس کا اثر بہت گہرا پڑا اور سالوں اور مہینوں کے سفر ہفتوں اور دنوں میں طے ہونے لگے چیزیں جلد جلد ادھر ادھر آنے جانے لگیں جس کا نتیجہ یہ ہوا دستی صنعت پیشہ طبقہ کارخانہ داروں اور مل مالکوں کا دست نگر ہوگیا، اور وہ مجبور ہوگئے کہ کارخانہ داروں اور مل مالکوں کی من مانی شرح تنخواہ پر اپنے بازو کی قوت اور اپنے دماغ کا فکر بیچ دیں اس لئے کہ ملوں اور کارخانوں کے سامنے کسی دست کاری کا فروغ پانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن اور محال تھا ملاحوں نے اپنے کو جہاز کمپنیوں کے ہاتھوں فروخت کر ڈالا صناعوں اور کاریگروں نے مجبور ہوکر کم سے کم اُجرت پر اپنے ہنر کو بیچ ڈالا۔ انجام کار یہ نکلا کہ سرمایہ کاروباری طبقہ کے ہاتھ میں چلا گیا اور باقی دنیا ان کی دست نگر ہوکر ان کے سامنے مجبور اور بے بس ہوگئی،

چند دنوں تک ضبط نے کام دیا لیکن آخر کار وہ بھی چیخ اٹھا اور مزدور طبقہ نے جھنجھلائے ہوئے فکر کے ذریعہ اور کھیتوں میں کام کرنے والے طبقے نے پھاوڑے سے اخلاقی اقدار کی بنیادوں کو کھودنا شروع کر دیا اور ہر اس جائز و ناجائز طریقہ کو اختیار کرنا شروع کر دیا جس سے کہ ان کے پیٹ کو روٹی اور تن کو کپڑا ملتا تھا، سرمایہ داروں نے سماجی قوانین کی آڑ لیکر مذہب کے نام کو بیچ بیں لا چھوڑا جس کی وجہ سے مذہب سے عام بیزاری پھیل گئی کیونکہ سرمایہ داروں کی کوئی چیز بھی مزدور طبقہ میں محبوب نہیں ہوسکتی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے چند سالوں میں مذہب اور اخلاق کی ٹھوس بنیاد لرز لرز کر زمیں بوس ہوگئی۔

اس گروہ کے خیال میں ہرنئی مشینی پیداوار اور ہر جدید معاشی مسئلہ معاشرت کے انقلاب کا سبب بنتا رہا ہے، اسی موثر طاقت سے مجبور ہوکر کبھی خاندان، گروہ اور جماعت کے اصول پر سماج برپا ہوا ہے کبھی ملوکیت کے مذہبیت کی بنیاد پر معاشرت کی عمارت سجائی گئی ہے اور کبھی مزدوری اور سرمایہ داری کی وجہ سے اس کے اندر انقلاب آیا ہے، غرض ہر صورت میں انقلاب کی باگ ڈور مشینی پیداوار معاشی مسئلہ یا خارجی موثرات کے ہاتھوں میں رہی ہے۔

(باقی)

سیلِ فنا

ابو محمد فوزی عمری

ایک رنگینِ عشرتِ فانی جاودانی بھی ہے یہاں آنی
نقش پائندہ تر ہے یا نقاش محوِ حیرت ہے دیدۂ مانی
ایک سیلِ فنائے امکانی
اک غبارِ رہِ پریشانی

غنچۂ آرزو، گلِ مقصود ایک باقی تو دوسرا فانی
ہر بناوٹ میں اک بگاڑ ہے یاں ہائے دنیا کی تنگ دامانی
ایک فریبِ نظر سراسر ہے گلشنِ عیش کی فراوانی
چشمِ دل وا ہوئی تو دیکھے گا تھی یہ سب خواب کی پریشانی
ایک سیلِ فنائے امکانی
اک غبارِ رہِ پریشانی

یہ محبت کے رس بھرے نغمے جو ہیں قصرِ دوام کے بانی
دل کی گہرائیوں سے اٹھتی ہوئی کیف کی موجہائے طوفانی
کیفِ لذت و مستیٔ عشرت اور یہ جلوہ ہائے رومانی
اک خمارِ گریز پا کا عکس جام و مینا کی فتنہ سامانی
ایک سیلِ فنائے امکانی
اک غبارِ رہِ پریشانی

جامِ جم ہو کہ چشمۂ حیواں تاجِ کَے، خاتمِ سلیمانی
کوئی عکسِ فنا ہے کوئی نقش چشمِ عبرت کی دیدہ سامانی
شبِ عشرت کے یہ سنہرے خواب مہ کامل کی سیم افشانی
بادۂ عشق کے چھلکتے ہوئے جامِ زریں کی نور افشانی
ایک سیلِ فنائے امکانی
اک غبارِ رہِ پریشانی

سازِ عیش و طرب کے نغموں پر حورِ عصمت کا رقصِ عریانی
کیف و مستی کے جامِ زریں میں "دخترِ رز" کا طوافِ نورانی
نازِ ہٹلر ہو یا مسولینی حسنِ پیرس کہ تاجِ جاپانی
ہے ہر اک کی صدائے حال یہی ہم تھے فانی تو تم بھی ہو فانی
ایک سیلِ فنائے امکانی
اک غبارِ رہِ پریشانی

حسنِ رقصاں کی برق پاش ادا مہرِ الفت کی جلوہ تابانی
صبحِ فرحت کا چہرۂ خنداں شبِ غم کی سیاہ دامانی
ایک سیلِ فنائے امکانی
اک غبارِ رہِ پریشانی

"دعوتِ حق" کی ناتوانی پر خندہ ہائے غرورِ شیطانی
کفر و الحاد کے معابد میں سجدہ خواہش و ہوس رانی
حق کے کھنڈروں کی شہراہوں میں گرمیٔ محفلِ جہاں بانی
اور اسلام کی نقابوں میں جاہلیت کا رقصِ عریانی
ایک سیلِ فنائے امکانی!
اک غبارِ رہِ پریشانی!

"کیا لکھوں"

عروج قادری

گھڑی نے رات کے نو بجائے ہیں، ایک گھنٹہ، بس یہی ایک گھنٹہ وقت ہے لکھنے کا۔ قلم ہاتھ میں ہے اور سوچ رہا ہوں کیا لکھوں۔ ایک دو۔ تین۔ پانچ منٹ گزر گئے۔ گھڑی نے کہا کیا سوچ رہے ہو، میں تمہارے سامنے موجود ہوں کیا میں اس لائق نہیں کہ مجھی پر کچھ لکھو؟ میں ہنس پڑا۔ تجھ پر کیا لکھوں۔ انسان کی الجھی ہوئی زندگی اور اس کے بے شمار معمے کیا سب حل ہو گئے کہ تجھ پر وقت ضائع کردوں؟ گھڑی نے کہا۔ تم انسانوں کا عجیب حال ہے۔ معموں کا حل تمہارے ارد گرد پھیلی ہوئی چیزوں میں موجود ہوتا ہے، تمہاری نگاہوں کے سامنے چمک رہا ہوتا ہے اور تم نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتے پھرتے ہو۔ "لڑکا بغل میں اور ڈھنڈورا شہر میں" تمہاری ہی سوجھ بوجھ اور عقل کا تو نقارہ بجا رہا ہے۔ آخر تمہاری زندگی کیوں الجھ کر رہ گئی ہے اس کی کل کیوں بگڑ گئی ہے۔ میں ہر وقت تمہارے پاس ہوں، مجھے دیکھ دیکھ کر ہی تم اپنے کام انجام دیتے ہو لیکن تمہیں اپنی فضول فلسفہ آرائی سے فرصت کیا ہے کہ مجھ پر غور کرو۔ اسوقت میں نے خیر خواہانہ تم سے درخواست بھی کی تو مضحکہ بن گئی۔ سوچو، رات بھر سوچو۔ میرا جو کام ہے کئے جا رہی ہوں۔

میں نے اس پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ اس قدر جلد تم خفا ہو گئیں۔ تم جب کبھی روٹھ جاتی ہو تو مجھے بڑی پریشانی ہو جاتی ہے اگر روٹھ کر تم تیز بھاگنے لگو جب بھی پریشانی اور اگر اٹھلا اٹھلا کر چلنے لگو جب بھی پریشانی۔ اور جو کہیں خدانخواستہ اٹوانی کھٹوانی لے کر سو جاؤ تو پھر میری مصیبت کا ٹھکانہ ہی نہیں رہتا۔ تمہارے مخصوص ڈاکٹروں کے پاس دوڑتے دوڑتے پاؤں تھک جاتے ہیں۔ ابھی ایک ہفتے کی بات ہے تم بگڑ گئیں۔ غصے میں تمہاری ایک چول بالکل گھس گئی۔ تمام پٹنے میں ڈھونڈ مارا وہ چول کہیں نہ ملی اور نہ پٹنہ کے ڈاکٹر اس گھسی ہوئی چول کو درست کر سکے۔ آخر الہ آباد جا کر تم درست ہوئیں جس کمپنی نے تم کو بنایا ہے جب اسی کے بنائے ہوئے پرزے ٹھیک اسی ناپ و قامت کے اسی نمبر کے ملیں تب تو خیر ورنہ کوئی دوسرا پرزہ تم میں فٹ ہی نہیں ہوتا اسلئے مجھ پر کرم کرو میں تمہاری خفگی سے بہت ڈرتا ہوں، ابھی میں نے اپنی بات ختم بھی کی تھی اور گھڑی جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ بجلی کا قمقمہ بول اٹھا، چھوڑئیے اس کو میں چاہتا ہوں کہ آج آپ مجھ پر کچھ لکھیں۔ میں گھبرا اٹھا یک نشد دو شد، آج تم سب نے شاید یہ سازش کر لی ہے کہ مجھے کچھ نہ لکھنے دو۔ تم بجلی کا ایک قمقمہ ہو جو روشن ہو کر تاریکی دور کرتا ہے بس اور کیا بات ہے کہ تمہیں موضوع تحریر بنا لوں۔ قمقمے نے چمک کر جواب دیا اور آپ ایک آدمی ہیں جو کھاتے پیتے ہیں، سوتے جاگتے ہیں اور مر جاتے ہیں اس طرح تو آپ بھی موضوع تحریر نہ بن سکینگے یہ جواب سن کر میں خفیف ہو گیا۔ میں نے خفت مٹاتے ہوئے کہا، ننھے میاں میں تو تم سے بھی لڑائی مول نہیں لے سکتا۔ کہیں تم غصے میں فیوز کر گئے تو چلو سارا کاروبار ہی ختم۔

اچھا یہ تو بتاؤ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بجلی کے قمقمے آپ سے آپ جل اٹھتے ہیں آپ سے آپ بجھ جاتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ ایک ان دیکھی طاقت کے ہاتھ میں بجلی کا پمپ ہے وہ کبھی اس کی رو چھوڑ دیتا ہے اور کبھی روک لیتا ہے۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟ قمقمہ ہنسا۔ روشنی کچھ اور تیز ہو گئی۔ یہ بات

دیہاتی گنوار کہتے ہوں گے جنہوں نے بجلی کا کارخانہ، اس کی کلیں، اس کے تار اور اس کے ماہر انجینیر کبھی نہ دیکھے ہوں گے کوئی معقول آدمی ایسی ایسی
بات کیسے منہ سے نکال سکتا ہے۔ کیا آپ کی سمجھ میں بھی یہ بات نہیں آتی آپ تو دنیا بھر کی فلسفہ دانی کے مدعی ہیں۔ میں پھر خفیف ہو گیا۔ ابھی میں کچھ
کہنا ہی چاہتا تھا کہ میرے ایک ادیب دوست، اس وقت بے موقع آدھمکے۔ اخاہ! کیا لکھا جا رہا ہے بھائی؟ "کیا لکھوں یہی تو سوچ رہا ہوں" ارے
محبوب! یہ تمہاری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا لکھو۔ کیا تمہاری جوانی مر چکی ہے۔ کیا تمہاری رگوں میں خون نہیں دوڑ رہا کیا تمہارا دل جذبات و
احساسات سے خالی ہو چکا۔ میاں جب تک جوان ہو تمہیں موضوع کی تلاش میں کیا زحمت ہے۔ حسن اور جوانی رقص اور سرود۔ عشق اور
محبت، بس یہی تمہارے موضوع ہیں۔ واللہ ان میں کا ہر لفظ اپنے اندر ایک دنیا چھپائے ہوئے ہے اور تم بیٹھے اونگھ رہے ہو۔
میں ابھی تھوڑی دیر میں کئی صفحوں کا ایک افسانہ "اختلاط" لکھ کر چلا آرہا ہوں — میں نے کہا اور آپ نے اس میں لکھا کیا ہوگا؟
مرد کی رغبت عورت کی طرف۔ عورت کا کھچاؤ مرد کی طرف اور دونوں کی ہم آغوشی۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر آپ نے کبوتروں
سارسوں، مرغوں اور مرغیوں کے اختلاط کی تصویر کھینچی ہوگی، آپ کے افسانے کو پڑھنے کے بعد ہر شخص یہی محسوس کرے گا کہ عورت اور
مرد کی زندگی کا مقصد ہم آغوشی اور اختلاط کے سوا کچھ نہیں کیا۔ آپ کے نزدیک ادب کا معیار گھٹتے گھٹتے اب اس درجے پر آپہنچا ہے۔
دوست نے جواب دیا کیا کیا جائے مارکٹ میں مانگ اسی کی ہے، اسی سے شہرت بھی ملتی ہے اور پیسے بھی۔ "مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے سچی بات
کہی [illegible]ے ادیبوں کی طرح تم نے اپنے کام کو "آرٹ"، فن اور حقیقت نگاری کے پردے میں چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن دوست
میرے دوست، سوچو تو سہی کہ اس طرح تو ادیب کی حیثیت بیسواؤں کی اس بوڑھی دلالہ سے زیادہ نہیں رہتی جو بازار میں اپنا مال سجا کر
ہر نوجوان کو دعوت ہم آغوشی دیتی ہے حالانکہ ادیب کا قلم ہر زمانے میں قوموں کی زندگی سنوارنے اور بگاڑنے کا اہم ذریعہ تسلیم کیا گیا
ہے اور حقیقت میں ہے بھی ایسا ہی۔ اب جو ادیب انسان کے جنسی میلان یا جنسی بھوک کو اپنے قلم سے کرید کرید کر اس کو مرغوں اور مرغیوں
کی سطح پر لا رہے ہیں، تمہیں غور کرو کہ وہ انسانیت کی تعمیر کر رہے ہیں یا تخریب؟ ابھی گفتگو یہیں تک پہنچی تھی کہ ہمارے ایک تیسرے
دوست نمودار ہوئے اور دور ہی سے انھوں نے للکارا۔ "کیا سازش ہو رہی ہے یہاں بیٹھ کے" میرے پہلے دوست نے کہا سازش
کیا ہوگی یہ حضرت آج ادیبوں کے خلاف بھرے بیٹھے ہیں، ان کے نزدیک مرد اور عورت کے جنسی میلان اور ان کے اختلاط کا ذکر انسانیت
کی تخریب کے مترادف ہے۔ بھئی بات یہ ہے کہ جس ادب میں حسن اور جوانی کا چٹخارا نہ ہو وہ ادب ہی کیا، اسے کڑوی کسیلی دوا کیوں
نہ کہا جائے۔ میرے دوست نے جواب دیتے ہوئے کہا ان کا خیال ٹھیک ہے اور تم غلطی پر ہو اس وقت دنیا معاشی بحران میں مبتلا
ہے غریبوں کو پیٹ بھر روٹی نہیں ملتی ہزاروں اور لاکھوں فاقے پر فاقے کر رہے ہیں اس حال میں جنسی میلان کی داستان سرائی
[illegible] اور غیر فطری ادب ہے اس وقت ضرورت ہے ایسے ادب کی جو سرمایہ داری کی جڑ پر تیشہ چلائے جو اس نظام کو جڑ سے
اکھیڑ پھینکے۔ میں نے اپنے دوسرے دوست سے پوچھا اور جب پیٹ میں روٹی پہنچ جائے؟ میرے پہلے دوست نے جوڑ لگایا تب پھر
جنسی میلان کو ابھارنے میں کوئی حرج نہیں اس وقت وہ فطری ادب ہوگا میرے دوسرے دوست نے ہنستے ہوئے کہا [illegible]

کہ سب سے بڑی ضرورت روٹی ہے جب تک اس کا سامان نہ کر لیا جائے سب چیزیں بے معنی ہیں۔ میں نے کہا میرے دوست روٹی کی ضرورت سے کسی انسان کو انکار ہوگا اس کی اہمیت سے تو شاید فرشتے ہی بے خبر ہوں گے لیکن اگر تم نے انسان کی تمام توجہ صرف روٹی کے حصول کی طرف پھیر دی اور اُسے اس کی زندگی کا مقصد بتایا تو وہ صرف جانور ہو کر رہ جائے گا وہ روٹی کے حصول میں بھی انسانیت کی تمام حدوں کو پھاند جائے گا اور اس کے بعد اپنی نفسیاتی خواہش کو پورا کرنے میں بھی کسی اخلاقی پابندی کو گوارا نہ کرے گا انسانی زندگی ایک کُل ہے جس کے بہت سے اجزا ہیں اصل دھوکا یہ ہو رہا ہے کہ آپ لوگ اس کُل کے بعض جزو کو پوری زندگی سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ جب تک تمام اجزا پر نظر نہ رکھی جائے زندگی کی کل ٹھیک نہیں ہو سکتی۔ ادب کا مقصد ہے انسانیت کی فلاح اور انسانیت نہ صرف بھوک ہے اور نہ صرف جنسی خواہش کی تسکین بلکہ اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ یہ گھڑی آپ کے سامنے رکھی ہے اگر کوئی شخص گھڑی میں کوک بھرنے والے پرزے کو پوری گھڑی سمجھ لے تو یہ صحیح ہوگا؟ اور اگر کوئی شخص گھڑی کے تمام پرزوں کو ٹھیک ٹھیک فٹ کئے بغیر اس میں صرف کوک بھر دے تو گھڑی اپنا کام کر سکے گی؟ آپ کے سامنے یہ بجلی کا قمقمہ جل رہا ہے اگر کوئی شخص صرف اسی قمقمے کو سب کچھ سمجھ لے اس کے تار، سوئچ اور پاور ہاوس کو درست رکھے بغیر صرف اسی کو صاف ستھرا رکھے صبح، شام اس کی گرد جھاڑے تو اس کو روشن رکھنے میں وہ کامیاب ہوگا؟ بالکل یہی حال انسانی زندگی کا ہے۔ میری یہ بات سن کر گھڑی کھل کھلا کر ہنس پڑی اور قمقمہ بھی مسکرا دیا لیکن میرے سوا کسی نے محسوس نہ کیا میرے دوست چلے گئے اور میں پھر سوچ میں پڑ گیا "کیا لکھوں"۔

"جہانِ تصور"

انور اعظمی

جمال یار کی اللہ رے یہ جلوہ زنی
نگاہ چیخ اٹھی باوجود کم سخنی

کہیں ہلاک نہ ہو جائے قافلہ دل کا
ہے راہ شوق پہ عقل و خرد کی راہزنی

گذر گیا تو گذرنے دے کاروانِ بہار
ابھی ہے دامن دل میں بہار صد چمنی

نگاہ یاس کو ہے انتظار حسن امید
رم آشنا ہے ابھی تک یہ آہوئے ختنی

فریب خوردۂ تسکین ہے دل بیتاب
بڑھا دے اے مژۂ یار اور نیش زنی

خفا ہیں اس سے صنم ہائے دانش و تمکیں
جنوں سے آ نہ سکا تھا نبار برہمنی

فروغ ماہ بہار ریاض خلد بریں
نثار پائے شہنشاہِ مکی و مدنی

غبار کوئے تو ام اے جمال شوق افروز
مرا بلند کنی یا ذلیل و پست کنی

بھلا سکا نہ کہیں بھی تمہیں دل انور
سکوت غم کدہ ہو کہ خروش انجمنی

"خوشگوار تصفیہ" —— محمود فاروقی

"لیکن کامریڈ ... دبلے پتلے زرد رو نوجوان نے بالآخر کہا
"لیکن کیا ہے" دوسرا شخص جو لانبا گرم کوٹ پہنے ہوئے تھا
اپنے ہاتھ کو تندی سے جھٹک کر کہنے لگا "تم کر جاتا ہی ہو گا سب
چیزیں اچھی طرح سنبھال لو ٹھیک ۵ بج کر ۲۵ منٹ پر وہ
لوگ لوٹیں گے باٹلی والا اور اس کی بیوی ——"

"اس کی بیوی ——" پہلے شخص نے جھرجھری سی لی۔
"وہ .... وہ تو کامریڈ عورت ہے، ایک کمزور عورت ...
یہ ظلم ہے کھلی ہوئی درندگی آخر" "وہ عورت ہے —
اس نے اپنے کوٹ کے فیتہ کو درست کرتے ہوئے کہا۔ "یہ
بات تو میں بھی جانتا ہوں میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے نادان نہ
بنو تم کو نہیں معلوم.... اس نے جو کچھ میرے ساتھ کیا اُسے
تم جان کر کیا کرو گے —— اس نے ہاں اس نے مجھے ٹھکرا دیا
— وہ مجھ کو چھوڑ کر اس مردود باٹلی والے کے اونچے بنگلے
پر چلی گئی ایسا کیوں ہوا؟ میں سوچتا ہوں اس کے بتانے
سے تمہارے لئے کوئی فائدہ نہیں تمہارا فائدہ جیسا کہ میں
نے غور کیا اس چمڑے کی تھیلی میں ہے۔ پانچ ہزار روپیہ لوٹے
پانچ ہزار ---. ہاہاہا تم اس کے ذریعہ پورے بورژوا بن
سکتے ہو بیوقوف —— !

نوجوان نے چمڑے کی تھیلی کو اپنی جلتی ہوئی مٹھی میں بھینچ لیا "ٹھیک
کہتے ہو۔" خوف اور لالچ کے ملے جلے جذبات میں اس کی آواز
بھرا گئی "مجھے یہ جان کر کیا فائدہ! لیکن کامریڈ جیسا کہ تم ہر
اس شخص سے کہتے ہو جو پہلی مرتبہ ہم سے ملتا ہے کہ ہم ظلم مٹانے
کے لئے یہ سب کچھ کرنا چاہتے ہیں ... اس طرح تو کسی بے گناہ عورت
کو قتل کرنا ہمارے بنائے ہوئے اصولوں کے خلاف پڑتا ہے۔
پھر وہ تو ایک غریب گھرانے کی لڑکی ہے۔ وہ خود تو بورژوا نہیں
کامریڈ اس میں اس کا کیا دوش —— اور پھر خدا ....."

"خدا ..... !" پہلا شخص غرایا "وہی خدا تو آسمانوں میں
سو گیا ہے اس کو زمین کی کوئی خبر نہیں۔ خدا یہ سرمایہ دار ہیں
خدا ... تو ہم ہیں اتنے دنوں بعد بھی تمہارے سر میں کا
سودا بیٹھا ہوا ہے ایسا تو میرے دھیان میں نہیں تھا ——"
"—— میرے دوست" اس نے الفاظ کو چباتے ہوئے اور
دبلے پتلے نوجوان کے شانوں کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "یہ
محض ڈراوا ہے۔ ان کتوں کا ڈراوا جو ہمارا خون پینے کے
لئے بوکھلا رہے ہیں ..... بے وقوف نہ بنو۔ خدا اس چمڑے
کے چھوٹے سے پاکٹ میں بند ہے۔"

زرد رو نوجوان نے اپنی پتلی پتلی انگلیوں میں چمڑے کے
چھوٹے ہوئے پاکٹ کو بھینچ لیا اور اس کی نظریں دھندلی
چاندنی میں دور جم گئیں۔ "کیا ہے" گرم کوٹ والے نے
پلٹ کر دیکھا "کوئی نہیں ہے گھبراؤ نہیں اتنا وقت گئے اس
طرف کوئی نہیں آتا —— لیکن تم یہ سوچ کیا رہے ہو" اس
نے تسلی کے طور پر اس کے شانوں کو تھپتھپایا۔

"خدا ہی بہتر ہے ایسا تو یقین نہیں آتا کامریڈ وہ تو ہماری

ان سوچوں سے بھی واقف ہے جن کو ہم کہہ نہیں پاتے ..... یہ بات مجھے ــــ اوہ ......"

"ہاں یہ بات ۔ چپ کیوں ہوگئے، بولو نا" کامریڈ نے جھلاتے ہوئے کہا: "اس رنگساز کے بچے نے کہی ہے . . . . ذلیل کتا ! اس کو بھی ٹھکانے لگانا پڑیگا ــ نیل کے ٹھیکہ داروں کا ایجنٹ ــ بہروپیا فریبی ــــ "

"نہ نہ ایسا تو مت بولو" دبلے پتلے نوجوان نے انکار کے لئے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ "وہ کسی کا ایجنٹ نہیں۔ وہ خود اپنے خاص اصول رکھتا ہے وہ ان ٹھیکہ داروں کی مخالفت میں ہم سے کہیں آگے ہے یہ بات تو میں نے خود پرکھی ہے "

"تم کو نہیں معلوم"۔ لانبے کوٹ والے نے اس کی بات کاٹ دی "یہ خدا کا نام لے کر کس طرح سب کو اُلّو بناتے ہیں میں تو ان کی رگ رگ سے واقف ہوں "

"اور لوگ ایسے ہوں تو ہوں " دبلے نوجوان نے مخالفت کی "بخشی کے کٹہرے میں تو سارے مزدور اور غریب اس کی کوششوں سے آسودہ ہو رہے ہیں اور سب کارندے اچھی طرح جان گئے ہیں۔ دوسرے کٹہرے والوں کے مقابلہ میں ان کی حالت ہر لحاظ سے سدھرتی جا رہی ہے اسی وجہ سے ان کے مقابلہ میں اکثر جگہ لوگ ہماری بات کو دھیان میں نہیں لا رہے ہیں۔ نگینے والا چودھری تو اس لئے جلا جا رہا ہے کہ اسے اپنے کاروبار پر دسواں حصہ ہر سال کٹہرے کے بیت المال میں جمع کرانا پڑتا ہے کیونکہ اس کے بیٹوں نے صاف کہدیا ہے کہ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو اس کے کاروبار سے علیٰحدہ ہو جائیں گے ــــ"

کامریڈ نے حقارت سے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا "یہ رام کتھا تم رہنے دو میں کہتا ہوں ان سارے بکھیڑوں سے تم کو کوئی فائدہ نہیں تم کو تو وہی کرنا چاہیئے جس کے تم پابند کئے گئے ہو اور اگر ایسی ہی عقیدت ہے تو بخشی کے کٹہرے میں جا کر کیوں نہیں بس جاتے"

"عقیدت" زرد رو نوجوان نے سرسراتے لہجہ میں اداسی کے ساتھ کہا "تم کو میرے متعلق وہ سب کچھ معلوم ہے جس کے ذریعہ تم جب چاہو مجھے تباہ کر سکتے ہو دوسرے پیسے کی منحوس لت تو سبھوں نے ایسی لگادی ہے کہ کٹہرے والوں کی پاک زندگی میں اس کا پیوند ہی نہیں لگتا ــ"

" دیکھو بخشا بختی سے بات اُلجھ جاتی ہے پاک ناپاک کا کیا ذکر روپیہ ہی سب کچھ ہے وہ صابن کی طرح ہر ناپاک کو دھو دیتا ہے اور اس بارے میں میں نے تمہارے ساتھ کبھی کنجوسی سے کام نہیں لیا۔ لانبے کوٹ والے نے اپنے بوٹ سے زمین کو کریدتے ہوئے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ "رات ٹھنڈی ہو رہی ہے اور مجھے جلد واپس جانا ہے اس جھگڑے کو مختصر کرو اور یہ ہمیشہ یاد رکھو کہ تم کو میری مرضی کے مطابق ہی کام کرنا ہوگا باٹلی والا اور اس کی بیوی ــ" وہ جھک کر رازدارانہ لہجہ میں کہنے لگا . . . .

" دونوں کے لئے یہ ایک بم کافی ہے ٹھیک ۵ بجکر ۳۵ منٹ پر ان کی گاڑی کانسے کے پل پر پہنچ جائے گی بس ایک ہی سکنڈ میں ــــ اور پھر میرے دوست تم اپنے لئے ایک ہزار بوتل خرید کر عیش کر سکو گے دوسرے وہ فوٹو تم کو میں سب کی چوری واپس دیدوں گا جس کے مارے تمہارا خون خشک ہوا جاتا ہے۔

لیکن زرد رو نوجوان نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر تک ایک گہری خاموشی طاری رہی۔ اور اس خاموشی میں ا[illegible] مجبور و بے بس انسان کا دکھ[illegible] اس طرح

دھندلا سا گیا جیسے کسی نے پھول کی تازگی کھینچ لی ہو۔ اور اس کا رنگ روپ مرجھا کر اُڑ جائے۔

دوسرا شخص اپنے مخاطب کی اس کیفیت سے لاپروا اپنی پشت پر ہاتھ باندھے اور اپنے بوٹ سے سوکھی ہوئی ٹہنیوں کو ٹھوکر مارتے ہوئے ٹہلنے لگا ــــ پھر وہ گھوم کر آیا اور دبلے پتلے نوجوان کے سامنے سینہ پر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا ــــ بدنصیب انسان نے اس پر اس طرح نظر ڈالی جیسے قربانی کا جانور پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتا ہے ایک بے معنی تھرائی ہوئی نگاہ ــــ!

"مجھے منظور ہے ....." اس نے ایک ایسی آواز سے کہا جیسے کڑکتی دھوپ میں نرسلے کے بھنے چیخ اٹھتے ہیں ــــ لیکن کامریڈ "یہ ستارہ جو ابھی ابھی ٹوٹا ہے ــــ"

مقابل کے شخص نے آسمان کے کنارے نظر ڈالی نیلگوں فضا میں ٹوٹے ہوئے تارے سے ایک روشنی کی لکیر پھیل کر ڈوب گئی۔

"وہ دیکھ رہا ہے" زرد رو نوجوان بڑبڑایا۔ "میں نہیں بھول سکتا میں خدا کو ہرگز نہیں بھول سکتا وہ ضرور دیکھ رہا ہے کامریڈ تم مجھے مجبور نہ کرو .... یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا سوچو ــــ خدا کے لئے سوچو میرے مرنے کے بعد وہ بائبل والے کی بیوی اگر وہاں مجھ سے پوچھ بیٹھے کہ اس کو کس لئے قتل کیا گیا ــــ قتل ہاں کامریڈ قتل۔ نہیں نہیں یہ تو بہت بری بات ہے ــــ" جوش سے وہ تھرتھرا رہا تھا۔ الفاظ اس کے گلے میں پھنس کر رہ گئے اپنے آپ کو سنبھالنے کے لئے اس نے سینہ پر مضبوطی سے بازو لپیٹ لئے "یہ ٹوٹنے والے ستارے اُف میرے اللہ! یقین کرو میرے دل میں بہت سارے ستارے ٹوٹتے جا رہے ہیں۔

"بند کرو یہ بکواس"۔ ایک پھٹی ہوئی گرجدار آواز نے اس کو خاموش کر دیا "بزدل کتے نادان نہ بن کیا تو اُن دس آدمیوں میں سے نہیں ہے جنھوں نے غداری کرنے پر اپنی اپنی جان کو قتل کے لئے پیش کیا تھا ــــ غدار کمینے ایک حرف کہے بغیر تجھے جانا پڑے گا یہ میرا فیصلہ ہے اس کی تعمیل ــ ہاں اس کی تعمیل لازمی ہے ورنہ ..... ورنہ ــــ" کامریڈ نے اپنے کوٹ کی نچلی جیب سے چمکتا ہوا چھرا نکال لیا .... اور اگر تم راضی ہو جاؤ تو مزید تین ہزار کامریڈ نے نوٹوں کا ایک اور بنڈل نکال کر اس کے سامنے پھینک دیا ــــ اب شاید تم صحیح فیصلہ کر سکو!

سردیوں کی اداس اور ڈراونی چاندنی میں دو خوفزدہ آنکھیں چمک اٹھیں ــــ اس کی نظر ایک مرتبہ نوٹوں پر اور دوسری بار اس چمکتے ہوئے چھرے پر پڑی جو چاندنی میں جھلملا رہا تھا کچھ دیر خاموشی رہی پھر اچانک اس نوجوان کا ہاتھ نوٹوں کی طرف بڑھا .... کامریڈ کے بھیانک چہرے پر کچھ بہ مسکراہٹ سی پھیل گئی۔ لیکن ..... آگے بڑھتا ہوا ہاتھ ایک جھٹکے سے رک گیا۔ اور خوفزدہ آنکھیں پھیل سی گئیں اور ان کی ملگجی سفیدی میں ایک ٹوٹتے ہوئے تارے کا عکس تھرتھرا کر رہ گیا ــــ اس کا دبلا پتلا جسم یکبارگی لرز اٹھا ــــ ــــ لیکن دوسرے ہی لمحہ میں وہ فیصلہ کن انداز میں سیدھا کھڑا ہو گیا اس کا سوکھا سا دبا ہوا سینہ پھٹے ہوئے کوٹ میں سے

ابھر آیا اور اس کے دبلے پتلے اعضا فولادی عمہ کی طرح اپنی اپنی جگہ سخت اور سیدھے ہو گئے ؛ ایک سوچے ہوئے عزم کے ساتھ وہ اپنے مقابل کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ "مجھے قتل کر دو" سردیوں کے دھندلے سناٹے میں ایک گرجدار آواز گونجی۔

"خوشگوار تصفیہ" لانبے کوٹ کے کالروں میں سے ایک گھٹی ہوئی سی آواز نکلی ——— اور ساتھ ہی ایک چمکتا ہوا چھرا فضا میں بلند ہوا اور لمحہ بھر کے لئے ٹھٹھری ہوئی چاندنی میں اس بلند ہوتے ہوئے چھرے کی چمک اور ایک زرد رو چہرے کی مسکراہٹ جگمگا اٹھی۔

لیکن ——— ایک تیز گونجتی ہوئی پٹاخہ دار آواز خاموش فضا میں اچانک تیر گئی اور ———!

"اوہ میرے خدا۔ کامریڈ نے ایک دل دوز چیخ ماری اور دوسرے ہی لمحہ میں وہ اپنے سامنے کھڑے ہوئے نحیف جسم پر چھرے کی نوک کے بل گر پڑا۔

اس ہیبتناک سناٹے میں ایک سایہ دوڑتا ہوا اس مقام کی طرف آیا جہاں دو جسم زندگی اور موت کی آخری کشمکش میں پھڑپھڑا رہے تھے۔

"اف میرے خدا" نووارد بڑبڑایا "کس قدر غلط تھا : اوہ — میں صرف چھرے کو گرانا چاہتا تھا میرے خدا میری نیت سے واقف ہے"۔

چار پتھرائی ہوئی آنکھوں نے آنے والے پر ایک آخری ڈالی اور دو اکڑتی ہوئی زبانیں بڑبڑائیں۔

پہلی نے کہا ——— اُف تم ...... تم نیل زنجاز ...... تم نے گولی چلائی ... بہت کیا۔ میرے دوست ! مجھے خدا تو معاف کرے گا ——— !! دوسرے کے نرخرے میں چھرا پھنسا ہوا تھا ہونٹ بمشکل صرف اتنا کہہ سکا ——— "خوش۔گوار" تصفیہ۔

ایجنٹ حضرات توجہ فرمائیں

[illegible]

اکثر جگہ [illegible]

[illegible] والا چودھری تو اس [illegible]

دسواں حصہ ہر سال گرہ کے بیت المال [illegible]

کیونکہ اس کے بیٹوں نے صاف کہدیا ہے کہ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو اس کے کاروبار سے علٰحدہ ہو جائیں گے ———"

کامریڈ نے حقارت سے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا "یہ رام کھتا تو تم [illegible]

[illegible] دیر تک ایک [illegible]

مجبور و بے بس انسان کا [illegible]

...ائل حاضرہ — "محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائیگی"

...زم اور ہمارا ملک کمیونزم جن اغراض ومقاصد کے لئے اُٹھا تھا، وہ تو اسی روز مر گئے، جس دن روس میں بالشویک
...دا قتدار حاصل ہوا۔ اور اسٹالن جیسا خودسر انسان برسر اقتدار آیا۔ معاشی مساوات کے بجائے معاشی عدم مساوات، ریاستی ملکیت
...ے "انفرادی ملکیت" غیر طبقہ واریت کے دعوؤں کے باوجود بدترین قسم کی طبقہ داریت روس میں پھر سے رائج کرنے لگی۔ اور
...مارکس اور اُس کے حواریوں نے جو خواب دیکھے تھے وہ کسی طرح شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے۔ آج کمیونزم جس چیز کا نام ہے، وہ اسٹالن
...ر اقتدار ایک مخصوص جماعت ہے، جو کمیونزم کے اصلی اصولوں کو تو نہیں۔ البتہ اُن اصولوں کا نام لیکر اور وہی اصطلاحات
...ل کرکے ملک ملک کے انسانوں کو پریشان کر رہی ہے۔ اور سرمایہ دارانہ نظام کے رخنوں میں سے اپنے اقتدار کے لئے کوشاں
... لہذا کمیونسٹ انقلاب سے فرق جو کچھ ہونے والا ہے وہ صرف یہی ہے کہ ایک بُرا جائے اور دوسرا بُرا آجائے۔ جاگیر دار
... دار اور موجودہ عہدہ دار مٹ جائیں اور کچھ نئے لوگ حکومت کی کرسیوں اور فرماں روائی کے تختِ جلال پر متمکن ہوجائیں
...ہ گزشتہ جنگ عالمگیر کے بعد جو ہی اس مخصوص "کمیونزم" نے روس سے باہر قدم نکالا ہے۔ اور جیسے جیسے کامیاب ہوتی
ہے۔ اس پارٹی کے افراد کا ظلم وتعدی آشکارہ ہو رہا ہے۔ یوگوسلاویہ کے مزدوروں کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے بالکل
... نئی نئی مصیبتوں کے جو طوفان اُمڈ رہے ہیں، اور خود روس کے بعض علاقوں میں جو کھیل کھیلا گیا ہے اور بے
...ہ علاقوں کو جس حیوانیت اور بربریت کے ذریعہ آگ اور فولاد کا مینہ برسا کر کچلا گیا ہے۔ یہ سب واقعات
...کہ کمیونزم کس چیز کا نام رہ گیا ہے۔ اسی طرح چین میں جو کمیونزم ابھر رہا ہے وہ خود سامراجی
... کمیونزم ہے۔ اس کا طوفان ہندوستان کی دیواروں سے اپنا سر ٹکرا رہا ہے بات بالکل
...ے ہی واقف ہوجائے۔ یہ کوئی صحیح قسم کا انقلابی کمیونزم نہیں ہے
... اسی کی خرابی کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنی اصل حالت
...ے طبقات کے اظہار نفرت کا نتیجہ ہے۔ اور
...ہے جس سے ... سرمایہ داری پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے یہ نیا "ازم"
... برپا نہیں کرسکتا۔ بلکہ بہت ممکن ہے ہمارے دکھوں اور مصیبتوں میں اور
...سکتے کہ یہ تحریک ہندوستان میں کبھی کامیاب نہ ہوسکیگی۔ کیونکہ جس قسم کا نظام

ابھر آیا اور اس کے دبلے پتلے اعضا فولادی کھمبے کی طرح اپنی اپنی جگہ سخت اور سیدھے ہو گئے ؛ ایک سوچے ہوئے عزم کے ساتھ وہ اپنے مقابل کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ "مجھے قتل کر دو" سردیوں کے دھندلے سناٹے میں ایک گرجدار آواز گونجی۔

"خوشگوار تصفیہ" لانبے کوٹ کے کالروں میں سے ایک گھٹی ہوئی سی آواز نکلی ——— اور ساتھ ہی ایک چمکتا ہوا چھرا فضا میں بلند ہوا اور لمحہ بھر کے لئے ٹھٹھری ہوئی چاندنی میں اس بلند ہوتے ہوئے چھرے کی چمک اور ایک زرد رُو چہرے کی مسکراہٹ جگمگا اٹھی۔

لیکن ——— ایک تیز گونجتی ہوئی پٹاخہ دار آواز خاموش فضا میں اچانک تیر گئی اور ——— !

"اوہ میرے خدا۔ کامریڈ نے ایک دل دوز چیخ ماری اور دوسرے ہی لمحہ میں وہ اپنے سامنے کھڑے ہوئے پتھر جسم پر چھرے کی نوک کے بل گر پڑا۔

اس ہیبتناک سناٹے میں ایک سایہ دوڑتا ہوا اس مقام کی طرف آیا جہاں دو جسم زندگی اور موت کی آخری کشمکش میں پھڑپھڑا رہے تھے۔

"اف میرے خدا" نووارد بڑبڑایا "کس قدر غلط نشانہ۔ اوہ۔ میں صرف چھرے کو گرانا چاہتا تھا میرے خدا تو میری نیت سے واقف ہے"۔

چار پتھرائی ہوئی آنکھوں نے آنے والے پر ایک آخری نظر ڈالی اور دو اکڑتی ہوئی زبانیں بڑبڑائیں۔

پہلی نے کہا ——— اُف تم ...... تم نیل کے رنگساز ...... تم نے گولی چلائی ... بہت اچھا کیا۔ میرے دوست! مجھے خدا تو معاف کر دے۔ "گانا ——— !!

دوسرے کے نرخرے میں چھرا پھنسا ہوا تھا۔ وہ غرغراتے ہوئے بمشکل دو ہی لفظ کہہ سکا ——— "خوش۔گوار" تصفیہ ——— !!

ایجنٹ حضرات توجہ فرمائیں

:- ہم ایک عرصے سے انوار آپ کی خدمت میں بغیر کسی مطالبہ کے روانہ کر رہے ہیں۔ رقم کی ادائی، رقم کا حساب یہ سب امور زیادہ تر آپ ہی کے ذمہ ہیں۔ آپ حضرات جو کچھ تحریر فرماتے ہیں دفتر اُس کو قبول کر لیتا ہے اور یہ ذمہ داری آپ پر صرف اسلئے ڈالی گئی ہے کہ آپ کو "انوار" سے ہمدردی ہے لیکن اکثر دیکھا جارہا ہے کہ بعض اصحاب اس ذمہ داری سے بخوبی عہدہ برا ہونے کی تڑپ اپنے اندر نہیں پاتے بلکہ ان کو بار بار لکھنا پڑتا ہے۔ بار بار توجہ دلانی ہوتی ہے "وہ "انوار" کی مد میں ذرا زیادہ توجہ صرف کریں چنانچہ آج پھر اپنے ایجنٹوں سے درخواست کرتے ہیں کہ براہ کرم "انوار" کے لئے تھوڑا زیادہ وقت دیجئے۔ اس کی اشاعت اسکے حسابات کی ادائی اور اس کی ضروریات کی تکمیل میں جتنی محنت آپ کرینگے اتنا ہی یہ کام خود آپ کیلئے بھی اور ان مقاصد کیلئے بھی جن کیلئے انوار جاری ہے مفید ہوگا۔ ایسے نئے ایجنٹ صاحبان جن کی خدمت میں ہم نے پہلی بار پرچہ روانہ کیا ہے اُن سے بھی ہماری یہی گذارش ہے کہ وہ اس کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ کریں اس کی حتی الامکان مدد کریں کیونکہ اس طرح کرنے سے انوار کو مالی علمی دینی کئی طرح کے فائدے ہیں اور ان سب باتوں سے یقیناً آپ کا بھی دنیوی اور اخروی مفاد وابستہ ہے۔

آپکا مخلص
منیجر انوار

مسائلِ حاضرہ — "محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی"

کمیونزم اور ہمارا ملک کمیونزم جن اغراض و مقاصد کے لئے اُٹھا تھا، وہ تو اسی روز مر گئے، جس دن روس میں بالشویک پارٹی کو اقتدار حاصل ہوا۔ اور اسٹالن جیسا خود سر انسان برسر اقتدار آیا۔ معاشی مساوات کے بجائے معاشی عدم مساوات، ریاستی ملکیت کے بجائے "انفرادی ملکیت" غیر طبقہ واریت کے دعوؤں کے باوجود بدترین قسم کی طبقہ واریت روس میں پھر سے رائج کرنے لگی۔ اور کارل مارکس اور اُس کے حواریوں نے جو خواب دیکھے تھے وہ کسی طرح شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے۔ آج کمیونزم جس چیز کا نام ہے، وہ اسٹالن کے زیر اقتدار ایک مخصوص جماعت ہے، جو کمیونزم کے اصلی اصولوں کو تو نہیں۔ البتہ اُن اصولوں کا نام لیکر اور وہی اصطلاحات استعمال کرکے ملک ملک کے انسانوں کو پریشان کر رہی ہے۔ اور سرمایہ دارانہ نظام کے رخنوں میں سے اپنے اقتدار کے لئے کوشاں ہے۔ لہٰذا کمیونسٹ انقلاب سے فرق جو کچھ ہونے والا ہے وہ صرف یہی ہے کہ ایک بُرا جائے اور دوسرا برا آجائے۔ جاگیردار، سرمایہ دار اور موجودہ عہدہ دار مٹ جائیں اور کچھ نئے لوگ حکومت کی کرسیوں اور فرماں روائی کے تختِ جلال پر متمکن ہو جائیں چنانچہ گزشتہ جنگ عالمگیر کے بعد جو ہی اس "مخصوص کمیونزم" نے روس سے باہر قدم نکالا ہے۔ اور جیسے جیسے کامیاب ہوتی جا رہی ہے۔ اس پارٹی کے افراد کا ظلم و تعدی آشکارہ ہو رہا ہے۔ یوگوسلاویہ کے مزدوروں کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے بالٹک کے علاقوں میں نئی نئی مصیبتوں کے جو طوفان اُٹھ رہے ہیں، اور خود روس کے بعض علاقوں میں جو کھیل کھیلا گیا ہے اور بے اختیار مزدوروں کی بغاوتوں کو جس حیوانیت اور بربریت کے ذریعہ آگ اور فولاد کا مینہ برسا کر کچلا گیا ہے۔ یہ سب واقعات اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اب کمیونزم کس چیز کا نام رہ گیا ہے۔ اسی طرح چین میں جو کمیونزم ابھر رہا ہے وہ خود سامراجی اصولوں کا علمبردار ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ کمیونزم آ رہا ہے۔ اس کا طوفان ہندوستان کی دیواروں سے اپنا سر ٹکرا رہا ہے بات بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن یہ کیسا کمیونزم ہے ذرا اس کی حقیقت سے بھی واقف ہو جائیے۔ یہ کوئی صحیح قسم کا انقلابی کمیونزم نہیں ہے۔ (اگرچہ سچا انقلابی کمیونزم بھی بیماری کا اصلی علاج نہیں بلکہ خود بیماری ہے اور یہ اسی کی خرابی کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنی اصل حالت میں ایک دن کے لئے بھی کامیاب نہ ہو سکا) یہ کمیونزم ایک طبقہ کے خلاف دوسرے طبقات کے اظہار نفرت کا نتیجہ ہے۔ اور اس کی پیدائش کا سبب بھی وہی الحاد۔ اور مادیت ہے جس سے خود سرمایہ داری پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے یہ نیا "ازم" ہمارے ملک میں آ بھی جائے تو یہ ہرگز کوئی انقلاب برپا نہیں کر سکتا۔ بلکہ بہت ممکن ہے ہمارے دکھوں اور مصیبتوں میں اور اضافہ ہی ہو جائے۔ لیکن ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ تحریک ہندوستان میں کبھی کامیاب نہ ہو سکیگی۔ کیونکہ جس قسم کا نظام

زندگی اس وقت ہمارے ملک میں قائم ہے وہ اس کے لئے نہایت مفید ہے۔ البتہ اگر کوئی ایسی تحریک اُٹھے جو دہریت اور خدا سے
بغاوت کی موجودہ ذہنی بنیادوں کو گرا کر کامل خدا پرستی۔ اور ایک ہمہ گیر اخلاقی نظام کی علمبردار ہو تو پھر نہ صرف ہندوستان میں
بلکہ ہندوستان کے باہر بھی کمیونزم کو شکست فاش دی جاسکتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اُس کی بہن سرمایہ داری کا قلع قمع بھی
ہو سکتا ہے۔

حیدرآباد پولیس ایکشن کے بعد

پولیس ایکشن سے قبل حیدرآباد کا مسئلہ یہ تھا کہ یہاں کے مختلف گروہوں
میں دوستی اور محبت کا رشتہ کس طرح استوار ہو۔ ہندو اور مسلمان کس
طرح مل جل کر زندگی بسر کریں۔ پارسی عیسائی، اور سکھ کیونکر ایک دوسرے سے گلے ملیں۔ اسی طرح ہمارا مسئلہ یہ بھی تھا کہ ہماری
زندگی میں جو خرابیاں غلط قسم کے معاشی نظم۔ غلط قسم کی سیاست، اور غلط قسم کی معاشرت اور حکومت کی وجہ سے پیدا ہو گئی
تھیں وہ کسی طرح دور ہوں اور ہم سکھ اور چین کی بنسی بجائیں۔ پھر ہمارا ایک اور مسئلہ یہ بھی تھا کہ ہمارے معاشرے اور ہماری
سوسائٹی میں بداخلاقیوں کو جو عروج حاصل ہو گیا ہے، اور غیر صالح۔ غیر دیانتدار اور ناقابل اعتماد سیرت کے جو افراد اُبھر
آئے ہیں وہ کسی طرح پست ہوں۔ نیچے گریں۔ اور ان کے بجائے۔ اچھی باتیں پھیلیں اور اچھے لوگ اوپر آئیں لیکن اب جبکہ
"پولیس ایکشن" ہو چکا ہے، ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے یہ مسائل اور ہماری سوسائٹی کی یہ خرابیاں آج بھی اُسی طرح برقرار ہیں۔ اور زندگی
جس بھول بھلیاں میں پہلے پھنسی ہوئی تھی آج بھی اسی میں سرگرداں اور حیران ہے بات دراصل یہ ہے کہ حیدرآباد میں جو خرابیاں پہلے ابھری تھیں
ان کی تہہ میں مادیت۔ انسان پر انسان کا اقتدار خود غرضی اور نفس پرستی کے داعیات کام کر رہے تھے اور پولیس ایکشن کے بعد بھی یہ داعیات
برابر اپنا کام کر رہے ہیں اس لئے چاہے ایک حکومت رہے یا جائے جب تک انسانیت
کو تباہ کرنے والے یہ غلط معتقدات اور غلط نظریات موجود رہیں گے خرابیاں اسی طرح پھلتی پھولتی رہیں گی اور انسانیت کا سہاگ ہمیشہ اُجڑتا
رہے گا۔ اگر ہم زندگی میں کسی حقیقی تبدیلی کے خواہشمند ہیں تو ہمیں ان اساسی تصورات کو بدلنا ہوگا۔ مادیت کی بجائے خدا پرستی انسان پر انسان
کی حکمرانی کے بجائے خدائی اصولوں کی حکمرانی خود غرضی اور نفس پرستی کے بجائے پوری انسانیت کے مفاد کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ اور ایک
مسلک اور نیا نظام تلاش کرنا ہوگا۔ تب کہیں جا کر ہم کامیاب ہوں ورنہ محض "پولیس ایکشن" بیماری کا علاج نہیں بلکہ
یہ خود بھی ایک طرح کی بیماری ہے۔

افراط زر کے اسباب

افراط زر کا ایک سبب تو حکومت برطانیہ کی وہ اقتصادی پالیسی تھی جو اس نے زمانۂ جنگ میں اختیار کی تھی اور
جس کی رو سے اس نے ایسا زر کاغذی (PAPER MONEY) ہندوستان میں جاری کر دیا جس کے بدلے میں METALIC MONEY کی
کی ادائی کا حکومت کوئی وعدہ نہیں کرتی۔ چنانچہ اس طرح کے غیر مستند زر کاغذی کی بہتات ہی نے آج ہندوستان میں افراط زر
INFLATION OF MONEY کا مرض قبیح پیدا کر دیا ہے۔ لیکن اس ظاہری سبب کے علاوہ بعض اسباب ایسے بھی ہیں جو [illegible]

نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ یہ اسباب جمع ہندوستانیوں کی بداخلاقی، بدکرداری لوٹ کھسوٹ اور جائدادوں کی غارتگری پر مبنی ہیں۔ پچھلے دنوں میں اس ملک میں جو کچھ ہوا۔ وہی اس بُرائی کی اصلی جڑ ہے۔ اکثر ناعاقبت اندیش لیڈروں کے نزدیک یہ کارروائیاں بہت خوش آئند تھیں، ہندوستان کو اکھنڈ بنانے کے لئے۔ ایک قوم اور ایک تہذیب کو برسر اقتدار لانے کے لئے یہ سب کچھ بہت اچھا اور بھلا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن یہ کوئی نہ جانتا تھا کہ ان سارے اقدامات کا نتیجہ خود اپنے پیر پر آپ کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے۔ اپنی قومی اور ملکی دولت کو خود ہی تباہ کرنا ہے۔ اپنے گلے میں خود ہی پھانسی کا پھندہ لگانا ہے۔ کیا قومی جنون کے ان ہنگاموں نے ایک بڑے گروہ کو مفلوک الحال کر کے اس کی قوت خرید (PURCHASING POWER) کو متاثر نہیں کیا۔ اس کی قوت پیداوار (PRODUCTIVITY) اور کارکردگی (EFFICIENEY) کو ضائع نہیں کیا۔ اور اُن ذرائع پیداوار کو مسدود نہیں کر دیا۔ جن سے خود ان کے اپنے ملک کی "مجموعی دولت" (NATIONAL WEALTH) میں اضافہ ہوتا تھا اور ملک کی اقتصادی بنیادیں مضبوط ہوتی تھیں! پھر انہی ہنگاموں کی وجہ سے ایک دوسرے گروہ میں خود غرضی۔ بخل۔ شقاوت اور بے دردی کی خصوصیات پیدا ہوئیں جس کے باعث یہ لوگ روپیہ کے صحیح مصرف سے محروم ہو گئے۔ سونے چاندی کے پھیلے ہوئے اور ہمیشہ گردش (CIRCULATION) میں آنے والے ذخیرے خاص خاص مقامات پر "محصور" ہو گئے۔ اور حالت یہ ہو گئی کہ ایک جگہ تو روپیہ سڑنے اور گلنے لگا اور دوسری جگہ قلاشوں اور مفلسوں کے ہجوم اناج کے ایک ایک دانے، کپڑے کے ایک ایک ٹکڑے اور کسی ٹوٹی ہوئی دیوار کے معمولی سے سہارے تک سے محروم ہو گئے۔ اسی طرح سودخواری اور معاشی لوٹ (ECONOMIC EXPLOITATION) کے دوسرے طریقوں نے بھی "شغل اصل" (INVESTMENT OF CAPITOL) کے ذرائع کو صرف چند لوگوں کے ہاتھوں میں مقید کر دیا۔ اور پھر پورے ملک کا معاشی توازن بگڑ گیا۔ لہذا اس بگاڑ سے معاشیات کا سب سے اہم شعبہ "زر" متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اب اس خرابی سے مزید خرابیاں پیدا ہوتی جا رہی ہیں اور اگر کچھ دنوں یہی حالت رہی تو کوئی تعجب نہیں کہ یہاں بھی ایک وقت ایسا آئے کہ چین کی طرح ایک جوتا خریدنے کے لئے ایک سوٹ کیس بھر کر نوٹ لیجانا پڑیں اور پھر چین ہی کی طرح یہی ہو کہ کوئی "تاوزے تنگ" ہندوستان میں خلفشار برپا کر دے۔ اگر ہم اپنے ملک سے افراط زر کی لعنت کو اور اس کے ساتھ ہی دوسری اقتصادی خرابیوں کو دور کرنا چاہتے ہیں تو قانونی تبدیلیوں سے زیادہ ہمیں اپنے عوام کی اخلاقی اصلاح کرنی ہوگی۔ قوم پرستی اور خود غرضی کے جنون کو مٹانا ہوگا اور کوئی ایسا تصور پیدا کرنا ہوگا جو انسان کے قلب و ضمیر کو دھو دے اور اس کو ایک معتدل "معاشی انسان" بنا دے۔

میزان زردہ کی تجارت کا نادر موقع

حیدرآباد اور بیرون حیدرآباد کے ایسے ایجنٹ یا ناظرینِ انوار جو میزان زردہ کی تجارت کرنا چاہیں، وہ براہ کرم ہم سے مراسلت کرکے جملہ امور کا تصفیہ فرمالیں۔ ان اصحاب سے ہم خصوصی رعائت کا اعلان کرتے ہیں

میزان زردہ رجسٹرڈ

ایک خصوصی زردہ ہے جو تمباکو کے مضرت رساں اثرات کو دور کرکے اصولی سائینٹفک طریقہ پر تیار کیا جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ کافی صحت بخش اجزا شامل کردینے سے یہ نہ صرف زردہ ہے۔ بلکہ نزلہ، زکام، بلغم، اور کھانسی کے لئے ایک نایاب نسخہ شفا ہوگیا ہے۔ آپ اپنے مقام پر معمولی سی کوشش سے بہت زیادہ منفعت حاصل کرسکتے ہیں۔ اپنی اولین فرصت میں مراسلت کیجئے اور اپنے مارکٹ میں اسے آزمائیے۔

پتہ

سیل ڈپو میزان زردہ ۴۵/۶/۴ معظم جاہی مارکٹ

حیدرآباد دکن

خدا پرستی انصاف اور امن کا پیامی

رجسٹرڈ آصفیہ ۲۹۰

ماہنامہ انوار

حیدرآباد دکن

ادارہ تحریر
سید اصغر علی عابدی
عمر بن عبداللہ ایم اے

سالانہ ۸ روپے
قیمت فی پرچہ
آٹھ آنے

جلد ۳ — شمارہ ۱-۲

مندرجات

اگر آپ خریدار ہیں

اگر آپ ماہنامہ انوار کے خریدار ہیں یا انوار آپکی نظر سے گزرتا ہے تو یقیناً آپکو اسکے مضامین سے دلچسپی ہوگی اور آپ اس بات کے خواہشمند ہونگے کہ ادب و نگارش میں کتابت و طباعت اور پابندی وقت کے ساتھ اشاعت انوار کا معیار بلند سے بلند تر ہوتا چلا جائے لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ ان امور کی تکمیل میں خود آپ کسطرح ہاتھ بٹا سکتے ہیں ۔۔ ؟

(۱) اپنے حلقہ احباب اور حلقہ اثر میں انوار کا تعارف کیجئے اس کے ادبی علمی اور دینی مقاصد کی اشاعت میں حصہ لیجئے اچھے لکھنے والوں اور پڑھے لکھے اصحاب علم کو اسطرف متوجہ کیجئے تاکہ انوار اچھے حلقہ ناظرین میں جاکر اپنی اچھائیوں میں اور اضافہ کر سکے

(۲) کوشش کیجئے کہ آپ ہر ماہ انوار کو کم سے کم ایک خریدار فراہم کریں انشاء اللہ جہینے بھر میں یہ کام آپ باسانی کرسکیں گے صرف ذرا توجہ کی ضرورت ہے ۔۔۔ (۳) اگر اس جگہ [ ] سرخ پنسل کا نشان ہو تو سمجھئے کہ آپ کا بدل اشتراک ختم ہوگیا ہے اسلئے بروقت نئے سال کی قیمت روانہ کیجئے ورنہ دوسرا پرچہ بذریعہ وی پی بھیجا جائے گا اور یہ آپکا اخلاقی فرض ہوگا کہ آپ وی پی وصول فرماکر دفتر کو زحمت سے بچائیں ۔ (۴) اگر آپکو انوار کے ادارے یا دفتر سے کوئی شکایت ہو تو ہمیں اس سے آگاہ کیجئے ہم اس تنقید کو بخوشی گوارا کریں گے اور ہر جائز اصلاح کیلئے تیار ہیں گے

ان چار نقاط پر اگر باقاعدگی سے عمل ہونے لگے تو انشاءاللہ تعالیٰ آپکا یہ جریدہ روز بروز ترقی کریگا اور اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگا

منیجر

نوازش نامے

لکھنؤ سے ایک دوست لکھتے ہیں :۔ مجھے آپ کا "ترقی پسند اسلامی ادب" بہت پسند ہے'۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ صاحب موصوف نے "ترقی پسند اسلامی ادب" کہکر "اسلامی اشتراکیت" جیسی کوئی مہمل اصطلاح بنائی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ لکھنے والے نے ہمارے مدعا کو خوب سمجھ کر لکھا ہے۔ دراصل ادب کے بارے میں جو کچھ ہم چاہتے ہیں وہ مختصر اور سادہ الفاظ میں صرف یہ ہے کہ تکنیک جدید ترین ہو، اسلوب نگارش بالکل تازہ ہو، الفاظ کی بندشیں اور استعاروں کے سانچے بھی نئے ہوں۔ اور پھر تشبیہوں کے کلی بھی نئے نئے ہوں مگر ان تمام چیزوں میں حقیقت وہی پرانی ہو جو آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پرانی۔ اتنی پرانی جتنی کہ یہ دنیا ہی ہے۔ کیونکہ حقیقت کبھی پرانی نہیں ہوتی بلکہ وہ ہمیشہ نئی رہتی ہے۔ پرانا تو "ظرف" ہوتا ہے۔ اس لئے جیسے ہی زمانہ بدلے، پرانے ظرف کو چھتا تک سے زمین پر دے مارنا چاہیئے — کیونکہ اگر کسی کو حق عزیز ہے۔ خدا پرستی کے دائمی اور ہمہ گیر اصول عزیز ہیں۔ تو وہ یقیناً اس حق کی خاطر وقت اور زمانے کے ساتھ ساتھ بدل جانے والے ظروف توڑ ہی ڈالے گا۔ چکنا چور ہی کر کے رکھدے گا اور جب کم نصیب انسان نے ایسا نہیں کیا اور ظاہر کے لباس کو باطن…

سرسری نظر میں

سرسری نظر میں دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ انوار بالکل ویسا ہی ہے جیساکہ اس سے پہلے تھا۔ اور ارتقاء کی رفتار بالکل مدھم ہے۔ اگر آپ سرسری نظر ڈالنے کے بجائے کسی قدر گہری نظر سے دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ "لمعات" انوار… ہیں مضامین کا رنگ بھی بدل… افسانہ۔ تحریک اسلامی کے ادبی… ایک بالکل ہی نئی چیز ہے لیکن اس… پر ہم کسی طرح قابو پا رہے ہیں وہ آپکے… ہے۔ اس ضمن میں "انقلاب کے لئے" ا… "روشنی" بہت کافی ہیں۔ انہی… اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہمارا قدم کتنا… بڑھ رہا ہے۔ نظموں میں ضرار اعظم… محبوب الرحمٰن اکمل، انجم عثمانی اور… تاج العرفان عثمانی ہمارے لئے بالکل… نئے ہیں لیکن یہ نئے ہوکر بھی پرانے… سے قریب ہیں اس لئے توقع ہے کہ… ہی منجھ جائیں گے۔ اسی طرح افسانوں… مرزا فراست بیگ نئے ہیں لیکن نئے ادیبوں اور مفکروں کی قلعی کھول لینے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ "تیاری" ایک گیت ہے اور ایک "مسلمان گیت" ہے۔ دراصل ہم نے تو اس بات کا ارادہ مصمم کر لیا ہے کہ جو چیز بھی ہمارے سامنے آئیگی ہم اُسے مسلمان کر کے چھوڑیں گے۔ اس میں کچھ دقتیں ضرور ہیں مگر اصلی لطف تو مشکلات کو عبور کرنے ہی میں آتا ہے۔ باقی لکھنے والے آپ کے جانے پہچانے ہیں۔ کھیل "محمد…

لمعات — "نیا تعمیری خاکہ؟"

انگریزوں کے آنے اور چلے جانے کے بعد سے ہندوستان نئے نئے تجربات کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ یہاں انسانی زندگی کے دریا میں ایک طویل مدت سے تلاطم برپا ہے۔ موج پر موج چڑھی آتی ہے۔ اور ساحل کی شادابی اور زرخیزی تباہ ہو رہی ہے۔ انسانیت کی کشتی کو خوفناک بھنور ہر آن ڈبو دینے کے درپے ہیں۔ ہر طرف معاشی بدحالی کے بھوت رقصاں ہیں۔ سیاسی مصیبتوں اور بے چینیوں کی دھوم ہے۔ معاشرتی اور اخلاقی زوال کے آثار نمایاں ہیں اور انسان انسان سے بیزار ہو گیا ہے۔ لوگ پوچھتے ہیں آخر ان تباہیوں کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا انگریزی حکومت! — کیا مسلم لیگ! — کیا کانگریس! — کیا سوشلسٹ اور سیوک سنگھی! ہمارے خیال میں ان میں سے کوئی بھی نہیں بلکہ اصلی ذمہ دار ہیں — مذہب کے غیر صحیح تصورات — سرمایہ داری اور ملحدانہ جمہوریت — اور پھر ان اصولوں سے پیدا شدہ مذہب اور خدا سے دشمنی کا تصور مالداروں کے خلاف ناداروں کی لڑائی کا اصول، جس کا نام عرف عام میں "اشتراکیت" رکھا گیا ہے۔ اس وقت یہی اصول ونظریات ہندوستان کے دنگل میں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہیں اور انھیں کی وجہ سے یہاں کے انسانوں کی زندگی اجیرن ہو رہی ہے۔

مذہب کا موجودہ تصور یہ ہے کہ لوگوں کے پاس خدا کی کتاب موجود رہے۔ وہ مندروں میں اور مسجدوں میں خدا کی یاد میں مصروف رہیں۔ گلوں میں زنار ڈالیں۔ انگلیوں سے تسبیح کے منکے گھمائیں۔ گرجاؤں میں گھنٹے بجائیں اور گردواروں میں گرنتھ پڑھتے رہیں۔ بڑی بڑی مذہبی کتابیں لکھیں۔ لمبے لمبے مناظرے کریں۔ کٹر سے کٹر مخالفین کو جیت کر کے خوش ہوں کہ واہ مذہب کی خوب ہی خدمت کی گئی خیر خیرات اور نیک کاموں میں ایک دوسرے سے بازی لیجانے کی کوشش کریں۔ مندروں کے چندوں مسجدوں کے نذرانوں اور گرجاؤں اور گردواروں کی رقومات کے واسطے تجوریوں کے منہ ہمیشہ کھلے رہیں۔ گھر سے کوئی محتاج یا فقیر لوٹ کر نہ جائے۔ کوئی عید بقرعید یا تہوار ایسا نہ ہو جس کو پوری مذہبی شان سے ادا نہ کیا گیا ہو۔ غرض کہ اس طرح انسان ہمیشہ ایک مذہبی زندگی گزارے اور خدا کی یاد میں مصروف رہے تو بس اس کی نجات اور مکتی کے لئے کافی ہے۔ حالانکہ مذہب کا یہ تصور اور یہ اصول سراسر غلط اور خود مذہب کی گردن پر چھری چلانے کے مترادف ہے کیونکہ انسان ایسے مذہب کو مانتے ہوئے بھی، تمام غیر مذہبی کاموں میں حصہ لے سکتا ہے وہ مندر میں خدا کو پوجتا ہے لیکن مندر کے باہر خدا اس کو کہیں بھی یاد نہیں آتا۔ وہ مسجدوں میں خدا کے آگے رکوع وسجود کرتا ہے اور تسبیح وتہلیل میں مصروف رہتا ہے لیکن مسجد

نوازش نامے

لکھنؤ سے ایک دوست لکھتے ہیں :- مجھے آپ کا "ترقی پسند اسلامی ادب" بہت پسند ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ صاحب موصوف نے "ترقی پسند اسلامی ادب" کہکر "اسلامی اشتراکیت" جیسی کوئی مہمل اصطلاح بنائی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ لکھنے والے نے ہمارے مدعا کو خوب سمجھ کر لکھا ہے۔ دراصل ادب کے بارے میں جو کچھ ہم چاہتے ہیں وہ مختصر اور سادہ الفاظ میں صرف یہ ہے کہ تکنیک جدید ترین ہو، اسلوب نگارش بالکل تازہ ہو، الفاظ کی بندشیں اور استعاروں کے سانچے بھی نئے ہوں۔ اور پھر تشبیہوں کے کلی بھی نئے نئے ہوں مگران تمام چیزوں میں حقیقت وہی پرانی ہو آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پرانی۔ اتنی پرانی جتنی کہ یہ دنیا ہی ہے۔ کیونکہ حقیقت کبھی پرانی نہیں ہوتی بلکہ وہ ہمیشہ نئی رہتی ہے۔ پرانا تو "ظرف" ہوتا ہے۔ اس لئے جیسے ہی زمانہ بدلے "پرانے ظرف کو چھتا تک سے زمین پر دے مارنا چاہئیے ——— کیونکہ اگر کسی کو حق عزیز ہے۔ خدا پرستی کے دائمی اور ہمہ گیر اصول عزیز ہیں۔ تو وہ یقیناً اس حق کی خاطر وقت اور زمانے کے ساتھ ساتھ بدل جانے والے ظروف توڑ ہی ڈالے گا۔ چکنا چور ہی کر کے رکھدے گا اور جب کم نصیب انسان نے ایسا نہیں کیا اور ظاہر کے لباس کو باطن

ہندوستان کے خدا پرست ادیبوں کا "اعلان جنگ"

باطل ادب اور خدا ناشناس افکار کے خلاف

جلد شائع ہو رہا ہے

ادبیات نمبر

۱۔ انور اعظمی ۲۔ ابن مختار ۳۔ اصغر عابدی

۴۔ عروج قادری ۵۔ محمود فاروقی ۶۔ عبدالفتح

۷۔ ابن ندیم وفا ۸۔ اسلام اللہ بریمی ۹۔ انوار علیخاں سوز

۱۰۔ ابوالبیان حماد ۱۱۔ ابو محمد فوزی عمری ۱۲۔ ابوالکلام

اور دوسرے قلم کار رفقا جنکی قوت تحریر خدا کی امانت ہے

نوٹ :- جو رفقا ابھی باقی ہیں وہ "ادبیات نمبر" کے لئے جلد از جلد اپنے، افسانے، نظمیں، تنقیدات ڈرامے اور ادب پارے روانہ کر دیں۔

سرسری نظر میں

سرسری نظر میں دیکھنے سے معلوم گا کہ انوار بالکل ویسا ہی جیساکہ اس سے پہلے تھا۔ اور ارتقاء کی رفتار بالکل مدھم ہے۔ لیکن اگر آپ سرسری نظر ڈالنے کے بجائے کسی قدر گہری نظر سے دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ "لمعات" انوار بدل گئے ہیں مضامین کا رنگ بھی بدل رہا ہے افسانہ۔ تحریک اسلامی کے ادب میں ایک بالکل ہی نئی چیز ہے لیکن اس نئی چیز پر ہم کسی طرح قابو پا رہے ہیں وہ آپکے سامنے ہے۔ اس ضمن میں "انقلاب کے لئے" اور "روشنی" بہت کافی ہیں۔ انہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہمارا قدم کتنا آگے بڑھ رہا ہے۔ نظموں میں ضمرار اعظمی محبوب الرحمن اکمل، انجم عثمانی اور تاج العرفان عثمانی ہمارے لئے بالکل نئے ہیں لیکن یہ نئے ہوکر بھی پرانے پن سے قریب ہیں اس لئے توقع ہے کہ جلد ہی منجھ جائیں گے۔ اسی طرح افسانوں میں مرزا فراست بیگ نئے ہیں لیکن نام نئے ادیبوں اور مفکروں کی قلعی کھول لینے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ "تیاری" ایک گیت ہے اور ایک "مسلمان گیت" ہے دراصل ہم نے تو اس بات کا ارادہ مصمم کر لیا ہے جو چیز بھی ہمارے سامنے آئیگی ہم اُسے مسلمان کر کے چھوڑیں گے۔ البتہ اس میں کچھ دقتیں ضرور ہیں مگر اصلی لطف تو مشکلات کو عبور کرنے ہی میں آتا ہے۔ باقی لکھنے والے آپ کے جانے پہچانے ہیں۔ "کھیل" تحریر

لمعات

"نیا تعمیری خاکہ؟"

انگریزوں کے آنے اور چلے جانے کے بعد سے ہندوستان نئے نئے تجربات کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ یہاں انسانی زندگی کے دریا میں ایک طویل مدت سے تلاطم برپا ہے۔ موج پر موج چڑھی آتی ہے۔ اور ساحل کی شادابی اور زرخیزی تباہ ہو رہی ہے۔ انسانیت کی کشتی کو خوفناک بھنور ہر آن ڈبو دینے کے درپے ہیں۔ ہر طرف معاشی بدحالی کے بھوت رقصاں ہیں۔ سیاسی مصیبتوں اور بے چینیوں کی دھوم ہے۔ معاشرتی اور اخلاقی زوال کے آثار نمایاں ہیں اور انسان انسان سے بیزار ہو گیا ہے۔ لوگ پوچھتے ہیں آخر ان تباہیوں کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا انگریزی حکومت! ـــ کیا مسلم لیگ! ـــ کیا کانگریس! ـــ کیا سوشلسٹ اور سیوک سنگھی! ہمارے خیال میں ان میں سے کوئی بھی نہیں بلکہ اصلی ذمہ دار ہیں ـــ مذہب کے غیر صحیح تصورات ـــ سرمایہ داری اور ملحدانہ جمہوریت ـــ اور پھر ان اصولوں سے پیدا شدہ "مذہب اور خدا سے دشمنی کا تصور" مالداروں کے خلاف ناداروں کی لڑائی کا اصول" جس کا نام عرف عام میں "اشتراکیت" رکھا گیا ہے۔ اس وقت یہی اصول و نظریات ہندوستان کے دنگل میں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہیں اور انھیں کی وجہ سے یہاں کے انسانوں کی زندگی اجیرن ہو رہی ہے۔

مذہب کا موجودہ تصور یہ ہے کہ لوگوں کے پاس خدا کی کتاب موجود رہے۔ وہ مندروں میں اور مسجدوں میں خدا کی یاد میں مصروف رہیں۔ گلوں میں زنار ڈالیں۔ انگلیوں سے تسبیح کے منکے گھمائیں۔ گرجاؤں میں گھنٹے بجائیں اور گردواروں میں گرنتھ پڑھتے رہیں۔ بڑی بڑی مذہبی کتابیں لکھیں۔ لمبے لمبے مناظرے کریں۔ کٹر سے کٹر مخالفین کو چت کر کے خوش ہوں کہ واہ مذہب کی خوب ہی خدمت کی گئی۔ خیر خیرات اور نیک کاموں میں ایک دوسرے سے بازی لیجانے کی کوشش کریں۔ مندروں کے چندوں، مسجدوں کے نذرانوں اور گرجاؤں اور گردواروں کی رقومات کے واسطے تجوریوں کے منہ ہمیشہ کھلے رہیں۔ گھر سے کوئی محتاج یا فقیر لوٹ کر نہ جائے۔ کوئی عید بقرعید یا تہوار ایسا نہ ہو جس کو پوری مذہبی شان سے ادا نہ کیا گیا ہو۔ غرض کہ اس طرح انسان ہمیشہ ایک مذہبی زندگی گزارے اور خدا کی یاد میں مصروف رہے تو بس اس کی نجات اور مکتی کے لئے کافی ہے۔ حالانکہ مذہب کا یہ تصور اور یہ اصول سراسر غلط اور خود مذہب کی گردن پر چھری چلانے کے مترادف ہے کیونکہ انسان ایسے مذہب کو مانتے ہوئے بھی، تمام غیر مذہبی کاموں میں حصہ لے سکتا ہے وہ مندر میں خدا کو پوجتا ہے لیکن مندر کے باہر خدا اس کو کہیں بھی یاد نہیں آتا۔ وہ مسجدوں میں خدا کے آگے رکوع و سجود کرتا ہے اور تسبیح و تہلیل میں مصروف رہتا ہے لیکن مسجد

کے باہر قدم رکھتے ہی وہ خدا سے صاف بچ کر نکل جاتا ہے وہ قدم قدم پر خدا سے انحراف کرتا ہے۔ "نماز" کے علاوہ زندگی کے کسی معاملہ میں اُس کو خدا کی ضرورت نہیں پڑتی۔ گرجا میں "مقدس باپ" کے متبرک بیٹوں اور "پاک مریم" کی باعزت بیٹیوں نے گھٹنے ٹیک کر اطاعت و فرمانبرداری کا مظاہرہ کیا " اقرار گناہ " (CONFESSION) کے فریضہ سے سبکدوش ہو کر ہر ہفتہ "روحانی غسل" سے پاک ہوئیں ۔ مگر گرجا سے باہر نکلتے ہی گرجا کے گھنٹوں سے معمور فضا میں جس قسم کی گندگی چاہیں پھیلا سکتی ہیں۔ اور جس طرح کی نجاست چاہیں جگہ جگہ لیپ سکتی ہیں۔ گرنتھ صاحب میں گرو نانک جی نے جو کچھ بھی کہا ہو۔ گرو گوبند مہاراج کے کتنے ہی بڑے کارنامے ہوں۔ لیکن گردوارے کے باہر کیا اسی گرنتھ صاحب پر عمل ہوتا ہے؟ یا زندگی کے ہر میدان میں "جیو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" کا "گرنتھ صاحب" چلتا ہے۔ دراصل مذہب کے اس تصور نے مذہب کے نام تک کو بدنام کر دیا ہے۔ اس تصور کو درست سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان "خدا" سے ایک خطرناک کھیل کھیل رہا ہے اُس کے نزدیک خدا کی ذات اور اُس کے بھیجے ہوئے پیغمبر محض ایک تماشا اور عجائب گھر کی چیزیں ہیں۔ جن سے جب تفریح کی خواہش ہوئی دل بہلا لیا۔ یا کسی خاص وقت پر ان کا ذکر کر لیا یا اُن کے بارے میں کچھ گفتگو کر کے مزہ لے لیا اس کے بعد انسان جو چاہے کرتا پھرے کاروبار اور لین دین میں مذہب کا کوئی دخل نہیں۔ دنیا کا جو دستور ہے وہ چل رہا ہے۔ شادی بیاہ اور رسوم و رواج میں خدائی ہدایات نے اگر حصہ لیا تو وہ پیٹ گئیں۔ کیونکہ وہاں تو جو کچھ اگلے وقتوں سے ہوتی آئی ہے وہی چلے گی۔ معاشیات میں خدا اور مذہب کے سارے اصول بے کار اور لغو ہیں ان پر عمل کیا جائے تو دنیا ملتی نہیں بلکہ اور کھو جاتی ہے۔ اور پھر سیاست کا مرتبہ تو اس قدر بلند ہے کہ خدا اور مذہب کو اس کا کیا علم کیونکہ یہ تو بالکل حال کی پیداوار ہے۔ "پرانے خدا" اور "پرانے مذہب" کو اس عجیب غریب چیز سے کیا واسطہ؟ ان کو تو صرف مندروں میں بند، مسجد کے حجروں میں مقفل اور گرجاؤں اور گردواروں میں پرسکون طریقے پر بیٹھے رہنا چاہیئے۔ آخر انہیں زندگی کے ہر معاملے میں "ٹانگ اڑانے" کی حاجت ہی کیا ہے۔!

پھر اس تصور کے علاوہ دوسرا خیال یہ بھی ہے کہ کچھ لوگ مذہب میں خصوصیت حاصل کر کے مذہبی ٹھیکیداروں، پیشواؤں مجاوروں اور مہنتوں کے مقام پر فائز ہو جائیں۔ جو مذہب کا نام لینے اور خدا کا کلمہ پڑھنے کے باوجود لوگوں سے اپنی اطاعت کروائیں اور اپنا کلمہ پڑھوائیں۔ تاکہ ان کا پیٹ بھرنے کیلئے اور ان کی معاشی خوش حالی کے لئے ایک اچھا خاصہ بزنس فراہم ہو جائے۔ عہدیداری، اور "لیڈرشپ" کے وہ مواقع جو اکثر جاہل لوگوں کے ہاتھ نہیں آتے، ان کی تکمیل وہ انسان کی مذہب پسندی کے جذبہ سے ناجائز فائدہ اٹھا کر کرلیں اور عیش و عشرت اور خواہشات نفس کی پیروی کے لئے ایک نئی راہ کھول لیں۔

مذہب کے ان تصورات پر تھوڑے بہت غور کے بعد ایک سنجیدہ فہم و ادراک کا آدمی یہ سمجھ سکتا ہے کہ آخر اس قسم کی "مذہبیت" اور "خدا پرستی" سے حاصل کیا؟ کیا اس سے ملک کا نظام درست ہو سکتا ہے؟ کیا اس سے

ملک میں امن و امان قائم ہو سکتا ہے؟ کیا اس سے ہندوؤں
اور مسلمانوں کے تعلقات بہتر ہو سکتے ہیں؟ کیا اس سے
سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش مٹ سکتی ہے؟ کیا اس سے
زمیندار اور کسان کے جھگڑے دور ہو سکتے ہیں؟ کیا یہ افراط
زر کا کوئی حل ہے؟ کیا یہ عوامی اخلاق کی اصلاح کر سکتا ہے؟
کیا یہ ملک کی دولت اور طاقت میں اضافہ کا باعث ہو سکتا
ہے؟ اور کیا اس سے بہ حیثیت مجموعی برائی کمزور اور بھلائی
طاقتور بن سکتی ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ یہ مذہب تو زندگی کے تمام
مسائل کو اپنے حال پر چھوڑ کر خود ایک "پہاڑ" پر جا بیٹھتا ہے
اور سب سے الگ رہتا ہے اس لئے اس کی موجودگی میں بھی
جتنی برائیاں چاہیں پروان چڑھ سکتی ہیں اور جتنی بھلائیاں
چاہیں مٹائی جا سکتی ہیں۔ ایسا مذہب تو فریب کا ایک پردہ ہے
جس پر نقش و نگار تو بڑے خوبصورت ہیں مگر جس کے پیچھے
خوفناک اژدر اور مہیب عفریت منہ کھولے پڑے ہیں۔ جو لوگ
یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح کی محدود مذہبیت پر کاربند ہو کر وہ خدا
کے پاس اپنے درجات بلند کر سکیں گے انھیں اس فریب کے
پردہ کو چاک کر دینا چاہیئے۔ درجات کی بلندی تو الگ ہی سوال
ہے کہ کہیں اس بے روح مذہبیت سے وہ دوگنی سزا کے مستحق نہ قرار پا جائیں۔

مذہب کے بعد اب ذرا سرمایہ داری کا جائزہ لیجئے۔

انگریزوں کی سیاسی غلامی کے باعث ہندوستان اُن
کی ذہنی اور فکری غلامی میں بھی مبتلا ہو گیا اور غیر ارادی
طور پر یہاں کے باشندوں نے وہی طریقہ حیات اختیار کر لیا
جو انگریز اپنے ساتھ یورپ سے درآمد کر کے لائے تھے۔ اس
طریقہ زندگی کا ایک بہت اہم جز سرمایہ داری CAPITALISM
تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہر شخص کی زندگی کا مقصود اصلی
صرف روٹی ہے اور وہ اس روٹی کے حصول کے لئے اخلاق
کی حدود کو پھاند کر ہر جائز و ناجائز طریقہ اختیار کر سکتا ہے۔

چنانچہ جیسے ہی یہ اصول ہندوستان میں داخل ہوا۔ یہاں کے
باشندوں میں روپیہ سمیٹنے اور روٹی جمع کرنے کے لئے ایک
زبردست "گھوڑ دوڑ" شروع ہو گئی۔ پیدائش دولت کے
نہایت مکروہ طریقے اختیار کئے گئے۔ سود۔ احتکار۔ بلیک مارکٹ
دلالی۔ اشتہار کے ذریعہ جھوٹی مانگ پیدا کرنا۔ تعیشات اور
ایسی ہی دوسری غیر مفید اور انسانی تمدن کے لئے مہلک چیزوں
کی خرید و فروخت کرنا ہر ایک کے نزدیک جائز قرار پایا۔ اور
تھوڑے ہی عرصے میں اس پیٹ پرستانہ تگ و دو اور لوٹ
کھسوٹ کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک طبقہ جس کی صلاحیتیں نسبتاً بہتر
تھیں، یا جس کو زیادہ مواقع حاصل تھے یا جس کے ذرائع
وسیع تھے، دولت کے اونچے اونچے انباروں پر قابض ہو گیا۔
بڑے بڑے کاروبار اور جائدادوں کا مالک بن بیٹھا یہاں تک
کہ اس کی تجوریوں میں روپیہ سڑنے اور گلنے لگا اور دوسری
طرف ایک کثیر گروہ ایسے لوگوں کا پیدا ہو گیا جس کے پاس
کچھ تو قدرتی طور پر صلاحیتوں کی کمی تھی اور کچھ مواقع اور
ذرائع مسدود تھے وہ اس معاشی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گیا
پورے ملک میں ایسے مفلسوں اور قلاشوں کے غول کے غول
بغلیں بجاتے اور خالی جیبیں اچھالتے پھر رہے تھے۔ ان کی
عورتیں ننگی تھیں ان کے بچے بھوکے تھے۔ اور ان کی بیماریاں
بغیر علاج کے موت کو دعوت دیتی تھیں۔ سرمایہ داروں کے
گھر برقی روشنی کے قمقموں سے جگمگ جگمگ کرتے، اُن کے

جسم نوئیڈ اور ریشم کے ملبوسات سے ڈھانکے جاتے اُن کے بچے آناؤں اور آیاؤں کی گودوں میں پلتے۔ بڑے بڑے اسکولوں میں اور ملک کے باہر جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے۔ ہوائی جہازوں اور موٹروں کی سیر میں اُن کی زندگی بسر ہوتی۔ مگر جاہل اور گندہ، ناتراشیدہ عوام سڑکوں اور گلیوں کی خاک چھانتے پھرتے۔ ان کی عورتیں مزدوری اور عصمت فروشی کے ذریعہ اپنا پیٹ پالتیں۔ اُن کے بچے راہ گیروں سے لپٹ لپٹ کر بھیک مانگنے کا فن سیکھتے اور ان کے جوان چوری ڈکیتی اور دلالی کے فن میں طاق ہوتے سٹّے بازی جوئے اور فریب سے کام نکالنے میں ماہر بنتے۔ پھر اس صورت حال کا نتیجہ یہی نکلا کہ جو مالدار تھے، جن کی جیبیں گرم اور پھولی ہوئی تھیں وہ لیڈرشپ اور عہدیداری کے مقام پر فائز ہوگئے تاریخ کے تیز رفتار "ارتقا" کی زد میں آکر پرانے نواب اور جاگیردار تو ختم ہوگئے۔ لیکن نئے نئے سرمایہ داروں، سیٹھوں، اور کارخانہ داروں نے اُن کی جگہ لے لی۔ یا پھر سیاسی لیڈر رہنمائے ملک اور فدائے قوم وہ بنے جن کی پشت پر کوئی بڑا سرمایہ دار تھا جن کو سہارا دینے کے لئے تجوریوں کے گاؤ تکئے تھے جن کے حق میں پروپیگنڈا کرنے کے لئے وافر رقم تھی۔

اس دور سرمایہ داری میں انسانی کردار روپیوں سے تولا اور نوٹوں سے گنا جانے لگا۔ جو شخص کسی بڑے کارخانے کا مالک تھا۔ بڑا بینکر تھا۔ کسی جہاز راں کمپنی کا مالک تھا مل کا پروپرائٹر تھا، وہ سب سے زیادہ با اخلاق اور باکردار تھا سب سے زیادہ شریف اور دیانتدار تھا، اس کی مارکٹ میں ہر ایک سے بڑھ چڑھ کر ساکھ تھی۔ اس کے علاوہ باقی سب لوگ پنچ اور کمینے تھے۔ ادنیٰ اور حقیر تھے۔ چاہے وہ علم و فضل۔ دیانت و امانت اور ہمدردی و دوستی میں ان "خزانے کے سانپوں" سے کتنے ہی بلند و بالا ہوں لیکن چونکہ ناپنے کے پیمانے بدل چکے تھے اور دیکھنے کی عینکیں رنگین تھیں اس لئے ساری دنیا کو زمین اوپر اور آسمان نیچے دکھائی دیتا تھا۔ پیڑ ہرا بھرا اور پتے مٹیالے اور کھردرے نظر آتے تھے۔ گدھے گھوڑوں کی شکل میں تبدیل ہو چکے تھے اور وقت کے ترکی و تازی ٹٹوؤں اور خچروں سے زیادہ اہمیت نہ رکھتے تھے۔ اس جاہلی دور میں انسانی اخلاق کا معیار بہت گر گیا تھا ہر پیٹ پرست انسان کے نزدیک اچھائی برائی محض اضافی قدریں تھیں۔ اس کے نزدیک سچ کاروبار کو چمکانے اور دوکان کو پالش کرنے کا ایک خوبصورت آلہ تھا۔ اس کی ہمدردی کے جام میں افادیت کا زہر ملا ہوا تھا اور اس کی دوستی میں راحت و سکون کی بجائے مطلب پرستی کے بچھو کے ڈنک چھپے ہوئے تھے۔ اس کی بلند حوصلگی کسی مکروہ کم ظرفی کا پیش خیمہ تھی۔ اسکی ایمانداری دغا اور فریب کاری کا ایک نادر نمونہ تھی۔ اس کی پابندی عہد وعدہ خلافیوں سے زیادہ ہمت شکن تھی۔ اس کی نوازش اور مہربانیوں میں بدسلوکیوں اور بدمعاملگیوں کی ساری گندگی موجود تھی۔ وہ ایک شریف دشمن۔ عیار ساتھی۔ اور خود غرض مخلص تھا۔ وہ ایک پاکباز بدکار صداقت شعار جھوٹا۔ اور نیکوکار غنڈہ تھا۔ سچ، راستی، حق گوئی ہمدردی بنی نوع۔ عوامی فلاح و بہبود۔ حق پرستی۔ اور حق آگاہی اُس کے نزدیک محض چند شطرنج کے مہرے تھے جن سے وہ حسب موقع کوئی نہ کوئی چال چل دیتا ان تمام اعلیٰ

صفات کی اُس کے نزدیک اتنی اہمیت بھی نہ تھی جتنی چھوٹے بچوں کے نزدیک کاغذ کی اُن ٹکلیوں کی ہوتی ہے جنھیں وہ ٹھیکریوں کے ذریعہ ہوا میں اُچھال اُچھال کر خوش ہوتے ہیں

پرانی نوابیت، جاگیرداری اور "رجواڑہ پن" اگرچہ بہت بُرا تھا۔ انسانوں کے لئے تباہ کن تھا اور اس میں ان کی تذلیل اور تحقیر ہوتی تھی لیکن اس جدید دور کی سرمایہ داری نے جو نئے زاویے، نئے اصول، اور نئی اقدار حیات "ایجاد" کی تھیں وہ ان پُرانی قدروں سے کچھ کم گھناؤنی اور انسانیت سوز نہیں تھیں۔ یہ تو محض برائی کا بدلا ہوا روپ تھا اور اصلی برائی تو نقاب کے پیچھے اب بھی اسی طرح مسکرا رہی تھی قدیم تہذیب مرچکی تھی مگر نئی تہذیب امراض خبیثہ کے ویسے ہی پھوڑے لئے ظہور میں آچکی تھی۔ دراصل بیماری وہی تھی مگر اس کا نام نئی لغت سے لیا گیا تھا!

لادینی یا مغربی جمہوریت کا فتنہ بھی کچھ کم اذیّت بخش نہیں ہے۔ اس جمہوریت کے نام کو آج ہم خدا سے زیادہ مقدس اور متبرک سمجھتے ہیں لیکن یہ "جمہوریت" جس کا آج سارا ہندوستان گرویدہ ہے اک درد لادوا ہے۔ ایک ایسا مرض قبیح اور ایک ایسی چبھن والا کانٹا ہے جس کو تیز زہر مار نشتر ہی ختم کرسکتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک کا ذی ہوش اور سمجھدار طبقہ اس گھناؤنی بیماری کے نتائج کو سمجھے اور اس سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

جب انسان خدا کی اطاعت اور فرمانبرداری سے آزاد ہوکر آپ اپنا خدا اور حکمراں بن جاتا ہے تو وہ دراصل "آزاد" نہیں ہوتا بلکہ خدائی قانون اور احکام کے مقابلے میں اپنے ہوائے نفس اپنی خواہشات، اور اپنی ذاتی اغراض کا غلام بن جاتا ہے۔ چنانچہ اس بنیاد پر جب وہ آگے بڑھتا ہے تو وہ لاتعداد غرضمند گروہوں میں بٹ جاتا ہے۔ کہیں نسل کی بنیاد پر پارٹی بندی ہوتی ہے۔ کہیں تہذیب کی بنیاد پر گروہ بندی ہوتی ہے کہیں قومیت اور زبان کی بنیاد پر طبقہ بندی ہوتی ہے اور کہیں معاشی اونچ نیچ انسانوں کو کاٹ کر ایک دوسرے سے الگ کردیتی ہے اور پھر جب اس طرح کی لاتعداد پارٹیاں اور جماعتیں مختلف نقاط نظر اختیار کرکے باہم متصادم اور دست وگریباں ہوتی ہیں تو اس کشمکش سے ویسے ہی خطرناک نتائج برآمد ہوتے ہیں جیسے کسی فرقہ وارانہ یا قوم پرستانہ لڑائی میں ہوتے ہیں۔ ایک پارٹی دوسری پارٹی کے خلاف جو زہر اُگلتی ہے جو جھوٹ اور جو گندگی پھیلاتی ہے جس قسم کے ادنیٰ جذبات اور خواہشات کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اپنے آدمی کو بڑھانے اور دوسرے کے آدمی کو گرانے کے لئے جس اخلاقی پستی میں خود جا گرتی ہے وہ انسانی تمدن اور تہذیب کے لئے انتہائی مہلک اور تباہ کن ہے۔ پھر نہ صرف یہ خصوصیات دوسری پارٹی کے خلاف پیدا ہوتی ہیں بلکہ خود ایک پارٹی کے مختلف افراد بھی ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی خاطر اس درجہ گھناؤنی اور غیر مہذب حرکات کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ایسی ایسی سازشوں اور مکاریوں سے کام لیتے ہیں کہ اگر کوئی انجان شخص ان کو قریب سے دیکھے تو اسے یوں معلوم ہو جیسے یہ سب کسی خطرناک بیماری کے مچھر ہیں —

ہمارے ملک میں اس لادینی مغربی جمہوریت نے انسانوں

کو اُن کی حقیقی آزادی سے محروم کر کے اُن کو ایک دوسرے کا دشمن اور خون کا پیاسا بنا دیا ہے۔ اس جمہوریت نے رنگ، نسل اور تہذیب کے اُن تمام فتنوں کو جو سینکڑوں برس سے سوئے پڑے تھے اچانک جگا دیا ہے۔ یہ بے خدا جمہوریت زندگی کے تمام شعبوں کے لئے ایک حیوانی نقطۂ نظر پیش کرتی ہے اور جیسا کہ کاروبار میں اس کا نتیجہ سرمایہ داری ہے۔ اسی طرح معاشرت میں اس سے صنفی مزاج، بے حیائی، اور عیاشی کو زور ہوا ہے۔ سیاست میں اس نے انسانوں کو خود ایک دوسرے کا حاکم اور بادشاہ بنا دیا ہے۔

مغربی جمہوریت " تو دراصل ایک طرح کی لاقانونیت ہے۔ وہ انسانوں کو ان کی حد جائز کے اندر نہیں رکھتی بلکہ انھیں حیوانوں کی سی آزادی دے کر ایک دوسرے سے ٹکراتی، لڑاتی اور کشت وخون کا بازار گرم کرتی ہے۔ خصوصاً ایک ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے اور جہاں قدم قدم پر تہذیبی اور تمدنی نیرنگیاں انسان کی نظروں کو بوسہ دیتی ہیں اس " یوروپین لیڈی " نے تو لوگوں کو طرح طرح سے حیران کر رکھا ہے۔ وہ پہلے پہل دلنواز اشارے کر کے ان کو اپنے پاس بلاتی ہے۔ لیکن جب وہ اس کے پاس آجاتے ہیں تو وہ ان سب کو رقیبوں کی طرح ایک دوسرے سے لڑا کر تماشہ دیکھتی ہے۔ اور اس طرح پورا ملک مخالف گروہوں کی پہلوانی کے لئے دنگل کا کام دینے لگتا ہے اور ساری زمین انسانی خون سے رنگین ہو کر طرح طرح کے زہریلے اور مسموم پھل اور پودے اُگانے لگتی ہے۔

" اشتراکیت " ۔ ایک جدید انقلابی نظام سمجھا جاتا ہے، اور پرانی قسم کی مذہبیت سرمایہ داری اور جمہوریت کے مقابلے میں اس کو نئی تعمیر پسند اور ترقی پذیر اقدار کا علمبردار گردانا جاتا ہے۔ لیکن نہیں معلوم کہ یہ موجودہ دور کے عام مذہب نوازوں، سرمایہ داروں اور جمہوریت پسندوں کی بیوقوفی اور ناواقفیت ہے۔ یا اشتراکیوں کی خود فریبی کہ وہ اشتراکیت کو خواہ مخواہ ایک نئے اصول اور نئے نظام سے تعبیر کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر کسی قدر غور وفکر سے کام لیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اِس نظام کی بنیاد بھی انہیں تصورات پر رکھی گئی ہے۔ جن پر خود جاہلانہ مذہب، سرمایہ داری، اور جمہوریت کی بنیاد ہے۔

سب سے پہلے لادینیت یا خدا سے بغاوت کے نظریہ کو لیجئے۔ یہ نظریہ جاہلانہ مذہب، سرمایہ داری، اور جمہوریت تینوں کی اصل اور جڑ ہے اور اسی کی اساس پر ان کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ جاہلانہ مذہب میں بظاہر خدا پرستی نظر آتی ہے لیکن عملاً زندگی کے حقیقی میدان میں وہ بھی خدا سے اتنا ہی دور ہے جتنا ایک اشتراکی۔ اب رہے دوسرے نظامات تو ان کے بارے میں علانیہ کون کہہ سکتا ہے کہ ان کا دارومدار خدا پرستی پر رکھا گیا ہے۔ اس کے بعد انسان پر انسان کے اقتدار اور بے جا حق تصرف پر غور کیجئے تو یہ چیز پہلے تین اصولوں میں بھی ہے اور اشتراکیت میں بھی، اسی طرح دولت کی پوجا کا تصور چاہے وہ مختلف شکلوں ہی میں کیوں نہ ہو۔ جاہلی مذہب، سرمایہ داری اور جمہوریت، میں بھی ہے اور اشتراکیت میں بھی۔ اشتراکی تحریک کے نزدیک اولین محرک قوت یہی پیٹ کی پرستش

یا "لکشمی پوجا" کا اصول ہے۔ چنانچہ یہ تحریک جب لوگوں کو اپنی حمایت میں اکساتی ہے تو اسی جذبہ کو ابھار کر اور پیدا کر کے حالانکہ یہ جذبۂ سرمایہ داری کی جڑ اور بنیاد ہے اب رہی طبقہ واریت تو یہ بالکل غلط ہے کہ اشتراکی اصولوں کے ذریعہ طبقہ واریت ختم ہوجاتی ہے۔ اشتراکیت خود اپنے کام کی ابتدا ایک مخصوص طبقہ کو طاقتور کر کے کرتی ہے۔ اور پھر بعد کو جب اشتراکی اصولوں پر کوئی اسٹیٹ بن جاتا ہے تب بھی اس کو ایک ایسے سربرآوردہ طبقے کی ضرورت رہتی ہے جو سب پر چھایا ہوا ہو اور جس کا کام وقت کی اشتراکی ڈکٹیٹرشپ کی اندھا دھند پیروی کرنا ہو۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ ایسے ایک مفاد پرست اور حکومت کے منہ لگے طبقے کے بغیر اشتراکی نظام ایک دن کے لئے بھی نہیں چل سکتا اسی طرح دوسرے طبقات بھی اس نظام میں بہرحال زور کر کے ابھر آتے ہیں کیونکہ طبقات کی تشکیل کا دارومدار تو مختلف کاموں پر ہے جتنے کام سوسائٹی میں ہوں گے اتنے ہی طبقے بن جائیں گے اور جیسی لوگوں کی صلاحیتیں ہوں گی اسی مناسبت سے وہ مختلف طبقوں سے اپنے آپ کو وابستہ کرلیں گے۔

بہرحال جو خیالات اور جو بلند بانگ دعاوی آجکل کے اشتراکی حضرات کرتے ہیں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ جس طرح سرمایہ داری اور جمہوری نظام انسان کے لئے تباہ کن ثابت ہو رہے ہیں، اسی طرح اشتراکیت بھی تباہ کن ہے جو تبدیلی وہ چاہتی ہے وہ صرف ایک ظاہری اور سطحی تبدیلی ہے جائدادوں کو قومی بنانے . NATIONALISTION OF WEALTH کے معنی سوائے اس کے اور کیا ہوسکتے ہیں کہ ایک طبقے کے ہاتھ میں جس کا نام "حکومت" ہو ملک کی تمام دولت دیدی جائے حالانکہ یہی تو سب سے بڑی سرمایہ داری ہوگی اس لئے جو نتائج آج چھوٹے پیمانے کی سرمایہ داری کے نکل رہے ہیں اُس سے کہیں زیادہ مہلک اور مضر نتائج اس "بڑے پیمانے سرمایہ داری" کے نکلیں گے۔ اصل بات تو صرف یہ ہے کہ اگر کوئی تحریک اُن بنیادی خرابیوں میں مبتلا ہے جن میں جاہلانہ مذہب، سرمایہ داری، اور موجودہ جمہوریت گھرے ہوئے ہیں تو پھر اس کے بطن سے بھی کسی نیک سیرت اور قبول صورت لڑکے کی پیدائش کی توقع رکھنا محض ایک لغو اور مہمل آرزو ہے یہ چیز بھی جلد یا بدیر اپنی کوکھ سے سپنولیا ہی جن کر رہیگی۔

اس بحث اور گفتگو کے بعد قدرتی طور پر ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ موجودہ زمانے کی ساری تحریکات غلط ہیں اور پھر فوراً ہی ہمارے سامنے یہ سوال کھڑا ہوجاتا ہے کہ آخر وہ راستہ کونسا ہے جس پر چل کر انسان نجات حاصل کرسکتا ہے؟ وہ نیا تعمیری خاکہ کونسا ہے جس کی بنیاد پر سوسائٹی کی تشکیل جدید سے انسانی زندگی میں امن اور چین کی بہار آسکتی ہے؟ چنانچہ اس نئے تعمیری خاکے کی تلاش کوئی ناممکن امر نہیں ہے ظاہر بات ہے کہ جن بنیادوں پر آجکل کے مختلف نظامات چل رہے ہیں نئے نظام کو ان سے ہٹ کر مکمل انقلابی اصول پیش کرنا ہوں گے یعنی خدانا شناسی کے بجائے کامل خداپرستی، قوم پرستی اور سرمایہ داری کی بجائے عالمگیر انسانی برادری اور حصول معیشت کے مواقع کی یکسانی جمہوریت کی بے راہ روی اور انسان پر انسان کی خدائی کے بجائے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے دائرے میں انسان کی مناسب

آزادی اور خدا کی نیابت اور خلافت اور یہ اصول اس وقت صرف اسلامی نظام میں موجود ہیں لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ اسلامی نظام مسلمانوں کی زندگی میں تو کہیں نظر نہیں آتا اگرچہ کتابوں میں یہ بڑی عمدگی کے ساتھ محفوظ ہے۔ تاہم اگر یہ بالقوۃ (DE JURE) موجود ہے تو اسے بالفعل (DEFACTO) قائم کرنے کی سعی کرنی چاہیئے۔ اس لئے ہم سب سے پہلے مسلمانوں کو جو آج ناکامیوں کے کالے کالے چہرے دیکھکر خوفزدہ اور پریشان ہیں اس امر کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ پھر سے اسلام کو اختیار کریں اور اس اصول پر اپنی اور اپنے اہل ملک اور پھر سارے جہان کی تعمیر جدید کریں سنجیدہ اور با اصول جماعت بن کر پرعزم اور با وقار انداز میں رسول اکرم کی پیروی میں گامزن ہوں۔ اور ایک انوکھا انقلاب برپا کردیں۔ یقیناً اس میں ان کے لئے دنیوی اور اخروی ہر دو طرح کے فائدے ہیں۔

اسی طرح ہم اپنے غیر مسلم اصحاب فکر اور اہل الرائے سے بھی یہی عرض کریں گے کہ اگر آج ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آرہا ہے اور اس اندھیرے کے وجود سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا تو پھر وہ بھی اسلامی اصولوں کو اپنالیں۔ "اسلام" ان کے لئے کوئی اجنبی شئے نہیں ہے اُن کے حق پسند ضمیر اور صدق آگاہ ذہن اس چیز سے پہلے بھی واقف رہ چکے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ وہ اُن کے پاس ایک دفعہ آکر پھر کھو گیا ہے۔ اور اب دوبارہ اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور مصلحت ہے کہ وہ جہاں چاہے جس ملک میں چاہے اپنے پیغام کو اتارے اسلام کے محض غیر ملک اور غیر قوم سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اس کو ہاتھ لگانے سے پرہیز نہ کیجئے بہت ممکن ہے آپ ایک ہیرے کو پتھر کے دھوکے میں کھو دیں اور بعد کو پچھتانا پڑے۔

لکھنے والوں سے

"انوار" جس مقصد کے لئے شائع ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے دین کی اشاعت اور اس کے انبیا کے لائے ہوئے نظام زندگی کے قیام کی جدوجہد ہے۔ اس غرض کیلئے ہم اس بات کے خواہشمند ہیں کہ ہمارے قلم کار رفقاء مضامین خالص اسلامی نقطۂ نظر سے لکھا کریں۔ جن مضامین میں اسلامی نظام کی انسان کے بنائے ہوئے غلط نظامات کے مقابلہ میں بالاتری ثابت کی گئی ہو وہ خاص طور پر شکریہ کے ساتھ قبول کئے جائیں گے۔ افسانہ، نظم، اور ادبی تنقید میں بھی ہم اسی بات کے قائل ہیں کہ ان کے ذریعہ شکم پرستی نفس پرستی اور وطنیت و نسلیت کے بندھنوں سے آزاد ہو کر خالص اخلاقی اور انسانی بنیادوں پر زندگی کے مختلف گوشوں کو صرف بندگی رب کے لئے تیار کیا جائے ہمیں امید ہے کہ ہمارے لکھنے والے اپنے شعور کو اس قدر بیدار کرلیں گے کہ کوئی بے مقصد تحریر ان کے قلم سے نہ ٹپک پڑیگی۔ ایک اور بات یہ بھی عرض کرنی ہے کہ اکثر رفقاء کا انداز بیان خشک اور زبان بے لطف ہوتی ہے ضرورت ہے کہ نوک قلم زیادہ لوچدار ہو اور روشنائی میں حلاوت و شیرینی کثیر مقدار میں گھلی ہوئی ہو ورنہ اس کے بغیر یہ بہت مشکل ہوگا کہ ہم اپنے مدعا کو عام لوگوں کے ذہنوں میں اتار سکیں۔

تفہیم القرآن

از:-
مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

البقرہ ——— رکوع ۱۶ تا ۱۸

[اس ترجمانی کا مطالعہ کرتے وقت قرآن مجید کی اصل عبارت کا پڑھنا ضروری ہے]

نادان لوگ ضرور کہیں گے، انھیں کیا ہوا کہ پہلے یہ جس قبلے[1] کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے اس سے یکایک پھر گئے؟ اے نبی ان سے کہو "مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں، اللہ جسے چاہتا ہے سیدھی راہ دکھا دیتا ہے۔[2]" اور اسی طرح تو ہم نے تمھیں ایک "امتِ وَسَط" بنا دیا تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو[3]

---

[1] قبلہ: وہ چیز جو آدمی کے سر کے سامنے ہو اور جس کی طرف وہ متوجہ ہو۔ اصطلاح میں قبلہ سے مراد وہ جہت ہے جس کی طرف رخ کر کے آدمی نماز پڑھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے بعد سولہ یا سترہ مہینہ تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے پھر کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم آیا جیسا کہ آگے آتا ہے۔

[2] یہ ان نادانوں کے اعتراض کا پہلا جواب ہے۔ ان لوگوں کے دماغ تنگ تھے، نظر محدود تھی، سمت اور مقام کے بندے بنے ہوئے تھے۔ ان کا گمان یہ تھا کہ خدا کسی خاص سمت میں مقید ہے۔ اس لئے سب سے پہلے ان کے جاہلانہ اعتراض کی تردید میں یہی فرمایا گیا کہ مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں، کسی سمت کو قبلہ بنانے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اللہ اسی طرف ہے، جن لوگوں کو اللہ نے ہدایت بخشی ہے وہ اس قسم کی تنگ نظریوں سے بالاتر ہوتے ہیں اور ان کے لئے عالمگیر حقیقتوں کے ادراک کی راہ کھل جاتی ہے۔

[3] یہ اُمتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت کا اعلان ہے۔ "اسی طرح" کا اشارہ دونوں طرف ہے، اللہ کی اس رہنمائی کی طرف بھی جس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی قبول کرنے والوں کو سیدھی راہ معلوم ہوئی اور وہ ترقی کرتے کرتے اس مرتبہ پر پہنچے کہ "امت وسط" قرار دئے گئے اور تحویل قبلہ کی طرف بھی کہ نادان اسے محض ایک سمت سے دوسری سمت کی طرف پھرنا سمجھ رہے ہیں حالانکہ دراصل بیت المقدس سے کعبہ کی طرف سمت قبلہ کا پھرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو دنیا کی پیشوائی کے منصب سے باضابطہ معزول کر کے امتِ محمدیہ کو اس پر فائز کر دیا۔

"امت وسط" کا لفظ اس قدر وسیع معنویت اپنے اندر رکھتا ہے کہ کسی دوسرے لفظ سے اس کے ترجمے کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے مراد ایک ایسا بہترین گروہ ہے جو عدل و انصاف اور توسط کی روش پر قائم ہو اور دنیا کی قوموں کے درمیان صدر کی حیثیت رکھتا ہو جس کا تعلق سب کے ساتھ یکساں حق اور راستی کا تعلق ہوتا ہے اور ناحق، ناروا تعلق کسی سے نہیں ہوتا۔

پھر یہ جو فرمایا کہ تمھیں "امتِ وسط" اس لئے بنایا گیا ہے کہ "تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو" تو اس سے مراد یہ ہے کہ

(باقی صفحہ آئندہ پر)

پہلے جس طرف تم رخ کرتے تھے اس کو تو ہم نے صرف یہ معلوم کرنے کے لئے قبلہ مقرر کیا تھا کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون اُلٹا پھر جاتا ہے[1]۔ سچ یہ ہے کہ یہ معاملہ بڑا سخت تھا مگر ان لوگوں کے لئے آسان ہو گیا جو اللہ کی ہدایت

(بقیہ صفحہ سابق)
آخرت میں جب پوری نوعِ انسانی کا اکٹھا حساب لیا جائے گا اُس وقت رسول ہمارے ذمہ دار نمائندے کی حیثیت سے تم پر گواہی دے گا کہ فکرِ صحیح اور عملِ صالح اور نظامِ عدل کی جو تعلیم ہم نے اسے دی تھی وہ اس نے تم کو بے کم و کاست پوری کی پوری نہ صرف پہنچا دی بلکہ عملاً اس کے مطابق کام کر کے دکھا دیا۔ اس کے بعد رسول کے قائم مقام ہونے کی حیثیت سے تم کو عام انسانوں پر گواہ کی حیثیت سے اُٹھنا ہو گا اور یہ شہادت دینی ہو گی کہ رسول نے جو کچھ تمہیں پہنچایا تھا وہ تم نے انھیں پہنچانے میں، اور جو کچھ رسول نے تمھیں دکھایا تھا وہ تم نے انھیں دکھانے میں اپنی حد تک کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اس طرح کسی شخص یا گروہ کا اس دنیا میں خدا کی طرف سے گواہی کے منصب پر مامور ہونا ہی درحقیقت اس کا امامت اور پیشوائی کے مقام پر سرفراز کیا جاتا ہے، اور اس میں جہاں فضیلت اور سرفرازی ہے وہیں ذمہ داری کا بہت بڑا بار بھی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح رسول اس اُمت کے لیئے خدا ترسی، راست روی، عدالت اور حق پرستی کی زندہ شہادت بنا اسی طرح اس اُمت کو بھی تمام دنیا کے لئے زندہ شہادت بننا چاہیئے حتیٰ کہ اس کے قول اور عمل اور برتاؤ اس چیز کو دیکھ کر دنیا کو معلوم ہو کہ خدا ترسی اس کا نام ہے، راست روی یہ ہے، عدالت اس کو کہتے ہیں اور حق پرستی ایسی ہوتی ہے۔ پھر اس کے معنے یہ بھی ہیں کہ جس طرح خدا کی ہدایت ہم تک پہنچانے کے لیے رسول کی ذمہ داری بڑی سخت تھی، حتیٰ کہ اگر وہ اس میں ذرا سی کوتاہی بھی کرتے تو خدا کے ہاں ماخوذ ہوتے، اسی طرح دنیا کے عام انسانوں تک اس ہدایت کو پہنچانے کی نہایت سخت ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر ہم خدا کی عدالت میں واقعی اس بات کی شہادت نہ دے سکے کہ ہم نے تیری ہدایت جو تیرے رسول کے ذریعہ سے ہمیں پہنچی تھی تیرے بندوں تک پہنچا دینے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے تو ہم بہت بُری طرح پکڑے جائیں گے، یہی امامت کا فخر ہمیں وہاں لے ڈوبے گا، ہماری امامت کے دور میں ہماری واقعی کوتاہیوں کے سبب سے خیال اور عمل کی جتنی گمراہیاں دنیا میں پھیلی ہیں اور جتنے فساد اور فتنے خدا کی زمین میں برپا ہوئے ہیں، اُن سب کے لئے ائمۂ شر اور شیاطینِ انس و جن کے ساتھ ساتھ ہم بھی ماخوذ ہوں گے اور ہم سے پوچھا جائے گا کہ جب دنیا میں معصیت ظلم اور گمراہی کا یہ طوفان برپا تھا تو تم کہاں مر گئے تھے؟

[1] یعنی یہ بات کھل جائے کہ جاہلیت کے تعصبات اور خاک و خون کی غلامی میں کون لوگ مبتلا ہیں اور کون ان بندشوں سے آزاد ہو کر حقائق کا صحیح ادراک کرتے ہیں۔ ایک طرف اہلِ عرب اپنے وطنی و نسلی فخر میں مبتلا تھے اور عرب کے کعبہ کو چھوڑ کر باہر کے بیت المقدس کو قبلہ بنانا ان کی اس قوم پرستی کے بت پر ناقابلِ برداشت ضرب تھا۔ دوسری طرف بنی اسرائیل اپنی نسل پرستی کے غرور میں پھنسے ہوئے تھے اور اپنے آبائی قبلہ کے سوا کسی دوسرے قبلہ کو برداشت کرنا ان کے لئے محال تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ بت جن لوگوں کے دلوں میں بسے ہوئے ہوں وہ اُس راستے پر کسی طرح نہ چل سکتے تھے جس کی طرف اللہ کا رسول انھیں بلا رہا تھا۔ اس لئے اللہ نے ان بت پرستوں کو سچے حق پرستوں

(باقی صفحہ آئندہ)

سے فیض یاب تھے۔ اللہ تمہارے اس ایمان کو ہرگز ضائع نہ کرے گا، یقین جانو کہ وہ تم لوگوں کے حق میں نہایت شفیق رحیم ہے۔
یہ تمہارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اُٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں۔ لو ہم اسی قبلہ کی طرف تمہیں پھیرے دیتے ہیں، جسے تم پسند کرتے ہو[۱]۔ مسجد حرام[۲] کی طرف رخ پھیر دو۔ اب جہاں کہیں تم ہو اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو[۳]۔
اور یہ لوگ جنھیں کتاب دی گئی تھی، یہ خوب جانتے ہیں کہ قبلہ بدلنے کا حکم ان کے رب کی طرف سے بالکل بجا ہے مگر اس کے باوجود جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اُس سے غافل نہیں ہے۔ تم اِن کے پاس خواہ کوئی نشانی لے آؤ ممکن نہیں کہ یہ تمہارے قبلہ کی پیروی کرنے لگیں۔ اور نہ تمہارے لیئے یہ ممکن ہے کہ اُن کے قبلہ کی پیروی کرو، کیونکہ ان میں سے کوئی گروہ دوسرے کے قبلہ کی پیروی کے لیے تیار نہیں ہے پھر اگر تم نے اُس علم کے بعد جو تمہارے

بقیہ صفحہ سابق
سے الگ چھانٹ دینے کے لیئے پہلے وہ قبلہ مقرر کیا تاکہ جو لوگ عربیت کے بت کی پرستش کرتے ہیں وہ الگ ہو جائیں پھر اس قبلے کو چھوڑ کر قبلہ بنایا تاکہ جو اسرائیلیت کے پرستار ہیں وہ بھی الگ ہو جائیں اور صرف وہ لوگ رسول کے ساتھ رہ جائیں جو کسی بت کے پرستار نہیں، محض خدا کے پرستار ہیں۔

[۱] نبی صلی اللہ علیہ وسلم تحویل قبلہ کا حکم آنے سے پہلے خود یہ محسوس فرما رہے تھے کہ بنی اسرائیل کی امامت کا دور اور بیت المقدس کی مرکزیت کا زمانہ ختم ہو چکا ہے، اور اب کہ اسلام کی دعوت کا علم بلند کرنے کے لیئے آل یعقوب کے بجائے آلِ اسماعیل میں نبی مبعوث کیا گیا ہے تو اس دعوت کے لئے بیت المقدس کے بجائے کعبہ ہی موزوں مرکز ہو سکتا ہے، اس لئے آپ نہایت بے چینی کے ساتھ تحویل قبلہ کے حکم کا انتظار فرما رہے تھے اسی معاملہ کی طرف یہ آیت اشارہ کر رہی ہے

[۲]۔ حرمت اور عزت والی مسجد اس سے مراد وہ عبادت گاہ ہے جس کے وسط میں خانۂ کعبہ واقع ہے۔

[۳]۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آدمی خواہ دنیا کے کسی کونے میں ہو، اُسے بالکل ناک کی سیدھ میں کعبہ کی طرف رُخ کرنا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرنا ہر وقت ہر شخص کے لئے ہر جگہ مشکل ہے۔ اسی لیے کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے نہ کہ کعبہ کی سیدھ میں۔ قرآن کی رو سے ہم اس بات کے لئے ضرور مکلف ہیں کہ حتی الامکان صحیح سمت کعبہ کی تحقیق کریں مگر اس بات پر مکلف نہیں ہیں کہ ضرور بالکل ہی صحیح سمت معلوم کرلیں۔ جس سمت کے متعلق ہیں امکانی تحقیق سے ظن غالب حاصل ہو جائے کہ یہ سمت کعبہ ہے، اُدھر نماز پڑھنا یقیناً صحیح ہے اور اگر کہیں آدمی کے لئے سمت قبلہ کی تحقیق مشکل ہو یا وہ کسی ایسی حالت میں ہو کہ قبلہ کی طرف اپنی سمت قائم نہ رکھ سکتا ہو (مثلاً ریل یا کشتی میں)، تو جس طرف اسے قبلے کا گمان ہو یا جس طرف رخ کرنا اس کے لئے ممکن ہو اسی طرف وہ نماز پڑھ سکتا ہے۔ البتہ اگر دوران نماز میں صحیح سمت قبلہ معلوم ہو جائے یا صحیح سمت کی طرف نماز پڑھنا ممکن ہو جائے تو نماز کی حالت ہی میں اس طرف پھر جانا چاہیئے۔

پاس آچکا ہے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو یقیناً تمہارا شمار ظالموں میں ہوگا[۱] جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس قبلہ کو ایسا پہچانتے ہیں جیسا اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں[۲]، مگر ان میں سے ایک گروہ جانتے بوجھتے حق کو چھپا رہا ہے۔ یہ قطعی ایک امر حق ہے تمہارے رب کی طرف سے، لہٰذا اس کے متعلق تم ہرگز کسی شک میں نہ پڑو۔

ہر ایک کے لئے ایک رُخ ہے جس کی طرف وہ مُڑتا ہے، تم بھلائیوں کا رُخ لو اور انہی میں دوسروں سے بازی لے جانے کی کوشش کرو جہاں بھی تم ہوگے اللہ تمہیں پالے گا، اس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں۔ تمہارا گذر جس مقام سے بھی ہو وہیں سے اپنا رخ نماز کے وقت مسجدِ حرام کی طرف پھیر دو کیونکہ یہ تمھارے رب کا بالکل برحق فیصلہ ہے اور اللہ تم لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔ اور جہاں سے بھی تمہارا گذر ہو اپنا رخ مسجد حرام کی طرف پھیرو اور جہاں بھی تم ہو اسی طرف منہ کرکے نماز پڑھو، تاکہ لوگوں کو تمہارے خلاف کوئی حجت نہ ملے[۳]

---

[۱] مطلب یہ ہے کہ قبلہ کے متعلق جو حجت و بحث یہ لوگ کرتے ہیں اس کا فیصلہ نہ تو اسی طرح ہوسکتا ہو کہ دلیل سے انھیں مطمئن کر دیا جائے کیونکہ یہ تعصب اور ہٹ دھرمی میں مبتلا ہیں اور کسی دلیل سے بھی اُس قبلہ کو چھوڑ نہیں سکتے جسے یہ اپنے گروہ بندی کے تعصبات کی بنا پر پکڑے ہوئے ہیں۔ اور نہ اس کا فیصلہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ تم ان کے قبلہ کو اختیار کر لو کیونکہ ان کا کوئی ایک قبلہ نہیں ہے جس پر یہ سارے گروہ متفق ہوں اور اسے اختیار کر لینے سے قبلہ کا جھگڑا چک جائے، مختلف گروہوں کے مختلف قبلے ہیں ایک کا قبلہ اختیار کرکے بس ایک ہو گروہ کو راضی کرسکوگے، دوسروں کا جھگڑا بدستور باقی رہے گا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پیغمبر کی حیثیت سے تمہارا یہ کام ہی نہیں ہے کہ تم لوگوں کو راضی کرتے پھرو اور ان سے لین دین کے اصول پر مصالحت کیا کرو، بلکہ تمہارا کام یہ ہے کہ جو علم ہم نے تمہیں دیا ہے سب سے بے پروا ہو کر صرف اسی پر سختی کے ساتھ قائم ہو جاؤ، اس سے ہٹ کر کسی کو راضی کرنے کی فکر کروگے تو اپنے پیغمبری کے منصب پر ظلم کروگے اور اس نعمت کی ناشکری کروگے جو دنیا کا امام بنا کر، ہم نے تمھیں بخشی ہے۔

[۲] یہ عرب کا محاورہ ہے جس چیز کو آدمی یقینی طور پر جانتا ہو اور اس کے متعلق کسی قسم کا شک واشتباہ نہ رکھتا ہو اُسے یوں کہتے ہیں کہ وہ اس چیز کو ایسا پہچانتا ہے جیسا اپنی اولاد کو پہچانتا ہے۔ یعنی جس طرح اسے اپنے بچوں کو پہچاننے میں کوئی اشتباہ نہیں ہوتا اسی طرح وہ بلا کسی شک کے یقینی طور پر یہ بات جانتا ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے علماء حقیقت میں یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ بیت المقدس سے صدیوں پہلے جو گھر اللہ کی عبادت کے لئے تعمیر ہوا تھا اور جسے حضرت ابراہیم کے زمانہ میں قبلۂ اہل حق بنایا گیا تھا وہ یہی کعبہ تھا۔ اس تاریخی واقعہ میں اُن کے لئے ذرہ برابر کسی اشتباہ کی گنجایش نہ تھی۔

[۳] یعنی ہمارے اس حکم کی پوری پابندی کرو، کبھی ایسا نہ ہو کہ تم میں سے کوئی شخص مقررہ سمت کے سوا کسی دوسری سمت کی طرف نماز پڑھتے دیکھا جائے تاکہ کسی کو تم پر یہ اعتراض کرنے کا موقع نہ ملے کہ کیا خوب امت وسط ہے، کیسے اچھے حق پرستی کے گواہ بنے ہیں جو یہ بھی کہتے

لوں جو ظالم ہیں اُن کی زبان کسی حال میں بند نہ ہوگی، تو اُن سے تم نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو ــــ اور اس لیے کہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کردوں[۱] اور اس توقع پر[۲] کہ میرے اس حکم کی پیروی سے تم اسی طرح فلاح کا راستہ پاؤ گے جس طرح میں نے تمھارے درمیان خود تم میں سے ایک رسول بھیجا اور وہ تمھیں میری آیات سناتا ہے، تمھاری زندگیوں کو سنوارتا ہے تمھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمھیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہ جانتے تھے۔ لہٰذا تم مجھے یاد رکھو، میں تمھیں یاد رکھوں گا، اور میرا شکر ادا کرو، کفرانِ نعمت نہ کرو۔

جانتے ہیں کہ یہ حکم ہمارے رب کی طرف سے آیا ہے اور پھر اس کی خلاف ورزی بھی کیے جاتے ہیں۔

[۱] نعمت سے مراد وہی امامت و پیشوائی کی نعمت ہے جو بنی اسرائیل سے سلب کرکے اِس اُمت کو دی گئی۔ دنیا میں ایک امت کی راست روی کا یہ انتہائی ثمرہ ہے کہ وہ اللہ کے امر تشریعی سے اقوامِ عالم کی رہنما و پیشوا بنائی جائے اور نوعِ انسانی کو خدا پرستی اور نیکی کے راستے پر چلانے کی خدمت اس کے سپرد کی جائے۔ یہ منصب جس امت کو دیا گیا، حقیقت میں اُس پر اللہ کے فضل وانعام کی تکمیل ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ یہاں یہ فرما رہا ہے کہ تحویلِ قبلہ کا یہ حکم دراصل اس منصب پر تمہاری سرفرازی کا نشان ہے، لہٰذا تمہیں اس لئے بھی اس حکم کی پیروی کرنی چاہیئے کہ ناشکری و نافرمانی کرنے سے کہیں یہ منصب تم سے چھین نہ لیا جائے۔ اس کی پیروی کروگے تو یہ نعمت تم پر مکمل کردی جائے گی۔

[۲] یعنی اس حکم کی پیروی کرتے ہوئے یہ امید رکھو ــــ یہ شاہانہ اندازِ بیان ہے، بادشاہ کا اپنی شانِ بے نیازی کے ساتھ کسی نوکر سے یہ کہہ دینا کہ فلاں عنایت و مہربانی کی اُمید رکھو۔ اس بات کے لئے بالکل کافی ہوتا ہے کہ وہ اپنے گھر خوشی کے شادیانے بجوادے اور اسے مبارکبادیاں دی جانے لگیں۔

شعر کا پیغام مسلمان کے نام

محبوب الرحمٰن اکمل یزدانی

پیدا جو مسلماں پھر تجھ میں وہ جذبۂ ایماں ہو جائے
معدوم جہاں سے ظلمت ہو اسلام درخشاں ہو جائے

تو ابرِ بہاراں ہے چھا جا پھر اُٹھ کے فضائے عالم پہ
ہر ذرّہ چمن کا جھوم اُٹھے ہر خار گلستاں ہو جائے

تہذیب کے دعویداروں نے دنیا کو جہنّم کر ڈالا
"تو بڑھ کے پلٹ دے یوں نقشہ جنّت بھی پشیماں ہو جائے"

(پریشاں)

ہے تیرے ارادے کے آگے ہاں ہیچ اٹومی طاقت بھی
تو اس کو اگر محکم کر لے ہر مشکل آساں ہو جائے

بیٹھے ہیں تیرے من مندر میں بت لاکھوں نفس پرستی کے
لازم ہے کہ ان کو توڑ کے تو ملت کا نگہباں ہو جائے

کر عدل کے قانوں پھر جاری اخلاق کو اپنے وسعت دے
ہو اس پہ عمل پیرا تو اگر عالم کا نگہباں ہو جائے

اک ہاتھ میں گر حکمت ہو تیرے اک ہاتھ میں مشعلِ قرآں کی
اے ننگِ سلف تو پھر تیرے ہر درد کا درماں ہو جائے

اب سامنے تیرے اے مسلم لے دیکھ یہی دو رستے ہیں
یا شامِ غریباں ہو جائے یا صبحِ بہاراں ہو جائے

سماجی انقلاب

جناب انور اعظمی

(۲)

تیسرا گروہ اور اس کا رجحان

تیسرے گروہ نے اسی کے ساتھ ساتھ صدا لگائی کہ یہ انقلاب اور تغیر کا شور مچانا تو درکنار اس کے خیال کا ذہن کے اندر پیدا ہونا بھی طوفان بدتمیزی ہے بے غیرتی کا جھگڑا ہے، اس لئے کہ معاشرت یا سماج کے اندر تبدیلی پیدا ہی نہیں ہوتی بلکہ جس حالت میں سماج برپا ہو وہی حالت بہتر ہے انسب ہے۔

اس گروہ کے پاس نہ کوئی عقلی دلیل ہے نہ کتابی حجت بلکہ اس گروہ کی زیادہ زور دار دلیل اس کے بلند بانگ دعاوی ہیں۔ اس لئے کہ اگر یہ گروہ خود اس مسئلہ پر کبھی سنجیدگی سے غور کرتا تو اس کو بادنیٰ تفکر یہ بات معلوم ہو جاتی کہ جس سماج کے پیچھے وہ آج جان دینے کو تیار ہے یہ بھی چند صدی پیشتر موجود نہ تھا اور اگر معاشرہ انقلاب سے متاثر نہیں ہوتا تو اس کا موجودہ معیار تک پہونچنا امر محال تھا اور انسان ابھی تک اسی وحشت کدہ میں آباد ہوتا جس میں کہ وہ دنیا کے تاریک ترین دور میں آباد رہنے پر مجبور رہا ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ گروہ جان بوجھ کر اس قدر عظیم الشان اور اس قدر واضح ترین تاریخی حقیقت سے اپنے کو نابلد کیوں ٹھہرا رہا ہے۔ اس کا آسان اور درست جواب یہ ہے کہ سماج کی نئی کروٹ ہے ــــ جس سے اندیشہ ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ برپا شدہ سماجی نظام برباد ہو جائے گا ــــ یہ گروہ شدید طور پر متاثر ہوتا ہے اور اس انقلابی طوفان کی روک تھام گھبراہٹ میں عقلی دلائل اور کتابی حجتوں کے بجائے جذبات و احساسات کے ابھار کے بندھے کرنا چاہتا ہے اور سمجھ بوجھ کر بھی عوام الناس کو فریب ــــ میں مبتلا رکھنا چاہتا ہے دھمکاتا ہے کہ انقلابی طوفان سے باپ دادا کے بتلائے ہوئے قاعدے فنا ہو کر رہ جائیں گے اس دعویٰ کو وہ غلط تاریخی روایات اور اندھی رسمی محبت کو ابھار ابھار کر موثق کرتا رہتا ہے اور اس گروہ کو جو سماج کو نئی بنیادوں پر برپا کرنے کا داعی ہوتا ہے، شوریدہ سر، بدتمیز، بے غیرت، ناخلف اور نہ جانے کن کن ناموں سے پکارتا ہے تاکہ عوام الناس میں ان کی قائم شدہ عظمت کو ٹھیس لگنے پائے

چوتھا گروہ اور اس کا تصور

چوتھی جماعت نے ان تمام افکار و خیالات کی ایک ہی ساتھ سخت انداز میں تردید کی اور اس نے کہا کہ تیسرا گروہ محض اپنی جمائی ہوئی سلطنت کو باقی رکھنا چاہتا ہے اس لئے اس کی پوری تقریر برہان اور دلیل سے خالی ہے، رہ گیا پہلا اور دوسرا گروہ تو ان کی باتوں پر غور سے توجہ کرنے

ضرورت ہے، کیوں کہ ان گروہوں کے افکار غلط ہوں یا صحیح لیکن کوئی نہ کوئی عقلی دلیل ـــــ خواہ وہ اپنی جگہ پر
اتی ہی کیوں نہ ہو ـــــ رکھتے ضرور ہیں۔ اور ایک اچھی خاصی جماعت اس آواز کی ہم نوائی بھی پورے زور
در کے ساتھ کر رہی ہے۔

پہلے گروہ نے معاشرتی انقلاب کی جو توجیہ کی ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کی فطری حریت پسندی کے یہ تمام کارنامے
، مگر انسان کی بے قید حریت پسندی اور بے لگام خواہشات کے ہوتے ہوئے یہ ناممکن ہے کہ کوئی سماج بھی انسان کو مطمئن
سکے، انسان کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی خواہشات اور رجحانات کا کوئی صحیح اندازہ تکمیل نہیں لگا سکتا، مثال کے طور پر روپیہ اور
راد کی خواہش کو لے لیجئے اس خواہش کے لئے انسان کوئی حد نہیں متعین کر سکتا کہ کتنے سرمایہ یا کتنی اراضی کے بعد وہ نفع اندوزی
یا باز آجائے گا، ذاتی اقتدار پسندی، قومی علو و عروج کی خواہش کبھی ختم نہیں ہو سکتی، اس لئے جماعتی نظام ـــ معاشرتی
بطہ ـــ سے کسی فرد کا ہر حال میں مطمئن ہونا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ ہر فرد کو من مانی کارروائی کی اجازت
ے دی جائے اور اس کلیہ کو تسلیم کر لیا جائے کہ انسان کو اجتماعیت کی کوئی ضرورت نہیں اور انسان مختلف اوقات میں
لف قسموں کی معاشرت کو اختیار کرتا رہا ہے اور ایک لمبی اور قابل لحاظ مدت تک اس نے اپنے سماج سے دلچسپی اور محبت
بھی ثبوت دیا ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ یہ کہ انسان کی فطری حریت پسندی اسے بے چین رکھتی ہے یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے اس لئے کہ
دور میں قابل لحاظ زمانہ تک انسان ایک معاشرت سے مطمئن رہا ہے اور اس وقت تک جب تک کہ خود اپنے ہی
ہاتھوں ایک ہلاکت اپنے اوپر مسلط نہیں کر لی ہے، برپا شدہ نظام معاشرت سے کسی فرد کو کوئی شکایت نہیں ہوئی ہے، اس لئے
بے قید حریت پسندی کو انقلاب کا سبب بتلانا تاریخ اور کائنات کی پھیلی ہوئی حکایتوں سے مجرمانہ چشم پوشی ہے۔

دوسرا گروہ جس نے نئی معاشی دریافت اور جدید مشینی پیداوار کو انقلاب کا سبب ٹھہرایا ہے یہ خیال بھی سراسر تاریخی
واقعات سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ یا تو یہ بات ہو کہ جان بوجھ کر تاریخ کو جھٹلایا گیا ہے یا اپنے دل کو مطمئن کرنے کے لئے
تاریخی صداقتوں کی تاویل کر لی گئی ہے۔ ہر ایک صورت میں انسانی انصاف پسندی اس کو جرم سمجھتی ہے اس لئے کہ دنیا
کے بے شمار سماج اس طرح نمودار ہوئے ہیں کہ ان کے پیچھے نہ تو کوئی معاشی محرک رہا ہے اور نہ کوئی نئی مشینی پیداوار، جیسے کہ
ہندوستان کے اندر بدھ سماج جین مت۔ منوسمرتی کی معاشرت، ویدک فلسفہ کا معاشرہ وغیرہ اسی طرح۔ وسط ایشیا میں رہنے
والے بے شمار سماج مثلاً زرتشت کی تعلیمات کا سماج۔ چین کے مشہور مصلح کے خیالات کا معاشرہ وغیرہ ان میں سے کس کے
متعلق کہا جا سکتا ہے کہ کسی نئی مشینی پیداوار نے ان کو جنم دیا تھا اور بالفرض اگر اس کا دعویٰ کیا بھی جائے تو یہ تاریخی حقائق سے الٹا
گریز ہے۔

نئی مشینی پیداوار اور جدید معاشی دریافت کا اثر کئی صدیوں کے بعد ہوتا ہے بے شمار سال اور ان گنت برس گذر جاتے ہیں تب ایک نئی دریافت سامنے آتی ہے، اس لئے سماج کو بھی اسی کے مطابق کروٹ بدلنی چاہیئے تھی لیکن بارہا ایسا ہوا ہے کہ چند سالوں کے وقفہ کے بعد دوسرا سماج ابھرا ہے اور اس نے پہلے سے قائم شدہ سماج کو تہس نہس کر کے رکھ دیا ہے۔

اس مختصر تنقیح اور بحث کے بعد اس دوسرے گروہ کی بھی تائید اور ہم نوائی کرنا انسانوں کے لئے جس قدر توہین کا باعث ہے اسی قدر انسانیت کے لئے مہلک بھی ہے۔ ہم اب آگے اس چوتھے گروہ کی وہ بنیادی توجیہ سامنے لائیں گے، جس کو سامنے رکھ کر معاشرتی انقلاب کے صحیح اسباب و وجوہ کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔

تصور فلاح — ایک اصولی بحث

کوئی انسان اس وقت تک کسی کام کے کرنے کا ارادہ نہیں کرتا جب تک کہ اسے اس کا یقین نہ ہو کہ وہ جس کام کو کر رہا ہے اس میں کامیاب ہوگا یا کافی حد تک کامیابی کا امکان ہے، اسی بنیاد پر کھلے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ اگر کامیابی کا تصور نہ ہو تو کوئی انسان ہاتھ پیر کو حرکت دینے کی زحمت نہ گوارا کرے، فرض کیجئے کہ ایک شخص تجارت کرتا ہے۔ وہ تجارت میں اپنا سرمایہ اپنی دماغی توجہ اسی لئے صرف کرتا ہے کہ اسے اس کا یقین ہوتا ہے کہ آج کا لگایا ہوا ایک پیسہ کل روپیہ کی شکل اختیار کرلے گا۔ ایک کاشتکار کھیتی کے پیچھے اپنی ساری طاقت اسی لئے برباد کرتا ہے کہ اسے یہ صاف نظر آتا ہے کہ کھیتی میں آج کا ڈالا ہوا بیج کل خوشوں اور خرمنوں کی صورت میں نمود کرے گا۔ اگر ایک تاجر اور ایک کاشتکار کو اس کامیابی کا یقین نہ ہو تو کسی کے اندر اس محنت مشقت اور اس زحمت و دردسری کے گوارا کرنے کی جرأت کا پیدا ہونا محال ہے۔

پیٹ کا مسئلہ ایک مستقل مسئلہ ہے لیکن آگے بڑھنے سے پہلے یہیں ایک بات سمجھتے چلئے۔ یہ اپنی حد تک صحیح ہے کہ بھوکے پیٹ روٹی کی ضرورت ہے لیکن روٹی حاصل کرنے کی مختلف صورتیں ہیں، جس کو جس راستہ سے روٹی ملنے کا زیادہ احتمال ہوتا ہے وہ اس راستہ کو اختیار کرتا ہے، یہ ناممکن ہے کہ ہر ایک فرد ایک ہی وسیلہ معیشت کو اختیار کرے اور پھر اپنی زندگی کی تمام ضرورتوں کو بھی اسی ایک سے پورا کرے، اسی لئے کوئی شخص تجارت کو معاش کے لئے اختیار کرتا ہے کیونکہ اسے اس میں کامیابی کا زیادہ امکان نظر آتا ہے۔ دوسرا شخص زراعت کو اپنے لئے منتخب کرتا اس لئے کہ اسے بقیہ اور وسائل معاش کے مقابلہ زراعت میں زیادہ کامیاب رہنے کا یقین ہوتا ہے۔ صنعت، دستکاری، تصنیف، تدریس، ان تمام میں سے ہر شغلہ اپنی جاذبیت رکھتا ہے مگر ان میں سے انسان ایک ہی کو اختیار کرتا ہے اور اختیار اسی کو کرتا ہے جس میں اسے زیادہ کامیابی کی توقع ہوتی ہے، اور جس پیشہ کے بارے میں وہ سمجھتا ہے کہ اس پیشہ کو اس کے قویٰ زیادہ خوبصورتی کے ساتھ انجام دے سکتے ہیں،

یہ احساس فلاح جس سے متاثر ہوکر انسان حیات کی مختلف راہوں کو بے جھجک اختیار کرتا ہے فطری طور پر ہر حیوان کے اندر موجود ہے، عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ وحشی جانور اسی طرف لپکتے ہیں جدھر انھیں کامیابی نظر آتی ہے، ایک جنگل کا جانور جس کو نہ کوئی سکھانے والا ہوتا ہے اور نہ نفع نقصان سمجھانے والا وہ بھی اپنے آذوقہ کی اور اپنے رہنے سہنے کے لئے جگہ کی تلاش کرتا رہتا ہے اور جو جگہ اسے ان تمام لحاظ سے ٹھیک معلوم ہوتی ہے وہیں رہ پڑتا ہے اور جہاں کہیں بھی اسے اس کا احساس ہوا کہ یہ جگہ اس کے لئے خطرناک ہے تو وہ اس کو فوراً چھوڑ دیتا ہے۔

ہر کجا چشمہ بود شیریں مردم و مور و مرغ گرد آیند

اس تفصیل کے بعد اب مزید تشریح کی ضرورت نہیں، آپ اپنے گرد وپیش کے حالات کا جائزہ لیجئے، آپ کے گھروں کے جانوروں کی روزمرہ زندگی میں بے شمار واقعات اسی حقیقت کے آئینہ دار ملیں گے پھر بھی چونکہ جانوروں کی ضروریات مختصر اور محدود ہیں ــــ کیونکہ جانوروں کو زندگی کے صرف ایک ہی رخ سے واسطہ پڑتا ہے اور نمو و ترقی کا احساس جو کہ صرف انسانوں ہی کی نوع کے لئے مخصوص ہے اس سے انھیں دور کا بھی علاقہ نہیں ہوتا ــــ اس لئے یہ احساس بھی اس قدر خفی اور مجہول ہے کہ بغیر غور و فکر کے اس کا سمجھ پانا کچھ دشوار ہی ہے۔

خیال کیجئے کہ اس تصور فلاح کا اثر زندگی کی ہماہمی پر کتنا شدید پڑتا ہے ؟ اگر یہ احساس اور تصور نہ ہو تو بازاروں میں تاجروں کی دوڑ دھوپ، کھیتوں میں کاشتکاروں کی محنت و مشقت، ملکوں میں لیڈروں کی جدوجہد، عوام کا جوش و خروش تمام کا تمام ماند پڑ جائے، اور دنیا کی تمام دلکشی اور جاذبیت جو صرف اس ہماہمی اور سرگرمی سے قائم ہے یک لخت ختم ہو جائے، پھر نہ تو خاندان کی ضرورت ہے نہ گردو اور ملک کی، قیادت اور رہنمائی ایک بے معنی لفظ اور تحریر و تقریر ایک بیکار شغل کی حیثیت اختیار کرے۔ زندگی کہلائی ہی نہیں جا سکتی جب تک کہ زندگی کے اندر مسلسل حرکت اور پیہم جنبش نہ ہو اور صاف بات ہے کہ حرکت اسی تصور فلاح کی مرہون منت ہے۔

کامیابی کیا ہے؟

انسان کامیاب ہونا چاہتا ہے کامیابی کی تعریف اگر مختصر لفظوں میں کی جائے تو وہ یہ ہے کہ ہر وہ چیز جسے انسان چاہتا ہے، جس کی جستجو اور طلب میں مشقتوں اور محنتوں کو برداشت کرتا ہے۔ اسے اگر پا جائے تو وہ کامیاب ہے، اور جب اپنے مطلوب اور محبوب نتائج سے ناامید ہو جائے تو وہ ناکامیاب ہے ایک کاشتکار اس صورت میں کامیاب کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی کھیتی سے وہ کچھ اور اتنا کچھ حاصل کرے جو کچھ اور جتنا کچھ وہ چاہتا ہے، ایک وطن پرست کامیاب اس وقت ہے جب وہ اپنے ملک کو غیروں کی غلامی سے آزاد کرلے اور اس آزادی کے بخشے ہوئے فائدوں سے متمتع ہوے، اسی طرح ہر انسان جب اپنی خواہشات کی تکمیل کی صورت پیدا کر کے پوری طرح نفع اٹھالے تو وہ کامیاب ہے ورنہ ناکامیاب۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ خواہش جائز ہے یا ناجائز، یعنی انسان دنیا کے اند

اپنے رجحان کو کامیاب دیکھنا چاہتا ہے خواہ وہ رجحان غلط ہو یا صحیح، اور وہ اس کی تکمیل کی صورت میں ہر راہ اختیار کرے گا خواہ وہ فطری ہو یا غیر فطری، اس اصول کو سامنے رکھ کر دنیا کے حالات پر نگاہ ڈالئے تو واقعات شدید طور پر ہم آہنگ نظر آئیں گے،

انسان کی دنیاوی کامیابی

انسان کو دنیا کے اندر بے شمار سامانوں کی ضرورت پیش آتی ہے اس لئے دنیاوی طور پر کامیاب انسان وہی ہے جسے تمام سامان زندگی میسر ہوں، یا ہر وہ چیز جس کا انسان دنیا کے اندر رہ کر خواہش مند ہوتا ہے اسے پالے، خواہشات و ضروریات میں تمام وہ احساسات ہو سکتے ہیں جو انسان کے دل میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہتے ہیں، مثلاً، سرمایہ، عزت، شہرت، علوپسندی، قوت، جلال سب کچھ اس کے ضمن میں آسکتا ہے، اگر یہی کامیابی ہے تو انسان کو دنیا میں کامیاب زندگی بسر کرنے کے لئے، خویش واقارب، دوست واحباب، اعوان وانصار کی ضرورت بھی پیش آتی ہے، اور سرمایہ، جان، عزت، آبرو کے حفاظت کی حاجت ہوتی ہے۔ ہمدردی اور بھائی چارگی کے لئے ہمسایہ کا سہارا لینا پڑتا ہے اور جب تک یہ تمام اسباب ووسائل موجود نہ ہوں اس وقت تک انسان دنیاوی نقطۂ نظر سے بھی کامیاب نہیں کہا جاسکتا۔

انسان اپنی دنیاوی زندگی میں سکون وآرام کا خواہش مند ہوتا ہے، تسکین واطمینان و فارغ البالی ڈھونڈھتا ہے۔ مزدور سے لے کر سرمایہ دار تک، عوام سے لے کر لیڈر تک فقیر سے لے کر بادشاہ تک تمام کے تمام اُسی کوشش میں رہتے ہیں کہ انہیں سکون وآرام ملے۔ دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لئے کسی زحمت اور دشواری کا سامنا نہ ہو، سرمایہ کی فراہمی کا بھی واقعاتی سبب یہی ہوتا ہے کسی لیڈر کی قیادت (Leader Ship) پر اعتماد کی بھی حقیقی وجہ یہی ہوتی ہے۔ بادشاہ اور حاکم کی اطاعت پر جو جذبہ انسان کو ابھارتا ہے وہ یہی ہے کہ انسان کو ان تمام صورتوں میں اپنے آرام وسکون کے حصول کی آسان ترین اور واضح ترین شکل نظر آتی ہے، بچہ کی نگہداشت، پڑوسی پر اپنی مہربانی کا اظہار، بیوی سے الفت ومحبت کا اقرار، ماں باپ سے احترام کا سلوک انسان صرف اسی لئے کرتا ہے کہ اسے یہ تمام ذریعے آرام وسکون، عزت وناموری، قوت وجلال کے سبب نظر آتے ہیں۔

اس بحث کی روشنی میں انسان کو دنیا کے اندر کامیاب ہونے کے لئے ضروری ہے کہ دن کی تھکا دینے والی جدوجہد میں آرام اور سکون پہونچانے والا خاندان ہو، بڑھاپے میں ضعیفی کا سہارا بننے کے لئے جوان لڑکے ہوں بچپن کی بے بس زندگی میں ماں باپ کا مربیانہ: در مشفقانہ ہاتھ ہو۔ پیٹ کے لئے غلہ کا انتظام ہو، تن کے لئے کپڑے کا بندوبست ہو، دماغ اور دل کے لئے سکون اور اطمینان کے اسباب ہوں، رات کی تاریکی میں اس کے سرمایہ، اس کے مال واسباب کی حفاظت کے لئے حکومت کے مسلح کارندے ہوں، جان اور آبرو کی نگہداشت کے لئے حکومت کا بے لاگ اور نفع بخش قانون ہو۔ اگر یہ تمام اسباب اور وسائل مہیا ہیں اور ان سے کوئی انسان پوری طرح فائدہ اٹھا رہا ہے تو اسی کو دنیاوی حیثیت سے کامیاب کہا جاسکتا ہے،

تصور فلاح کا اثر سماجی انقلاب پر

اس تمہید کے بعد یہ بات خود بخود نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ سماج کے اندر جو انقلابات آتے رہتے ہیں اور آتے رہیں گے اس کا واحد سبب کیا ہے؟

جب دیکھتا ہے کہ برپا شدہ نظام معاشرت سے اس کو پورا فائدہ نہیں پہونچ رہا ہے تو وہ تڑپ اٹھتا ہے اور اپنے ہم خیال افراد ـــــ وہ لوگ جو اسی کی طرح برپا شدہ سماجی نظام سے غیر مطمئن ہوتے ہیں ـــــ کا تھوڑے ہی دنوں میں ایک گروہ اکٹھا کر لیتا ہے، اکٹھا کرنے میں اسے چنداں دقت نہیں پیش آتی اس لئے کہ جس طرح وہ سماجی نظام کا ستایا ہوا ہوتا ہے اسی طرح دوسرے افراد بھی ہوتے ہیں جو کسے منتظر ہوتے ہیں کہ کوئی آواز اٹھے جس پر وہ لبیک کہیں، اب جس گوشہ سے یہ آواز اٹھتی ہے اور کچھ ان کے حالات سے مطابقت رکھتی ہے وہ بے تکلف اس کی طرف جھک پڑتے ہیں اور جمع ہونے والے قطرے ایک طوفان بن کر سماج پر چھا جاتے ہیں جس کا روک آج تک کوئی دیوار نہیں بن سکی۔

سماج کے ستائے ہوئے افراد اپنے سماج سے اس قدر بیزار ہوتے ہیں کہ انھیں اس سے بحث نہیں ہوتی کہ انھوں نے برپا شدہ سماج کے خلاف جو راستہ اختیار کیا ہے وہ صحیح ہے یا غلط، وہ فائدہ بخش ذریعہ ہے یا ضرر رساں، اس لئے کہ وہ سماج کے غیر مفید اور تکلیف دہ قوانین و ضوابط سے اس قدر بیزار اور جلے ہوئے ہوتے ہیں کہ انھیں اپنے گرد و پیش کے سماج سے دشمنی ہو جاتی ہے اور جس طرح کا سلوک انسان جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے دشمن سے کرتا ہے ویسا ہی سلوک یہ ستائے ہوئے افراد اپنے سماج سے کرگذرنا چاہتے ہیں یہی وجہ ہوتی ہے کہ سماج کے خلاف اٹھی ہوئی آواز کو عوام اور بلند کرتے ہیں اور اپنی پوری قوت صرف کر دیتے ہیں کہ موجودہ سماج برباد اور تہس نہس ہو کر رہ جائے اور اس کے منحوس نشانات تک کا وجود نہ باقی رہ جائے،

ایک حقیقت

لیکن جس طرح انسان ہر حالت میں بھوک اور برہنگی کا احساس کرتا ہے اسی طرح یہ بھی ایک نکھری ہوئی حقیقت ہے کہ وہ بھلائی اور نیکی کے کاموں کا ـــــ جو انسان کے اندر فطرتاً موجود ہیں ـــــ احساس کرے، اور ہر قسم کی معاشرت، ہر رنگ کے سماج کے اندر ان کی تلاش کرے، اسی لئے کوئی بھی معاشرت آج تک اس قسم کی نہیں پائی گئی جس میں فطری بھلائیوں کو جگہ نہ دی گئی ہو، مگر ہمیں ایک بات اور واضح کرنی ہے کہ رحم و ہمدردی، خودداری، اور عزت نفس، عزم اور احتیاط، توکل، اور بھروسہ، یہ تمام بنیادی فضائل اور محاسن سماجی بنیاد کی وسعت اور تنگی کے ساتھ پھیلتے اور سمٹتے رہتے ہیں اگر کسی سماج کی بنیاد خاندان پر رکھی گئی ہے تو ان اخلاقیات کی جملہ توجہات خاندان ہی تک محدود رہیں گی گروہی زندگی کا بھی یہی حال ہے۔ ملک و وطن کی بنیاد بھی رحم و ہمدردی، صلح پسندی اور عافیت کوشی، حزم و احتیاط، عزت نفس اور خودداری وغیرہ کو اپنے حدود کے باہر گوارا نہیں کرتی، قومیت، نسلیت، لونیت کی بنیاد پر قائم کی ہوئی سماج کا بھی اسی اصول پر اندازہ لگا لیجئے۔

اسی لئے ہر نئی معاشرت اس پر مجبور ہے کہ ان بنیادی اخلاقیات کو وہ جوں کا توں برپا شدہ نظام معاشرت سے لے اور اس کو اپنی بنیاد کے اعتبار سے یا تو محصور کر دے یا وسیع کر دے۔ مثال کے طور پر ہمدردی کو لے لیجئے، جب انسان نے خاندان پر سماج کی بنیاد رکھی تھی تو ہمدردی کے جذبات کو صرف خاندان ہی تک محدود کر لیا تھا، اس کے بعد جب گروہ بندی نے قدم بڑھایا تو ہمدردی پھیل کر

گروہ تک پہونچ گئی "مذہب" نے بھی یہی کچھ کیا، نام نہاد "مذہب" کے بعد جمہوریت نے جنم لیا تو اس نے ہمدردی کے جذبات کو جمہور تک وسیع کرادیا، اس کے بعد مزدور اور سرمایہ دار کی آویزش اور جنگ کی بنیاد پر جو سماج پیدا ہوا ہے اس نے ہمدردی کے دروازوں کو مزدور طبقہ پر کھول کر انسانی جماعت کے دوسرے گروہوں پر بند کر رکھا ہے۔

انسان کسی صورت سے بھی اپنے فطری فضائل اور محاسن سے بے پروا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اگر وہ انھیں کھودے تو پھر اجتماعیت پسندی جو انسانی گروہ کی ممتاز صفت ہے ختم ہو کر رہ جاتی ہے، اب یہ انسان کی توفیق پر ہے کہ چاہے تو اسے اس بنیاد پر رکھے جس سے کہ ہر فرد اپنی اپنی جگہ پر فائدہ اٹھائے اور چاہے تو اتنا محدود کر دے کہ خود اسی کی ذات بھی اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔

عنوان کی طرف رجوع

اس تقریر کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ انسان کی فلاح پسندی اسے مجبور رکھتی ہے کہ وہ بہتر سے بہتر معاشرت کی تلاش میں سرگرداں رہے، اسی تصورِ فلاح نے انسان کی کبھی خاندانی نظامِ معاشرت کی طرف رہنمائی کی، کبھی ملوکیت اور مذہبیت کی طرف اور کبھی جمہوریت اور آمریت کی طرف لے گیا اور کبھی اشتراکیت اور انفرادیت کی طرف اور اس کے علاوہ کسی دوسرے جذبہ کو یا کسی خارجی موثر کو معاشرتی انقلاب کے اندر موثر سمجھنا سماجی نظام کی مزاج فہمی کی طرف سے جہالت کا ثبوت دینا ہے فطری حریت پسندی، اور کوئی نئی مشینی "پیداوار"، تو سطحی جذبات یا بہت دور کے خارجی موثرات سے ہیں، ان کو کوئی مستقل حیثیت نہیں دی جاسکتی، اس لئے کہ انسان کو حریت اور آزادی پسندی اس لئے آتی ہے کہ اسے ایک حد تک اپنی کامیاب زندگی جھلکتی نظر آتی ہے، اسی طرح "نئی مشینی پیداوار" کے بعد انسانوں کا بے چین ہو کر سماجی بنیادوں کا اکھیڑ پھینکنا ہی اس حقیقت کو اجاگر کر رہا ہے کہ اس "نئی مشینی پیداوار" نے ان کو زندگی کی بھاگ دوڑ میں ناکامیاب کر دیا ہے، جس کے احساس سے وہ بیتاب ہو کر سماج کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر بیٹھے ہیں۔

اس تصورِ فلاح ہی کی کارفرمائی ہے کہ انسان کسی ایسے راستہ کو، ایسے فکر کو، ایسی معاشرت کو برداشت نہیں کر سکتا جس میں اس کا نقصان نظر آتا ہو، اور اس سے اسے کسی فائدہ کے پہونچنے کی توقع نہ ہو۔

آخری بات

تقریر کے آخر میں اس کی طرف بھی اشارہ خود بخود ہوتا ہے کہ جو معاشرت ان بنیادوں پر قائم ہو گی جن سے انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی بحال رہے اور سدھر سکے، زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھایا جا سکے، حقیقتاً وہی معاشرت ہو سکتی ہے جو انسان کی اس ذہنی بے چینی اور فکری اضطراب کو دور کر سکے اور اس سماج کے اندر انسان محسوس کر سکتا ہے کہ یہ ہے وہ منزل جس کی طرف آج تک وہ سرگرم سفر رہا ہے۔[1]

---

[1] اس مضمون میں کامیاب زندگی کا جو تصور فاضل مضمون نگار نے پیش کیا ہے۔ اُس کے محض خوبیوں کے پہلو پر نظر ڈالی ہے اور برائیوں کا پہلو اُن کے قلم سے صاف بچ کر نکل گیا ہے۔ حالانکہ دنیاوی کامیابی کا تصور حسن و قبح کے دونوں گوشے اپنے اندر رکھتا ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ جب انسان صرف دنیا چاہتا ہے تو اُسے دنیا ملتی تو ہے مگر بہت تھوڑے عرصے کے لئے اور سینکڑوں برائیوں کو جلو میں لئے ہوئے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا برائے دنیا کا اصول بالکلیہ غلط ہے۔ البتہ اگر انسان دنیا برائے آخرت کا اسلامی تصور اختیار کرے تو اُس کو دنیا بھی ملتی ہے اور آخرت بھی۔ اسی طرح مضمون نگار نے مذہب کے جاہلی تصور پر تو ضرب لگائی ہے لیکن مذہب کے حقیقی تصور "اسلام" کو پیش نہیں کیا جس سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید دیگر مذاہب کی طرح "اسلام" بھی کامیاب سماجی انقلاب برپا کرنے میں ناکام رہا، حالانکہ واقعہ اس کے برعکس ہے۔ (انوار)

محسوسات

انور اعظمی

کیا جانئے کیا ہو گیا ارباب نظر کو
تاروں کی جھلک دیکھ بھلا بیٹھے سحر کو

یہ طور کے جلوے، مہ و خورشید یہ افلاک
کچھ اور کی خواہش ہے مرے ذوق نظر کو

اب ڈھونڈھا کریں روندے ہوئے دیر و کلیسا
رشوق نے کھینچا در کعبہ کے سفر کو

کیا چیز ہے غیرت یہ بتاؤں تمہیں کیوں کر
برہان کی حاجت نہیں ہوتی ہے سحر کو

ہے اپنا تو پھر لالۂ افرنگ سے بہتر
سینے سے لگاتا ہوں میں نالوں کے شرر کو

اے حسرت بیتابی غم یہ تو بتاؤ
وہ کیسی دعا جو کہ ترستی ہو اثر کو

بس ہے کہ دل تیرگی شب نہیں لرزاں
بیکار سمجھتا ہوں میں اس آہ سحر کو

برباد ہوا دہر میں وہ رند کہ جس نے
پہچانا نہیں ساقی مغرب کی نظر کو

بے جا بچے ہوئے سر کو نہیں ملتا ہے اکلیل
رتا ہے جدا قطروں سے طوفان گہر کو

مٹ جاتی ہے وہ قوم جو صالح نہیں ہوتی
کٹتے ہیں درخت دیتے ہیں جب تلخ ثمر کو

دریوزہ گرو! کیا تمہیں اس کی بھی خبر ہے
بیکار صدف ہے جو گنوا بیٹھے گہر کو

تیاری

اصغر علی عابدی

راج پاٹ سب کچھ تج کر
انگ انگ میں پُن بسا کر

آ پریم نگر کو جائیں
وہاں من کا راج رچائیں

دریا ترتی ناؤ کو چھیڑے
کھیون ہارے بھول تھپیڑے
کیوں انگ انگ میں پاپ بسایا
کیوں راج پاٹ سے دکھ پایا؟

راج پاٹ سب تج کر
گیان دھیان میں بس کر
آ پریم نگر کو جائیں
وہاں من کا راج رچائیں

ہیں چھوٹے تیرے ہاتھ
کلائی مڑ نہ جائے دیکھ
بھاری جیون بے سہارا
نیا ہوئی ہے بے کنارا

اب کیوں پریم نگر کو جائیں؟
اور کیوں من کا راج رچائیں؟

بھول جا دنیا تجھے بھلائے
کہیں سپنے کی بات پر آئے
راج پاٹ سب کچھ تج کر
انگ انگ میں پن بسا کر

آ پریم نگر کو جائیں
وہاں من کا راج رچائیں
ایشور کا راج سجائیں!!

افسانہ تحریک اسلامی کے ادب میں

از:- سید اصغر علی عابدی

افسانہ کیا ہے اور کس طرح لکھا جاتا ہے، اس پر تو ماضی میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور حال کے صفحات پر بھی اکثر اہل قلم اپنی جولانی طبع کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ لیکن ان سطور میں جس قسم کے افسانے کا ذکر میں کرنا چاہتا ہوں، اس سے ہماری علمی اور ادبی دنیا کا ایک بڑا حصہ ابھی تک ناآشنا ہے۔ یا اگر آشنا ہے بھی تو اس قدر انجان ہے جیسے کوئی سانپ سونگھا ہوا انسان بستر پر دراز ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ معنی خیز یا بے معنی بے خبری جو کچھ بھی یہ ہو اب ختم ہو جائے اور اس کے برخلاف ایک ہوشمندانہ حق آگاہی اور ایک مجنونانہ ناحق گریزی پیدا ہو۔ تاکہ جس شخص میں بھی حق پسندی کا عنصر موجود ہو وہ سمٹ کر ایک ہی نقطہ پر آ جائے اور پھر تمام صالح عناصر مل کر غیر صالح عناصر کی ادبی شیرازہ بندی کو بکھیر دیں نئے ادب کا سورج اپنی انتہائی جوت کے ساتھ طلوع ہو اور موجودہ جاہلی ادب کے دئیے اس کے آگے ٹمٹما کر رہ جائیں۔ چنانچہ اسی غرض کے لئے آج کی صحبت میں ایک نئے مقصدی افسانے کا تعارف کرایا جا رہا ہے۔

نعیم صدیقی۔ یہ نیا افسانہ باقاعدہ طور پر آج سے تقریباً (۵) سال پیشتر اس وقت وجود میں آیا جب نعیم صدیقی کے "ذہنی زلزلے" وقت کے ادبی سانچوں کو ایک طرح کا چیلنج دیتے ہوئے میدان میں آئے۔ "ذہنی زلزلے" کے افسانوں میں اگرچہ افسانہ پن کی کمی تھی، ان کی زبان ایک تکمیلی مرحلے کے لئے خود ہی بے چین نظر آتی ہے۔ ان میں سے اکثر کے پلاٹ واقعاتی کم اور خیالاتی زیادہ ہیں لیکن اس کے باوجود "ذہنی زلزلے" ایک بہت ہی طاقتور "اعلان جنگ" ضرور تھے۔ وقت کے رواں دواں ادب کے خلاف ایک طاقتور بغاوت تھے، نئے انقلابی مقاصد کے اعتبار سے ان میں طرز نگارش (Style) کی جدت پوری طرح نمایاں ہے ان کی تشبیہوں اور استعاروں میں تازگی ہے۔ تکنک میں ارتقائی رجحان اور نئے مواد کے لئے نئے سانچوں کی طلب کا جذبہ کافی نمایاں ہے۔ گویا نیا مقصدی ادب اپنی تکمیل کے لئے ایک سازگار فضا خود ہی تیار کر رہا ہے۔ افسانہ نویس عام راستوں سے ہٹ کر چلتا ہے اور ایک نیا راستہ اختیار کرتا ہے۔ وہ اپنے افسانوی کردار کی تصویر کشی کرتے وقت اس کے "کھانے کے چمچوں" کی سیرت نگاری کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ اور "پلنگ کی چیخ" اٹھنے والی چولوں کو بھی وہ بڑے غور سے سنتا ہے۔ "ذہنی زلزلے" کی "تیسری بھوک" میں اس نے بڑی عمدگی سے موجودہ نوجوانوں کی سیرت کا جائزہ لیا ہے۔ اسی طرح "نیا انسان" بھی اس کے قلم سے ٹپک پڑنے والا قطرہ نیساں ہے۔ آہ! وہ نئے انسان کی تلاش میں کہاں کہاں پھرا مگر اسے نیا انسان کہیں نہ ہاتھ آیا۔ البتہ اگر وہ اسے ملا تو سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر

اپنی حاجت رفع کرتے ہوئے۔ جبکہ اُس کی رفیقہ حیات اُس کے قریب ہی کھڑی تھی۔ اُف! کس قدر دردناک منظر ہے یہ مگر کیا یہ واقعہ نہیں ہے؟ اور کیا آجکل کے نئے "انسان" انسان پر یہ پھبتی پوری طرح چست نہیں بیٹھتی؟ اسی طرح "اکائی" میں وہ "منا،" کا دل ٹٹولتا ہے۔ ہاں وہی "منا،" جو ہمارے گھروں کے پاس ایک اونچے بنگلے میں رہتی ہے اور صبح کو بھگوان کی پوجا کے لئے مندر اور شام کو نفس کی پوجا کے لئے کلب گھر جاتی ہے۔ وہ انسانی نفسیات کا ذرا گہرائی میں اتر کر جائزہ لیتا ہے، اور یہ گوہر بے بہا اُس کے ہاتھ لگتا ہے کہ "انسان کے دو دل نہیں ہوتے" کہ ایک دل میں تو خدا کی اطاعت اور بھگوان کی پوجا ہو اور دوسرے دل میں، ریڈیو سنگر بننے کا شوق۔ چنانچہ "اکائی" کی منا، کو بھی اپنے ایک جذبے سے شکست کھانی پڑتی ہے اور وہ یکسو ہو کر بھگوان کی پوجا چھوڑ صرف کلب گھر کی ہو رہتی ہے! ہماری موجودہ زندگی کا کتنا اچھا خاکہ ہے یہ۔ زندگی چاہے وہ سڑک کی نالی صاف کرنے والے مزدور کی ہو یا پروفیسر اور طالب علم کی اس میں یقیناً ضرور پایا جاتا ہے کہ اُس کے ایک خانے میں گھر کی محبت ہے اور دوسرے میں بازار کی۔ ایک میں خدا کی یاد ہے اور دوسرے میں شیطان کی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں چیزیں زیادہ دنوں تک ساتھ نہیں چل سکتیں۔ اور انسان کو کسی ایک طرف کا ہو رہنا پڑتا ہے۔ زندگی فی الواقع اکائی پسند ہے۔ وہ یا تو خدا ہی کی ہو رہے یا پھر آفاق میں گم ہو جائے۔ اُسے یا تو اُدخلو فی السلم کافۃ پر عمل کرنا ہوگا۔ یا پھر پوری بغاوت کر کے دنیا کا کتا بن جانا ہوگا۔ لیکن یاد رہے کہ نفس کی پوجا کرنے والی زندگی تباہ و برباد ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی اور خدا کی اطاعت کرنے والی زندگی کو خدا بھی ملتا ہے اور دنیا بھی۔

بہرحال "ذہنی زلزلے" "خود اس کے خالق" کی زبان میں "معروف فکری بغاوت کے خلاف ایک اور بغاوت کا آغازی اقدام ہے" اور ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس اقدام نے حریف کے پیروں کو میدان سے اکھیڑنے میں بہت کچھ مدد دی ہے۔ نعیم صدیقی "ذہنی زلزلے" کے بعد بھی افسانے لکھتے رہے اور اب بھی لکھتے ہیں اور ان کا یہ کام روزافزوں ترقی کے ساتھ جاری ہے۔ لیکن ذاتی طور پر میری یہ رائے ہے کہ انھوں نے جتنی ترقی اپنے ادب کو "مقصدی" بنانے میں کی ہے اس سے کم رفتار سے تکنک یا فن کی طرف ارتقاء کیا ہے۔ مگر نعیم صدیقی میں اقدامی اسپرٹ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ہے، اور مجھے اُن سے ساری دلچسپی صرف اس لئے ہے کہ وہ ہر معاملہ میں سب سے ایک قدم آگے کود جانے میں کمال رکھتے ہیں۔ اس لئے نہ معلوم کب وہ اپنے موجودہ موقف سے ایک دم "سوسیل" آگے چھلانگ لگا دیں۔

جیلانی بی۔ اے نعیم صدیقی نے "اعلان جنگ" کر کے اگر ایک نئی فکری بغاوت کا آغازی اقدام کیا تھا۔ تو جیلانی بی۔ اے سب سے پہلے اس پر لبیک کہنے والے اور خود آگے بڑھ کر علم تھام لینے والے ہیں، ان کا SI... زیادہ "فطری"، مانوس، اور زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ پہلے پہلے جیلانی۔ بی۔ اے نے کچھ چیزیں ٹالسٹائی کے اصلاحی

انداز پر لکھیں معلوم نہیں کیوں۔ لیکن ان میں بھی اُن کی انفرادیت برقرار رہی اور وہ اس وقت بھی سوسائٹی کی تصویر کشی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے اس طرز کے افسانوں میں سب سے زیادہ کامیاب "موت کب آتی ہے" تھا جو سہ روزہ کوثر میں آج سے نہ معلوم کتنی مدت قبل چھپا تھا۔ مگر سچ پوچھو تو میں نے اس افسانے سے بہت اثر لیا اور سب سے پہلے میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ موت کن حالات میں انسان کو اپنے چنگل میں جکڑ لیتی ہے۔ جیلانی نے اُس میں ایک حدیث کی روشنی میں ہماری آس پاس کی زندگی کو ایک نتیجہ خیز پلاٹ کی شکل میں پیش کرتے ہوئے اس عمدگی سے موت کی آمد کے وقت کی نشان دہی کی ہے کہ معاً یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ کیا میرے اردگرد بھی وہ حالات پیدا ہوگئے ہیں جن میں میرے زندہ رہنے سے کچھ حاصل نہیں ہے۔ یہ تصور روح کو تڑپا دینے اور قلب کو گرما دینے کی زبردست طاقت اپنے اندر رکھتا ہے، اور صرف اسی تصور پر انسان کے با اخلاق اور باکردار ہونے کا دارو مدار ہے۔ لیکن جب جیلانی نے یہ "ٹالسٹائی پن" چھوڑ دیا تو وہ اور بھی اچھے ہو گئے۔ "چور"، "فضل کریم" "حادثہ" اور "پناہ گیر" میں ابہام سہی مقصد کی خاطر کھلا کھلا وعظ نہ سہی مگر وہ آرٹ کے بہت اچھے نمونے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فن کے گہرے مطالعہ کے بعد لکھے گئے ہیں، اور آپ یقین جانئے جو چیز فن کے اعتبار سے مکمل ہوگی وہی مقصد کے اعتبار سے بھی کامیاب ہوگی۔ ایک افسانہ اگر اسلامی اصطلاحات سے فقہ اور حدیث کی کتابوں کی طرح زیادہ سے زیادہ بھر دیا جائے تو بہترین "ذخیرہ معلومات" ہونے کے باوجود اپنی اثر انگیزی کے اعتبار سے وہ زیادہ مفید نہ ہوگا اس کے برعکس اگر پورے افسانے میں محض ایک ہی خیال پیش کیا گیا ہو تو اُس کو پڑھکر بہت جلدی ہضم کیا جا سکتا ہے اور وہ پڑھنے والے کی رائے کو متاثر کر سکتا ہے رسول اکرمؐ نے دعوت حق کے لئے جس حکمت کی تاکید کی ہے اور جس احسن انداز کو اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی ہے افسانے کا موعظۂ حسنہ اور دعوت بالحکمۃ میرے نزدیک یہی ہے۔ ایک اور بات یہ ہے کہ قرآن، حدیث اور فقہی اصولوں کا اپنی جگہ ایک مرتبہ ہے اور اپنے درجات کے اعتبار سے ان کا ایک بلند مقام ہے اگر ہم افسانے کی خاطر اُن کو نیچے اتار کر لائیں تو اُن کا وہ وقار متاثر ہو جاتا ہے اور وہ اپنی اثر انگیزی کو کم کر دیتے ہیں اس لئے بہتر یہی ہے کہ اُن کو اُسی زبان اور اور اسی CLIMAX میں پیش کیا جائے جو خود خدا اور اُس کے رسول (صلعم) نے اختیار کیا ہے۔ جیلانی اس چیز کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ وہ افسانے کو بالکل فطری اور سادہ انداز میں شروع کرتے ہیں لیکن انتہا ابتدا ہی میں پڑھنے والے کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ پھر جوں جوں وہ آگے بڑھتا ہے وہ اور زیادہ افسانے میں ڈوبتا چلا جاتا ہے۔ ایک آدھ جگہ تشویش بھی ہوتی ہے۔ کچھ دل کو ٹھیس سی لگتی ہے۔ غلط افکار کے آبگینے ٹوٹتے ہیں۔ چھالے چھدتے ہیں۔ اور پھر پڑھنے والا زنانٹے سے آگے بڑھ جاتا ہے —— معمولی سی "مرہم پٹی" ہو جاتی ہے لیکن آخر میں پھر وہی زخم —— زہر بھلیلے ہوئے جسم پر گہرا گھاؤ۔ اب افسانہ ختم ہو جاتا ہے اور پڑھنے والا سوچ سوچ کر ایک نتیجہ نکال لیتا ہے —— اب یہ نتیجہ کیسا بالکل وہی ہوتا ہے جو جیلانی چاہتے ہیں؟ یہ چیز ابھی اُن کے لئے قابل غور ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ بہت تیزی سے

آگے بڑھ رہے ہیں اس لئے وہ جلد ہی اس نکتہ کو بھی سمجھ جائیں گے۔

مختصر یہ کہ جیلانی تحریک اسلامی کے بہترین افسانہ نویس ہیں۔ اور ہم بغیر کسی تذبذب کے ان کا مقابلہ دوسرے فن کاروں سے کر سکتے ہیں۔

عروج قادری عروج قادری شاعر زیادہ ہیں اور افسانہ نویس کم لیکن جتنے افسانہ نویس بھی وہ ہیں۔ بہت اچھے ہیں۔ ان کے افسانوں میں گہری مقصدیت ہے اور خوبی یہ ہے کہ ان کا پلاٹ مقصد سے بہت اچھا ربط رکھتا ہے "بھوک" کا پلاٹ بیک وقت دو کام کرتا ہے نئے مقصد کی ترویج۔ نئے نظام کی تشریح اور غلط مقصد حیات پر تنقید انھوں نے بھوک کے ہیرو کی ڈاڑھی بالکل اسی طرح بڑھادی ہے۔ جس طرح "مہاجر" میں راجندر سنگھ بیدی نے مہاجر کی ڈاڑھی منڈوا دی ہے اور اس کی عورت کو بے پردہ کر دیا ہے۔ لیکن بیدی ایک ادنیٰ درجہ کے مقصد حیات کے لئے یہ کام کرتا ہے، اس کا تصور معمولی اور گھٹیا خواہشات کے گرد گھومتا ہے۔ وہ انسان کی انسانیت پر بری طرح برستا اور پیغمبروں کو گالیاں دلواتا ہے اور شیطان پر درود بھیجتا ہے۔ مگر عروج قادری نے اپنے مخالف پر اس طرح کی گندگی نہیں اچھالی ہے۔ وہ اُسے ہوٹل میں لے جاکر کھلاتے پلاتے ہیں۔ اور بدگفتاری کے بجائے خوش اخلاقی اور خوش گفتاری سے اس کا دل موہ لیتے ہیں۔ اور بالکل ایک واقعہ کی صورت میں یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ سوسائٹی کی تعمیر کرنے والا جذبہ پیٹ اور بھوک کا جذبہ نہیں بلکہ یہ اس سے بلند تر احساسات کا مرہون منت ہے۔ بھوک سے ہٹکر انھوں نے خیالاتی ادب کے سمندر میں بھی اپنی پیراکی کے جوہر دکھائے ہیں۔ "لہو کی تین بوندیں" غالباً اس قسم کی چیزوں میں سب سے اچھی ہے۔ مگر واقعاتی سادگی اور اظہار بیان کے فطری اتار چڑھاؤ کی جو دل پذیر شکل حقیقت پسندانہ ادب میں ہوتی ہے وہ مقصد کے اعتبار سے زیادہ موثر اور زیادہ کامیاب رہتی ہے اس لئے اگر عروج صرف واقعاتی ادب کی طرف اپنی توجہ صرف کریں تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ اپنے اسٹائل میں زبردست انفرادیت کے مالک بن جائیں گے۔ اور کیا تعجب کہ وہ بھی یہی سوچ رہے ہوں۔

ابن مختار نئے نئے تحریک اسلامی کی ادبی دنیا میں ظاہر ہوئے ہیں۔ مگر بڑی تیزی سے اپنی منفرد خصوصیات کے لئے کوشاں ہیں۔ جو کچھ لکھتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کافی مطالعہ کے بعد لکھ رہے ہیں مقصدیت پلاٹ کے ساتھ بہت اچھا میل کھاتی ہے۔ نتیجہ دلچسپ اور اچھا نکالتے ہیں۔ ابتدا میں یوں معلوم ہوتا ہے جیسے قصہ میں کوئی مقصد نہیں ہے بے مقصد واقعات بھردئے گئے ہیں۔ خواہ مخواہ کی گفتگو ہے۔ بیجا لعن طعن ہے نفسیات انسانی کا غیر ضروری سا تجزیہ ہے۔ لیکن آخر میں جب وہ کانٹے کی بات آجاتی ہے جس کی خاطر افسانہ لکھا جاتا ہے تو پورا افسانہ ایک باقاعدہ عمارت ایک بامقصد کام اور ایک خاص غرض کے لئے پہلے سے مرتب شدہ پروگرام کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور افسانے کی ایک ایک لڑی پکار پکار کر کہتی ہے کہ وہی بات ٹھیک ہے جو سب کے آخر میں کہی گئی ہے۔ یہ خصوصیت ہندوستان کے اچھے اچھے لکھنے والوں

کو میسر نہیں۔ معلوم نہیں ابن مختار اسے کہاں سے اڑا لائے ہیں۔ دراصل جب ایک اعلیٰ مقصد کے لئے انسان اپنی ادبیت کو ڈھالتا ہے تو روح ادبیت جو اس اعلیٰ مقصد سے فطری لگاؤ رکھتی ہے زیادہ سے زیادہ اُس کے قلم میں کھینچ کر جمع ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس ایک جاہلی ادب میں معیار کی بلندی اول تو بڑی دیر میں آتی ہے اور جب آتی ہے تو کراہتی اور ڈرتی ہوئی جیسے کوئی کم سن لڑکا ڈرا سہما آپریشن روم کی طرف جا رہا ہو۔

ابن مختار کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے آس پاس کے ماحول سے کبھی نہیں ہٹتے۔ زیادہ تر وہ اُسی گاؤں کی سماج کو ہمارے سامنے رکھتے ہیں جس میں کہ وہ رہتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کی تصویر کشی میں وہ بدمزگی نہیں جو عموماً دیہاتی سماج کا نقشہ کھینچتے وقت اشتراکی ادیبوں کے قلم سے ظاہر ہوتی ہے اور اس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ ان کی نظر اعلیٰ تر اقدار حیات پر زیادہ جاتی ہے اور اشتراکی ادیب ادنیٰ حیوانی اقدار کے اعتبار سے زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں۔ "بقدر وسعت" اس طرز کے افسانوں میں شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ لیکن "بقدر وسعت" میں ایک بات ہے۔ مقصد کے اعتبار سے تو افسانہ کامیاب ہے مگر مقصد بجائے خود ہلکا ہے۔ ضرورت تو اس امر کی تھی کہ مقصد زیادہ زور دار ہوتا۔ صرف اصلاحی ہی نہیں بلکہ انقلابی ہوتا۔ چنانچہ "پاگل" میں یہی بات ہے۔ مقصد کافی زوردار ہے۔

گاؤں کی زندگی کے باہر کا نقشہ بھی وہ بڑی چابکدستی سے کھینچتے ہیں۔ "یکسانی" میں شہری زندگی کی جھلک بہت اچھی دکھائی ہے اور پھر شہری اور دیہاتی کا وہ ملاپ بھی کس قدر پر لطف ہے جب دیہاتی کے استفسار پر شہری بابو "ہش فش" کہکر چلتا بنتا ہے۔ لیکن دیہاتی سمجھتا ہے جیسے اُس نے کوئی اہم بات کہی ہے جسے وہ اپنی جہالت کی وجہ سے سمجھ نہیں سکا۔ یہ نفسیاتی جائزہ۔ منظر کشی اور واقعات میں فطری ربط نہیں معلوم یہ سب کچھ وہ کہاں سے لا رہے ہیں ——

مگر میں اُن سے اتنا ضرور کہوں گا کہ تحریک اسلامی کی ترقی، وسعت اور بڑھتی ہوئی عمومی حیثیت کے پیش نظر اب ہمیں زیادہ نمایاں طور پر اپنے مقصد کو پیش کرنا ہوگا اور باطل کی کمر توڑنے کے لئے زیادہ بھرپور ہاتھ مارنا ہوگا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ فطری اسلوب نگارش۔ اور واقعات کی سادگی کو نظر انداز کر کے خواہ مخواہ ایک مصنوعی طرز اختیار کیا جائے۔ بلکہ جو کچھ ہم چاہتے ہیں وہ دراصل مقصدیت اور حقیقت پسندی (Realism) کا ایک شاندار مرکب ہے۔ موجودہ نام نہاد ترقی پسند ادب سے زیادہ شاندار!

عاصی ضیائی رامپوری

اگر ہم طنز کو بھی افسانے میں شامل کرلیں تو غالباً عاصی ضیائی تحریک اسلامی کے سب سے بڑے اور سب سے اچھے طنز نگار ہیں بلکہ تحریک کے باہر بھی اپنی اس خوبی میں انفرادیت کے مالک نظر آئیں گے۔ "بیوقوف کی باتیں" تو ایسا جیتا جاگتا طنز ہے کہ لال جھنڈے کے پرستار اگر ٹھنڈے دل سے اسے پڑھیں تو انھیں یوں معلوم ہو جیسے اُن کے حق پسندانہ ضمیر نے عاصی ضیائی کے قلم سے سازباز کر کے اُن کے

…لب و دماغ پر یہ زور دار کچو کے لگاتے ہیں اور بڑے پرزور طریقے پر اُن کو سطحِ زمین کی پستی سے نکال کر "نیلے آسمان" کی
…ندیوں کی طرف لے جا رہے ہیں۔ ضیائی صرف طنز نگار اور افسانہ نویس ہی نہیں بلکہ وہ ایک قابل مضمون نگار بھی ہیں اور اُن کا مطالعہ
…سیع ہے۔ اس لئے جب وہ کوئی چیز لکھتے ہیں تو اُس پر سے محض سرسری نظر ڈالتے ہوئے نہیں گذر جاتے۔ بلکہ وہ اپنی وسعت علمی کی بنا پر اُس کی آخری تہہ
…ک اُترتے ہیں۔ اور اُس میں ڈوب کر اُسے لکھتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی نہیں ہے کہ گہرائی میں اُترنے سے اُن کے ادب میں خشکی آگئی ہو۔ نہیں بلکہ وہ فن کی حدود
…ی بھی ساتھ ساتھ پابندی کرتے ہیں۔ اور علم کو فن کے دائرے میں گھسیٹ کر ایک متحرک شئے اور اثر انگیز قوت بنا دینے کی صلاحیت اپنے قلم میں رکھتے ہیں "دیوف
…ی باتیں" میں اُن کا یہ جوہر بڑی تیزی سے اُبھرا ہے۔ مگر تعجب یہ ہے کہ انہوں نے اور چیزیں اس رنگ کی نہیں لکھیں۔ اُن کے دوسرے افسانے طنز نگاری
…کے اعتبار سے نسبتاً بہت ہی ہلکے ہو گئے ہیں۔ البتہ اُن میں مقصد کی طرف براہ راست دعوت کا پہلو نمایاں ہے۔ اُن میں ایجابیت کا وزن بڑھ
…یا ہے اور وہ سوسائٹی کی تصویر کشی کی طرف مائل نظر آتے ہیں "اونچی محرابیں" غالباً اُس قسم کے افسانوں میں سب سے اونچا ہے لیکن جہاں تک میں نے
…ور کیا ہے عاصی ضیائی کا اصلی جوہر اُن کی طنز نگاری میں پوشیدہ ہے اگر وہ اس تلوار کو ہاتھ میں لیکر میدان میں آئیں تو کشتوں کے پشتے لگا سکتے
…یں، ورنہ دوسرے ہتیاروں کو استعمال کرنے کی خواہش سے اُن کا یہ جوہر ضائع ہو جائے گا۔ کیونکہ دوسرے ہتیاروں کو وہ اس روانی
کے ساتھ نہ چلا سکینگے جتنی پھرتی اور ہوشیاری سے وہ "طنز" کو استعمال کرتے ہیں۔

آباد شاہ پوری

بہت سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں۔ اُن کے افسانوں میں سادگی اور حسن کا امتزاج بہت دلچسپ ہوتا ہے۔ واقعات کو
فطری اسلوب نگارش میں بیان کرتے ہیں مگر پڑھنے والے کو بڑی جلدی اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں۔ "درندے" میں
…لکل صحیح قسم" کے پاگل کی زبان سے" "مجھے رائفل دو ــــ رائفل" کی تکرار بہت سادہ طریقے پر کی گئی ہے مگر جب یہ الفاظ پڑھنے والے کے ذہن
سے ٹکراتے ہیں تو ایک خاص اثر کرتے ہیں اسی طرح جب وہ اپنی اسی سادہ بیانی میں حسن آفرینی کی جھلک پیدا کر دیتے ہیں تو ایک
…رح کا کیف پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی "درندے" میں ایک جگہ غروب آفتاب کا منظر اس طرح کھینچا ہے۔ "سورج دن بھر کی تگ و دو کے بعد
…غربی افق سے جا لگا تھا اور اُس کی شفق آلودہ شعاعیں پلیٹ فارم پر بکھرے ہوئے سنگریزوں سے کھیلتی ہوئی اسٹیشن کی سرخ عمارت کی سفید
…نڈیر پر طلائی غازہ مل رہی تھیں ــــ" دیکھئے کتنی دلکشی ہے ان الفاظ میں جیسے کسی نے سادہ شربت کے گلاس میں خوشبو کی چند بوندیں
…پکا دی ہوں۔ آباد شاہ پوری کہانی کے کسی ایک حصہ کو زیادہ ابھارنے کے بجائے اُس کے تمام پہلوؤں کو موقع دیتے ہیں کہ اُن کے قلم سے
…رت کی چاشنی تھوڑی تھوڑی اڑا لیں۔ اکثر افسانہ نویس کسی ایک پہلو کو بہت زیادہ اُجاگر کر دیتے ہیں۔ کوئی کردار کو ابھارتا ہے۔ کوئی پلاٹ کو
…ی زبان کو اور کوئی منظر اور مکالمے کو لیکن بہت کم لوگ ایسے ہیں جو افسانے کے تمام پہلوؤں اور گوشوں کو ایک ساتھ لیکر آگے بڑھ رہے ہوں
…صحیح ہے کہ ایسی صورت میں بوجھ بہت بڑھ جاتا ہے اور انسان کا ذہن زیادہ تنوع کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ندرت خیال اور جدت بیان
…سور کی زنجیریں توڑ کر بھاگ نکلتے ہیں یا پھر اصلی مقصد ہی درمیان میں کہیں کھو جاتا ہے پھر اُسے ڈھونڈ کر لانا اور پیچھے سے دھکیل کر آگے کرنا
…رتا ہے جسکی وجہ سے افسانہ بے لطف اور بے مزہ سا ہو جاتا ہے ــــ مگر جس شخص نے اپنے دامن خیال میں ان تمام موتیوں کو سمیٹ لیا۔

وہی سب سے زیادہ کامیاب رہا۔ محض کردار نگاری، یا مکالمہ بازی وغیرہ بھی افسانے کو افسانہ کہنے کے لئے کافی ہیں۔ مگر جس طرح حقیقی زندگی میں کوئی ایک پہلو ہی نہیں بلکہ کئی پہلو ایک دوسرے سے الجھتے ہوئے اور باہم دست وگریباں ہوتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور کوئی واقعہ کسی ایک مکالمہ کے تحت نہیں بلکہ کئی اور واقعات سے مل کر ظہور میں آتا ہے۔ اسی طرح افسانے میں بھی ان کا ایک لطیف امتزاج ہونا چاہیئے اور ان سب کے درمیان مقصد کو فضا کی حرارت یا ٹھنڈک کی طرح سمویا ہوا رہنا چاہیئے پس جس افسانہ نویس نے اس حقیقت پر عمل کر کے دکھا دیا۔ وہی سب سے بڑا افسانہ نویس بن گیا۔

میں سمجھتا ہوں آبادشاہ پوری جلد ہی ایک بڑے افسانہ نویس بن جائیں گے۔

(باقی دارد)

زندگی کے دو زاویئے

انجم عثمانی
(مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

(۱) ایک اشتراکی اپنی کامریڈ سے

مری محبوب مری گود میں آ جاؤ تم
اب تو بیباک ذرا ہو جاؤ
توڑ دو بندِ حیا
اپنی باہیں مری گردن سے حمائل کر دو
ہو گا پھر 'سرخ سویرا' ترے دامن سے طلوع

(۲) ایک مسلم اپنی شریکِ حیات سے

اے مری جانِ حیات
تم سے پیمانِ وفا لینا ہے
مجھکو باطل کی بغاوت میں یہ جاں دینی ہے
یہ خودی آج بھی رسوا تو نہیں ہو سکتی
مجھ سے طاغوت کی پوجا تو نہیں ہو سکتی
تم مری راہ میں حائل تو نہ ہو جاؤ گی!

رازِ حیات

خاکِ باطل سے ہے آلودہ جبینِ مومن
آہ باقی نہ رہی روح میں وہ سوزِ خودی
آہ نادان تجھے یاد نہیں رازِ حیات
زندگی جذبۂ ایمان کا ہے نام جلی

(از محمود محمودی)

رباعی

اذاں ہیں مگر روحوں سے خالی
رہا باقی نہ اب سوزِ بلالی
وہ سجدہ جھکا سکون ہے اب
جبینوں میں کہاں شوقِ وصالی

(از محمود محمودی)

اگر چشم بینا ہو

محمود فاروقی

یہ فضا، میں اڑتے ہوئے رنگ - !
نیلے پیلے، لال اور کالے
اور پھر جیسے
سارے رنگ مل کر
پھرسے اُڑ جائیں
یہ فضا، میں اڑتے ہوئے رنگ !

یا جیسے
چپکے، چپکے
گلاب، نسترن اور جوہی
شبو، موتیا اور چنبیلی
اور نرگس کی
ساری پنکھڑیاں
کانٹوں کی آنکھ بچاکر
نیلی فضا، میں اُڑ جائیں -
یہ فضا، میں اڑتے ہوئے رنگ !
یا جیسے
اودی اودی مست گھٹائیں
روپہلی، چمکیلی
قوس قزح
بن بن کر بکھر جائے ...... یا
سورج کی اچھوتی کرنیں
بارنگھار کی بیلوں میں

شبنم کے ننھے ننھے قطروں کو
چوم چوم کر چھپ جائیں
یہ فضا، میں اڑتے ہوئے رنگ
یا جیسے
بیتے دنوں کی چبھتی یاد ...... یا
مستقبل کے دھند میں
مچلتی دوشیزہ تمنائیں
بے چین ارادے پُرعزم نگاہیں
یا پچھلی راتوں سے
کس حق آگاہ کی
دلدوز آہ اور اس کی
جبین بے شکن کی
سجدہ آگیں ضوفشانیاں
یا جیسے
معرکۂ وجود میں
خون مومن کی
روح فزا رنگکاریاں
یہہ فضا، میں اڑتے ہوئے رنگ !
یعنی .... یہہ
تھرکتی، مچلتی، اڑتی ہوئی
حق نما، خوش رنگ، خوش ادا
تتلیاں
جو اگر چشم بینا ہو —— !!

روشنی

عروج قادری

۱
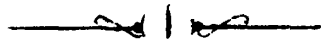
کچھ حد بھی ہے تاریکی کی، ہر طرف اندھیرا، ہر طرف سیاہی، کیا دنیا میں اب کہیں روشنی کا پتہ نہیں۔ اگر آسمان پر یہ بے شمار قمقمے چمک رہے ہوتے تو نہ جانے ہم دونوں کا کیا حال ہوتا، کسی کھڈ میں گرتے، کسی چٹان سے ٹکراتے یا کسی جھاڑی سے الجھتے، کیوں بھئی حامد یا آج رات بھر ہم ٹھوکریں ہی کھاتے رہیں گے؟

انور اور حامد دو دوست تھے جو اپنے گھروں کے اندھیرے اور ماحول کی تاریکی سے گھبرا گئے تھے۔ مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے سبھی اندھیرے ں بھٹک رہے تھے۔ تاریکی جب چھاتی ہے تو سب کو اپنے حلقے میں گھیر لیتی ہے۔ انسان چاہے جتنی بھی تندرست اور اچھی آنکھیں رکھتا ہو ں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ انور اور حامد دونوں جوان تھے جو ایک دوسرے کے پڑوسی تھے۔ وہ گھنٹوں اس چیز پر گفتگو تے رہتے کہ اس تاریکی کو کیسے دور کیا جائے، وہ بچوں کو بھٹک بھٹک کر ایک دوسرے سے الجھتے دیکھتے تو تلملا اٹھتے، وہ رتوں اور مردوں کو ایک دوسرے سے ٹکراتے دیکھتے تو ان کی روح کانپ جاتی۔ ان کے پاس چراغ تھے، ان میں تیل تھا ں تھی لیکن جلایا کیسے جائے اس چیز نے ان کو بے بس کر رکھا تھا۔ روشن کرنے کا سامان نہ ان کے پاس تھا اور نہ آس پاس ی کے پاس۔ اس گاؤں میں صرف یہی دو نوجوان تھے جنھیں اس تاریکی کا احساس تھا ورنہ بہترے نوجوان اسے روشنی ہی بجھ رہے تھے۔ کسی چیز کا احساس ہی تمام پریشانیوں اور فکروں کا منبع ہے۔ جو لوگ احساس فردا سے بے گانہ ہیں وہ لطف امروز ے منہ کیوں موڑیں جو تاریکی ہی کو روشنی سمجھ بیٹھے وہ تلاش نور کی زحمت کیوں برداشت کرے انور اور حامد کو احساس ریکی ہی نے بے چین کر دیا تھا اور وہ روشنی کی تلاش میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے طے کیا تھا کہ جب تک پنے چراغ روشن نہ کر لیں گے واپس نہ لوٹیں گے۔

۲

حامد نے انور سے کہا، گھبراتے کیوں ہو تم روشنی کی تلاش میں نکلے ہو، تفریح کرنے تھوڑے ہی چلے ہو، کانٹے چبھتے ہیں تو چبھنے ٹھوکر لگتی ہے تو لگنے دو۔ بڑھے چلو، دیکھو سامنے یہ جو چھوٹی سی پہاڑی ہے اس کے اس پار امید ہے کہ روشنی کا پتہ ملے۔ ہمت نہ رو، گرتے پڑتے جب وہ پہاڑی کی چوٹی پر پہنچے تو دور سے روشنی کی ایک شعاع نظر آئی۔ انور کے منہ سے خوشی کی چیخ نکل گئی۔ ائی حامد، تمہارا خیال کتنا صحیح تھا۔ آؤ قدم بڑھا کے چلیں۔ حامد نے کہا، انور تمہارے مزاج میں اضطراب بھی ہے اور جلدی ی۔ ابھی کیا معلوم کہ اس روشنی سے ہم اپنے چراغ روشن بھی کر سکیں گے یا نہیں، صبر اور سکون کی عادت ڈالو

ایسا نہ ہو کر جلدی میں تم اپنا مقصد ہی بھول بیٹھو۔ اور جس طرح بھوکا گھوڑا ہر چراگاہ پر منہ مارنے لگتا ہے تم بھی ہر شمع کے پروانہ بن جاؤ۔
یہ گفتگو کرتے ہوئے وہ دونوں اُس روشنی کے قریب پہنچ گئے۔ یہ روشنی ایک آراستہ پیراستہ، عالی شان محل سے نکل رہی تھی دروازے کے ایک ستون پر عورت کا مجسمہ اور دوسرے ستون پر مرد کا مجسمہ اس طرح بنا ہوا تھا کہ مرد اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر عورت کو آغوش میں لینا چاہتا ہے اور عورت اس سے بچ کر پیچھے ہٹ رہی ہے۔ دروازے پر ایک تختی لگی ہوئی تھی جس پر درج تھا "خوش آمدید"۔ —— انور اور حامد ان مجسموں کو دیکھ کر ٹھٹک گئے لیکن پھر کچھ سوچ کر مکان میں داخل ہو گئے۔ اس مکان کا ہال سب سے زیادہ روشن تھا اور وہاں سے ساز بجنے کی آواز آرہی تھی جب یہ ہال میں داخل ہوئے تو وہاں کا منظر دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ اسٹیج پر دو کرسیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی رکھی تھیں اور ان کے سامنے چھوٹی سی میز تھی، ایک پر مرد اور دوسری پر ایک عورت نیم عریاں بیٹھی تھی دونوں کے سامنے شراب کے پیالے رکھے تھے۔ مرد کی باہیں عورت کی گردن میں حائل تھیں۔ اسٹیج سے نیچے ایک دوسری عورت بال بکھیرے ہوئے ساز پر "بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" بجا رہی تھی۔ اس کے پیچھے دس بارہ مرد اپنی اپنی کاپیوں پر کچھ لکھ رہے تھے اور دوسری طرف کچھ دوسرے لوگ برش سے اپنے اپنے ہاتھ کے کاغذوں پر رنگ بھر رہے تھے۔ ان نوواردوں کو دیکھ کر سب کے سب بول اُٹھے۔ آئیے آئیے، تشریف لائیے۔ انور اور حامد ابھی حیران کھڑے تھے کہ ایک شخص اٹھا اور دونوں کو کرسیوں پر بیٹھا دیا۔ حامد نے گھبرا کر پوچھا یہاں یہ کیا ہو رہا ہے، ہم غلطی سے کسی قحبہ خانہ میں تو نہیں آ گئے؟
ان میں سے ایک مرد نے کہا، آپ اپنے الفاظ واپس لیجئے۔ آپ دیکھنے میں تو پڑھے لکھے شخص معلوم ہوتے ہیں۔ یہ قحبہ خانہ نہیں ہے یہاں زندگی کا معمہ حل کیا جاتا ہے۔ یہاں آرٹ کے شاہکار تیار ہوتے ہیں۔ یہاں ادب و شعر کے نشتر ڈھلتے ہیں۔ اگر آپ لوگوں کو ادب سے ذوق ہے تو آئے اس صف میں بیٹھ جائیے اور اگر مصوری کا شوق ہے تو اُس صف میں چلے جائیے۔ انور نے کہا، گستاخی معاف ہو آپ لوگ لکھ کیا رہے ہیں؟
اِدھر ہم لوگ ادب کے شاہکار تیار کر رہے ہیں اور اُدھر مصوری کے شاہکار موقلم سے بھرے جا رہے ہیں، یہ جو اسٹیج کا منظر آپ کے سامنے ہے یہ عشق و محبت کا منظر ہے۔ یہ کیف و مستی کا منظر ہے۔ ادیب اپنے قلم سے اس کا نقشہ کھینچ رہے ہیں اور مصور اپنے موقلم سے اس کو اجاگر کر رہے ہیں یہ جو روشنی پھیلی ہوئی ہے اسی کیف و مستی کی روشنی ہے۔ یہ جو آپ کے ہاتھوں میں بجھے ہوئے چراغ ہیں انہیں یہیں روشن کر لیجئے۔ —— حامد نے کہا، گویا آپ کے نزدیک زندگی نام ہے صرف عورت اور مرد کی ہم آغوشی کا اور وہ بھی ہر قید سے آزاد۔ افسوس انسانی زندگی کی بلندی کا یہ انجام ہے۔ آپ کے خیال میں انسانوں اور جانوروں کی زندگیوں میں کوئی فرق نہیں۔ فرق ہے تو صرف یہ کہ انسان اپنی زبان، قلم اور موقلم سے اس کی تصویر کشی کرتا ہے اور جانور نہیں کر سکتا۔ انسان اپنے ان آلات سے بے شمار ہم جنسوں کی شہوتوں کو بھڑکاتا ہے اور جانور ایسا نہیں کر سکتا۔ گویا آپ کے نزدیک ادیبوں اور مصوروں کا کام بیسواؤں کی بوڑھی دلالاؤں سے مختلف نہیں ہے۔ جو اپنی چرب زبانی سے اپنے اپنے مال کا اشتہار دیتی ہیں۔ آپ ہی انصاف سے کہئے کہ قحبہ خانہ میں اور کیا ہوتا ہے۔ اس لفظ کے استعمال پر آپ کی خفگی کیا درست ہے؟ یاد رکھئے کہ آپ اپنے قلموں سے روشنی نہیں پھیلا رہے ہیں۔ یہ تاریکی ہے، شب دیجور کی تاریکی۔ ہم تو روشنی کی تلاش میں نکلے ہیں۔ واقعی روشنی۔ حقیقی روشنی اسٹیج کے مرد نے انگڑائی لی۔ عورت نے پیالہ اٹھا کر اس کے لبوں سے لگا دیا وہ نشے میں بڑبڑایا بکا ہو ان نوواردوں کو یہ کیا بک بک لگا رکھی ہے۔ آج ہمارے

قھرنشا طامیں یہ کون لوگ گھس آئے ہیں۔ یہ ”مرکز لذتیت“ ہے کوئی خانقاہ نہیں ہے۔ نکالو ان کو یہاں سے۔

۳

انور اور حامد پھر تاریکی کی آغوش میں تھے بلکہ یوں کہئے کہ ان بے چاروں کو اب تک روشنی نصیب ہی نہ ہوئی تھی۔ انور نے حسرت سے کہا آہ ہمارے ادیب، ہمارے شاعر، ہمارے مصور۔ حامد نے پر عزم لہجے میں جواب دیا۔ ہم اس ادب کو روند ڈالینگے، ہم شعر کی کایا پلٹ دینگے، ہم اس تصویر کشی کا نقشہ بدل دینگے ذرا ہمارے ان چراغوں کو روشن تو ہونے دو پھر ہم ان چراغوں سے ہزاروں، لاکھوں چراغ روشن کرینگے۔ دنیا زندگی کی حقیقی روشنی سے جگمگا اٹھیگی۔ انور کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ بیٹھ گیا۔ بڑا سا ایک کانٹا اس کے پاؤں میں چبھ گیا تھا۔ حامد نے بڑی مشکل سے اندھیرے میں کانٹا نکالا اور کہا غم نہ کرو انور، یہی کانٹے تمھارے لئے پھول بن کر آئینگے۔ چلو قدم بڑھائے چلو، ہر سختی کے بعد آسانی ہے، ہاں ہر سختی کے بعد آسانی ہے۔ جس نے ظلمت شب کا مزہ نہ چکھا وہ نور سحر کا لطف کیا جانے۔ وہ دونوں تاریکی میں ٹھوکریں کھاتے چلے جا رہے تھے ایک دوسرے کو تسکین دیتے، ڈھارس دلاتے۔ منزل کٹھن ہو تو ایک شخص کی رفاقت بھی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کیلئے نعمت تھے ——— دور سے روشنی کی ایک اور شعاع چمکی۔ اب کے انور نہ خوشی سے چیخا اور نہ کسی اضطراب کا اظہار کیا۔ ایک ٹیلے پر سرخ رنگ کی عمارت بنی ہوئی تھی۔ روشنی بھی سرخ تھی۔ بجلی کے قمقموں پر لال رنگ کے کاغذ لپیٹ دیئے گئے تھے اسلئے وہ آگ کے دہکتے ہوئے انگارے معلوم ہو رہے تھے دروازے پر کچھ لوگ کھڑے تھے ان نو واردوں کو دیکھ کر وہ آگے بڑھے اور طرح طرح کے سوالات کرنے لگے۔ آپ لوگ کون ہیں؟ اسوقت کہاں آرہے ہیں؟ کیا مقصد ہے؟

انور نے کہا۔ ہم دو غریب الدیار مسافر ہیں جو تاریکی سے گھبرا کر روشنی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ وہ لوگ ان کو لیتے ہوئے ہال میں داخل ہوئے۔ اس ہال کے اسٹیج پر دو خوفناک مجسمے بنے ہوئے تھے۔ ایک ستون پر ایک نوجوان کھڑا تھا اس کے بائیں ہاتھ میں سرخ جھنڈا اور دائیں ہاتھ میں ہتھوڑا تھا، اس کے قدموں کے پاس ایک موٹا تازہ آدمی پڑا تھا جس کی توند نکلی ہوئی تھی اس نوجوان کا ہتھوڑا اس آدمی کے سر کی طرف آرہا تھا۔ دوسرا مجسمہ بھی اسی طرح کا تھا فرق صرف یہ تھا کہ نوجوان کے دائیں ہاتھ میں درانتی تھی جو وہ ایک شخص کے گلے میں ڈال کر اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ ہال کی دیواروں پر بہت سی تصویریں سجائی ہوئی تھیں، سب کے بیچ میں ایک بڑی تصویر سرخ چوکھٹے میں لگی ہوئی تھی۔ یہ ایک سفید مجسمے کی تصویر تھی جو بہت بڑے ستون پر بنا ہوا تھا اور اس کے نیچے بہت سے لوگ سر جھکائے کھڑے تھے۔ انور اور حامد دو کرسیوں پر بٹھائے گئے، اس ہال میں کچھ لوگ بیٹھے لکھ رہے تھے ان لوگوں نے لکھنا چھوڑ دیا اور سب ان دونوں کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ ایک نے پوچھا آپ دونوں کے ہاتھوں میں یہ چراغ کیسے ہیں؟ انور نے کہا اپنی چراغوں کو روشن کرنے کیلئے ہم گھر سے نکلے ہیں۔ ہمارا گھر، ہمارا ماحول سب تاریک ہو رہا ہے۔ عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے سب بھٹک رہے ہیں۔ ہم نے عزم کر لیا ہے کہ تاریکی دور کر کے رہینگے۔ ان میں سے ایک نے کہا، شاباش، دنیا کو آپ ہی جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے آپ لوگ ٹھیک اپنی منزل پر پہونچ گئے۔ یہ سرخ روشنی، یہی سرخ روشنی ہمارے ملک کو روشن کر سکتی ہے یہ عمارت ایک ادبی ادارہ ہے جہاں چند سر پھرے ادیب جمع ہو گئے ہیں۔ ہم اپنے ادب کے زور سے ایک انقلاب برپا ....

- -

کرنے کی سعی کر رہے ہیں، آپ اپنے چراغ یہیں روشن کر لیجئے اور انقلابی ادب کی سرخ روشنی سے

دنیا کو جگمگا دیتی ہے۔ ہم آپ کا خیر مقدم کرتے ہیں " آپ جو انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں اس کا طریقہ تو شائد یہی ہوگا جو آپ نے ان دو مجسموں میں ظاہر کیا ہے، لیکن وہ ہوگا کیا یہ آپ بتائیے" انور نے پوچھا۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ وہ سرمایہ داری کا ستیاناس کر کے جنتا راج قائم کریگا۔ ہر شخص کو روٹی، مکان اور کام دیگا۔ مزدوروں، کسانوں اور غریبوں کو سکھ چین، آرام و اطمینان کی دولت عطا کریگا، اونچ نیچ کا فرق مٹ جائیگا، ہر طرف مساوات ہی مساوات کا پرچم لہرائیگا۔ یہ راجے، مہاراجے، رئیس و نواب، سیٹھ ساہوکار، بورژوا پتی، کارخانہ دار اُس انقلاب کے سیلاب میں تنکے کی طرح بہتے نظر آئینگے۔

حامد نے کہا، آپ کی باتیں تو بڑی دل فریب ہیں لیکن یہ تو بتائیے کہ انقلاب کے بعد لاقانونی کا دور ہوگا یا انتظام کرنے والی کوئی حکومت بھی قایم کی جائیگی۔ ان میں سے ایک "نہیں صاحب ہم ایک اسٹیٹ قایم کرینگے ہمہ گیر اسٹیٹ "

حامد :۔ اسٹیٹ کس کے سامنے جواب دہ ہوگی؟ جنتا کے سامنے" حامد نے پوچھا اور خود جنتا۔ جواب ملا، جنتا کی مرضی ہی سے تو قانون بنیگا، حکومت چلیگی وہ کس کے سامنے جواب دہ ہوگی؟ حامد نے کہا لیکن انسان کا انسان کے لئے قانون بنانا تو صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ایک انسان یا انسانوں کی تھوڑی سی جماعت پورے ملک کے انسانوں یا تمام دنیا کے انسانوں کے لئے ایسا طرح قانون بنا سکتی ہے اس کے پاس ایسا علم ایسا انصاف اور ایسی بے نفسی کہاں ہے کہ سب کے لئے مفید اور بے ضرر قانون بنا سکے ان میں سے ایک نے کہا تو پھر انسان قانون نہ بنائیں گے تو اور کون بنائے گا؟ حامد۔ کیا اس نے جس نے آسمان و زمین بنایا خود ہمیں بنایا اس نے ایسا کوئی قانون بنا کر نہیں دیا؟ وہی تو ایک ایسا ہے جو بالکل بے لوث، بے نفس اور منصف ہے سب انسان اس کے نزدیک بالکل برابر ہیں، اسی نے سب کو پیدا کیا ہے۔ اسلئے سب کے نفع اور نقصان سے وہی پورا واقف ہے اور وہی واقف ہو بھی سکتا ہے۔ ان میں سے ایک نے جھک کر جواب دیا۔ یہ دقیانوسی خیال ہے کیا آپ انسانوں کو آج سے پہلے کے دور بندگی میں واپس لے جانا چاہتے ہیں، انسانوں کی عزت نفس پر یہ چیز بہت گراں ہے کہ وہ کسی کا بندہ بنے اور اس کے سامنے بندگی کا سر جھکائے۔ حامد نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا، آئیے ذرا ہمیں اپنے ہال کی تصویریں دکھائیے وہ ہر تصویر کو غور سے دیکھتا ہوا آگے بڑھتا گیا اور سب سے بڑی تصویر کے سامنے رک گیا، یہ تصویر کس کی ہے؟ اس نے سوال کیا۔

یہ ایک بڑے انسان کی ہے جس نے سرخ انقلاب برپا کیا۔ جواب ملا۔ حامد نے کہا۔ بھئی یہ تو خوب ہے، انسانوں کا اپنے ہی جیسے انسان کے سامنے سر جھکانا اور اس کی بندگی یعنی فرمان برداری کرنا تو عزت نفس پر گراں نہ ہو لیکن خدا کے سامنے سر جھکانا گراں ہو حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک ایسا فریب نفس ہے جس نے انسان کو عزت کی بلندی سے ذلت کے گڑھے میں دھکیل دیا ہے۔

مجھے حیرت ہے کہ آپ جیسے معقول لوگ اتنی معمولی بات بھی نہیں سمجھتے۔ ان میں سے ایک نے کہا، تم بورژوا ہو، سرمایہ دار ہو، تمہارا دماغ صحیح نہیں ہے۔ حامد نے کہا۔ اچھا رخصت، یہ کہتے ہوئے حامد اور انور دروازے سے باہر نکل گئے۔

(۴)

پھر وہی ٹیڑھا میڑھا راستہ تھا اور یہ دو نوجوان۔ وہی کانٹے تھے اور ان کے قدم، وہی تاریکی تھی اور اس کی دہشت، حامد نے کہا۔ افسوس ہے انسانوں کی عقلوں پر، شاید ان کے دل بالکل اندھے ہو چکے ہیں یہ جھوٹوں کی آؤ بھگت کرتے ہیں اور سچوں کو ٹھکراتے ہیں یہ مکار دو

سر چڑھاتے ہیں اور حق پرستوں کو دھتکارتے ہیں۔ جن اصولوں اور قانونوں سے بے امنی پیدا ہوتی ہے انہیں سینے سے لگاتے ہیں اور خدا کے دیئے ہوئے قانونِ امن سے منہ موڑتے ہیں۔ انور بولا، بھائی حامد کیا دنیا میں کوئی نہیں جس کے پاس سچائی کی روشنی ہو، کیا دنیا کے تمام ادیب تاریکی ہی پھیلانے کا کام کر رہے ہیں۔ کیا ہمارے چراغ بجھے ہی رہیں گے۔

حامد نے کہا، ایسا نہیں ہو سکتا۔ اگر دنیا سے سچائی اور اچھائی بالکل غائب ہو جائے تو شاید آسمان وزمین ایک دن بھی قایم نہ رہیں اس کے علاوہ تم جس راستے پر چل رہے ہو وہ ایک عجیب راہ ہے۔ راہ بھی ہے اور منزل بھی، اگر اس وقت ہمیں کوئی سانپ ڈس لے یا شیر پھاڑ ڈالے جب بھی ہم نے اپنا کام ختم کر لیا، ہم منزل پر پہنچ گئے۔ یہ حق کی تلاش ہے یہ سچائی کی طلب ہے۔ اس کا مسافر کبھی ناکام نہیں ہوتا، مایوسی کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دو۔ صبر و تحمل ہر شئے کے حصول کے لئے ضروری ہے۔ وہ دونوں چلتے رہے ہر چیز سے نڈر ہو کر، انہیں ایک دھن لگی تھی چراغ روشن کرنے کی۔ زمین ان کے قدم چوم رہی تھی اور ستارے ان پر مسکرا رہے تھے۔ کیسی دل آویز تھی یہ مسکراہٹ۔ یہی ایک سہارا تھا تاریکی میں تیرنے والے ان دو نوجوانوں کے لئے۔ وہ تاریکی کو چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے ——— دور سے ایک شعاع چمکی۔ حامد نے کہا وہ دیکھو، روشنی، کیا عجب کہ ہم اپنے چراغ اس سے روشن کر لیں۔ وہ جیسے جیسے بڑھتے گئے، روشنی صاف ہوتی گئی۔ صرف ایک لو۔ جو ہوا کے جھونکوں میں تھرتھرا رہی تھی، ہوا کے تیز جھونکے زور لگا رہے تھے لیکن وہ پتلی اور نرم شاخ کی طرح جھک تو جاتی تھی لیکن بجھتی نہ تھی۔ وہ قریب ہوتے گئے۔ یہ ایک چراغ تھا جو ایک ٹیلے سے باہر نکلی ہوئی چٹان پر جل رہا تھا۔ ٹیلے کا راستہ ناہموار اور خاردار تھا لیکن وہ والہانہ جوش کے ساتھ اوپر چڑھتے گئے۔ ان کے پاؤں لہولہان ہو گئے لیکن وہ وہاں پہنچ کر رہے، صرف ایک شخص اس چٹان سے نیچے بیٹھا تھا اور کچھ لکھنے میں مشغول تھا۔ چٹان سے دو گز کے فاصلے پر ایک جھونپڑی کھڑی تھی جس کا دروازہ چٹان کے سامنے ہی تھا اور روشنی جھونپڑی میں پہنچ رہی تھی ——— اس نے نظر اٹھائی۔ سامنے دو نوجوان کھڑے تھے جن کے چہرے تکان سے نڈھال اور پاؤں کانٹوں سے لہولہان تھے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر خوشی اور غم کی ملی جلی کیفیت پیدا ہوئی۔ اس نے کہا۔ آپ بیٹھ جائیے، میں ابھی آیا وہ جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔ دس منٹ کے بعد باہر آیا اس کے ایک ہاتھ میں نیم گرم پانی کا برتن اور دوسرے میں کپڑے کی سفید پٹیاں اور مرہم تھا۔ وہ دونوں نہیں نہیں کرتے رہے لیکن اس نے ان کے پاؤں دھوئے زخموں پر مرہم لگایا اور پٹیاں باندھ دیں۔ انور نے کہا، ہمیں افسوس ہے کہ ہماری وجہ سے آپ کو بڑی زحمت ہوئی۔ اس نے کہا یہ تو میرا فرض تھا اور فرض کی ادائی میں زحمت کا کیا سوال۔ آپ اس سنسان وادی میں کہاں سے آئے'' ہم بہت دور سے آ رہے ہیں۔ ہمارے ہاتھوں میں یہ دو چراغ ہیں، انہیں روشن کرنا ہے۔ آپ کا یہ چراغ ہمیں یہاں کھینچ لایا لیکن آپ بالکل تنہا ہیں؟ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اس وقت تو ہم تین ہیں، تنہائی کہاں ہے پھر یہ آسمان اور اس کے بے شمار ستارے، زمین اور اس کے ان گنت ذرات بھی تو ہمارے ساتھ ہیں ہر ذرہ ایک مستقل وجود ہے ان سب سے الگ جس نے ہمیں خلعت وجود بخشا وہ بھی تو ہمارے ساتھ ہے۔ ہماری رگ جان سے زیادہ قریب ——— حامد نے اپنی خوشی دباتے ہوئے کہا۔ ہم آپ کی اس ظاہری تنہائی کا سبب جاننا چاہتے تھے۔'' اس شخص کا ساتھ کون دے جو ظلم کو انصاف نہ کہتا ہو جو خاشاک کے تودے کو کوہ دماوند، زہر کو تریاق اور تاریکی کو نور نہ کہتا ہو۔ اس دنیا میں اب یہ حال ہے کہ تم خود ظلم کرو اور

ظالموں کا ساتھ دو، ہزاروں تمہارے ساتھ ہوں گے۔ تم خود زہر پیو اور دوسروں کو پلاؤ، ایک گروہ تمہارا ساتھی ہوگا۔ پوری زندگی کو چھوڑ دو اور آنکھیں بند کر کے صرف روٹی روٹی کا نعرہ لگاؤ، انسانوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ تمہارے گرد ہوں گے۔ عورتوں اور مردوں کے بے روک ٹوک اختلاط کی حمایت کرو، افسانے لکھو، ڈرامے مرتب کرو۔ شعر کہو، تم پر پیسوں کی بارش ہوگی، تحسین و آفرین کے ڈونگڑے برسیں گے، سیکڑوں مرد اور عورتیں تمہیں آنکھوں پر بٹھائیں گی۔ بس اسی سے سمجھ لو کہ میں کیوں تنہا ہوں۔ حامد نے کہا تو کیا آپ ان حالات سے گھبرا کر "گوشۂ عافیت" میں بھاگ آئے ہیں۔ اس نے ایسے لہجے سے جس میں عزم و ارادہ کی بجلیاں کوند رہی ہی تھیں کہا نہیں بالکل نہیں، میں زندگی کی منجدھار سے منہ موڑنے والا نہیں۔ میں ادیب ہوں اور ادیب انسانیت کا خادم ہوتا ہے اس کا مقصد فلاح انسانیت ہے اور انسانیت نام ہے ایک کل کا جس کے بہت سے اجزا ہیں۔ اس کل کی فلاح اس میں ہے کہ اس کے ہر جز کو ٹھیک ٹھیک وہ درجہ دیا جائے جو اس کل میں اس کا ہے۔ اس پورے مجموعے پر نظر رکھی جائے، اگر ہم اسے الگ الگ کر دیں تو انسانیت انتشار اور بے چینی سے کبھی نہیں بچ سکتی۔ ہمارے ادیبوں کی سب سے بڑی غلطی یہی ہے کہ انھوں نے اسے منتشر کر کے چھوڑ دیا ہے۔ انسانی زندگی کی مشین جس انجینئر نے بنائی ہے ضروری ہے کہ ہم اس کی ہدایتوں کے مطابق ہی اس سے کام لیں ورنہ ہم اسے بگاڑ کر رکھ دیں گے اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان دو باتوں کو نظر انداز کر دینے سے یہ کس طرح بگڑ کر رہ گئی ہے ـــــ میں نے موجودہ ادب سے بغاوت کی ہے اور طے کر لیا ہے کہ اس کو اس کے اصل مقصد کی طرف پھیر کر دم لوں گا۔ یہ چراغ میں نے اسی غرض سے جلایا ہے اس ایک چراغ سے ہزاروں لاکھوں چراغ روشن کئے جا سکتے ہیں اور شکر ہے کہ روشن کئے بھی جا رہے ہیں۔ آپ جیسے حوصلہ مند نوجوان ادھر بڑھ رہے ہیں۔ اس چراغ کو آپ چراغ راہ کہیں یا چشمۂ انوار بہر حال یہ اُس ادب کی روشنی ہے جو پوری انسانیت کو روشن کریگی ـــــ انور اور حامد کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور ان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو ٹپک رہے تھے۔

رزم گاہ زندگی میں غم کے فواروں سے کھیل
کھیل صبح و شام ان دلچسپ نظاروں سے کھیل

اے مسافر! ظلمتوں کو دیکھ کر گھبرا نہ جا
خود ہی مشعل بن کے اب تاریک تر غاروں سے کھیل

آب و آتش خاک و باد آمادۂ پیکار ہیں
سوچتا ہے کیا قدم آگے بڑھا چاروں سے کھیل

بے محابا کود پڑ جا آتش نمرود...... میں
مثل ابراہیم شعلہ ریز انگاروں سے کھیل

خاک کے ذرات سے اب تک بہت کھیلا کیا
چل ذرا افلاک پر بھی اور سیاروں سے کھیل

سہمگیں موجوں سے ٹکرا جا نہنگوں سے نہ ڈر
غرق کر دے ناؤ کو طوفان کے دھاروں سے کھیل

لامکاں کو ڈھونڈ دوش باد پر ہو کر سوار
اے کھلاڑی! جا سبک پرواز طیاروں سے کھیل

برگ گل سے کھیلتے رہنا بھی کوئی کھیل ہے
کھیلنے کی آرزو ہو تو شرر پاروں سے کھیل

ہے دلیل جبن تعمیر نشیمن کا خیال
تو عقابوں کی طرح دن رات کہساروں سے کھیل

ساز و بربط کے ترانوں میں کبھی تو کھو نہ جا
ہاں! رباب زندگی کے مرتعش تاروں سے کھیل

نغمۂ شور سلاسل سے تجھے آجائے وجد
قصر و ایواں چھوڑ کر زنداں کی دیواروں سے کھیل

دہر فانی میں ہر اک انسان کا ظرف آزما
گاہ دیوانوں سے کھیل اور گاہ ہشیاروں سے کھیل

آ کہ تجھ کو زندگی کا کھیل بتلاتا ہوں میں
اژدروں سے کھیل توپوں اور تلواروں سے کھیل

جرسِ کارواں

مضطر اعظمی

اذانِ دعوتِ حق آرہی ہے
زمیں بیدار ہوتی جارہی ہے
فضا میں ایک ہلچل سی ہے برپا
پیا پے موج بڑھتی آرہی ہے
سیاہی کا جگر پھٹتا ہے جاتا
نوید صبح گاہی آرہی ہے
ختم افسون باطل ہو رہا ہے
حقیقت اپنا نغمہ گا رہی ہے

یہ نوکِ خار بھی اب تو چمن میں
شعورِ گل تراشی پا رہی ہے
نظام نو پہ طاری کھنگی ہے
پیام نو "کھنگی" لا رہی ہے
نشید حق سے گونج اٹھی ہے دنیا
صدائے جرس بڑھتی جارہی ہے
ابھی کچھ راکھ میں چنگاریاں ہیں
حرارت زندگی میں آرہی ہے

عبث دھڑکن نہیں ہے دل میں ہمدم
سنو آواز کوئی آرہی ہے

اے دوست!

تاج العرفان عثمانی

تجھکو ایمان کی کہتا ہوں ذرا سن ــــ اے دوست
جھوٹا ہی تو رہیگا ہمدم !
کیا حسیں خیال کے گہوارے میں
کیا ترے کام و دہن لطف ہی لیں گے ہر دم
ریزہ سم میں، زہر پارے میں،
لہلاتے ہوئے شعلوں میں نہ ٹھنڈک ہوگی ــ !
ان تہان زر و سیم کے در پر کب تک
طرۂ عظمتِ آدم کو گرانا ہوگا ــ
کچھ بتا مجھکو تو آخر اے دوست
کب تک افلاس کے مارے ہوئے انسانوں سے
انتقام کرتے رہیں گے چنگیز
اُف، یہ جنگوں کا تسلسل، یہ قتال
آگ ہی آگ ہے شعلے ہی شعلے رقصاں
آج پانی سے بھی وافر ہے لہو انساں کا
آخر ــــ
ندیاں خوں کی بہیں گی کب تک ؟
کیا ــــ؟
جب تک انسان پہ انساں کی خدائی ہوگی !
ایک ہی اس کا مداوا ہے ذرا سن لے تو
باطل احکام کے آگے نہ جھکے
عظمت آدم کی جبیں
کسی انسان کا انساں پہ تسلط نہ رہے
نہ ہوں محمود و ایاز
حاکم ارض و سما کا چلے سب پر قانون
سچے ہمدردی و اخلاص و محبت کے چلیں
مالک الملک کے احکام کی سرتابی سے
کریں پرہیز و گریز
پھر تو اس ارض و سما پر ــــ اے دوست
شادیانے ہی مسرت کے بجیں گے ہر سو !

انقلاب کے لئے ــــــــ مرزا فراست بیگ

(حلقۂ ادب اسلامی گورکھپور کی تیسری مجلس میں پڑھا گیا)

دیکھئے یہاں کچھ کامریڈس جمع ہیں۔ شاید آج کی رات کوئی میٹنگ ہے۔ سکریٹری صاحب کھدر کی دھوتی اور جواہر بنڈی میں کامریڈ گپتا کرتے اور پائجامے میں۔ کامریڈ نذیر پتلی مہری کے پائجامے اور شیروانی میں اور کامریڈ جگن سرخ نیکر اور سرخ قمیص میں جن پر مختلف قسم کے دھبے ہیں۔ اِن کے بال بکھرے ہوئے ہیں اور داڑھی شیو کی پیاسی ہے۔

سکریٹری صاحب نے سب سے کام کی روداد معلوم کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ کامریڈ جگن بیان کرنے لگے۔ میں نے اپنے مزدوروں کے حلقے میں بڑی مستعدی سے کام کیا ہے۔ میں نے اُن کی المناک زندگی۔ اُن کے بھوکے پیٹ اور اُن کے ترستے ہوئے معدے کا نقشہ کھینچ کر اُن کے سامنے رکھ دیا۔ اُن کے احساسِ احتیاج کو خوب اُبھارا۔ اور اُن میں یہ روح پیدا کر دی کہ وہ کسی بھی شرط پر مل مالکوں۔ سرمایہ داروں اور غیر اشتراکی نظام سے آسودہ نہیں ہو سکیں گے اُن میں وہ ابیج اور جرأت پیدا کر دی کہ پہلے موقع میں سرمایہ داروں کے ملوں۔ کارخانوں اور بڑے بڑے گوداموں کو راکھ میں تبدیل کرنے کی تدبیریں سوچیں۔ اُن کے خزانوں کو لوٹ کر آپس میں تقسیم کر لیں۔ اور اگر ضرورت ہو تو اُن کی پھولی ہوئی توندیں چھریاں بھونک دیں۔ جب اُن سے کہا جائے وہ زمینداروں کی میلوں تک لہلہاتی ہوئی کھیتیاں سرخ شعلوں کے حوالے کر دیں۔ غرض اُن پر یہ حقیقت بالکل واضح ہو چکی ہے کہ جب تک اس کمینی دنیا کو ایک بار برباد نہ کر دیا جائے گا۔ انقلاب نہ آئے گا۔

"اچھا بہت خوب" سکریٹری صاحب نے فرمایا اور کامریڈ نذیر کو اشارہ کیا۔ ہاں سنئے۔ میرے حلقۂ کار میں زیادہ تر مسلم عوام ہیں۔ اُن پر اپنی پالیسی صاف کرنے کے سلسلے میں۔ میں نے اپنے بیشتر اقوال کو ڈاکٹر اقبال اور مولانا حسرت موہانی کے خیالات کی طرف منسوب کیا۔ انھیں یہ سمجھایا کہ اسلام اور اشتراکیت میں کوئی فرق نہیں۔ اور کم از کم اتنی بات تو اُن کی سمجھ میں آہی گئی کہ اسلام اور اشتراکیت کے معاشی نظام اگرچہ اپنی ہیئت کے اعتبار سے ایک نہیں لیکن مقصد میں تو ایک اور صرف ایک ہیں۔ نیز اشتراکی تحریک کے بعد میں اسلامی تحریک میں بدل جانے کے قوی امکانات ہیں۔

کامریڈ نذیر کے بعد کامریڈ گپتا کی باری آئی۔ انھوں نے بتایا کہ ہندوؤں کے حلقہ میں سرگرمی سے کام ہو رہا ہے۔ مہا بھائی ہندوؤں کو ہم نے یہ سمجھایا ہے کہ کمیونزم سے دھرم کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا اور کانگریس کا زور کمیونزم ہی سے ٹوٹ سکتا ہے۔ کانگریسی ہندوؤں کو بھی ہم "میری کہانی" سے لمبے لمبے اقتباسات سناتے ہیں۔ اور کم از کم اُن کو اس شک میں تو مبتلا کر ہی دیتے ہیں کہ جواہر لال کچھ بدل گئے ہیں۔

سکریٹری صاحب بطور ہدایت کے فرمانے لگے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جو کچھ کام ہو رہا ہے کافی اطمینان بخش ہے۔ لیکن ہم کو اپنے ذہن میں یہ بات بار بار دہراتی چاہئے کہ کام زیادہ کرنا ہے اور شور بہت کم۔ یہاں ہمارے کام کا تقریباً پورا حصہ خفیہ کارروائی UNDER GROUND WORK

پر مشتمل ہے۔ بالکل اسی راہ سے گھس کر ہم کو پورے ملک میں سرخ انقلابی خیالات کی بارود بچھا دینی ہے اور پھر ہدایت کے مطابق جہاں جہاں ضرورت ہوگی فیتہ لگایا جاتا رہے گا۔ اس راہ میں ہم کو ہرگز یہ نہیں سوچنا ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور اس سے انسانیت کو کتنی ایذا پہنچ رہی ہے۔ اس لئے کہ سرخ اشتراکی انقلاب اسی طرح لایا جا سکتا ہے۔ کسی تشدد آمیز حرکت کے وقت اگر ہمارے دل میں کوئی جھوٹی محبت یا رعائت کا جذبہ پیدا ہو تو ہم کو سرخ انقلاب کے معمارِ عظیم اسٹالن کے خونی طریقہ کار پر نگاہ ڈالنی چاہئے۔ جو توڑ پھوڑ صرف تعمیر کے لئے ہو اُس میں اپنی حکمتوں۔ صلاحیتوں اور خونی طاقتوں کو استعمال کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھنا چاہیئے۔ اس لئے کہ یہ ہنگامے لوٹ مار۔ خونریزی۔ قتل و غارت اور قیامت برپا کرنے کے بعد چین کی طرح ہندوستان اور پھر دھیرے دھیرے ساری دنیا سرخ انقلاب کی گود میں آجائے گی۔ اُس وقت انسان کسی خیالی جنت کا حریص نہ ہوگا۔ اس کے گلے سے موہوم خدا کی غلامی کا طوق نکل کر گر جائے گا۔ بورژوا کے باندھے ہوئے سب غیر فطری بندھن ٹوٹ جائیں گے اور پھر سماجی تعلقات اُن اصولوں پر قائم کئے جائیں گے جو سرخ فلسفے میں پیش کئے گئے ہیں۔ لیکن ساتھیو! اب میں اپنے ایک آخری جملے پر یہ اجلاس ختم کرتا ہوں کہ دنیا میں اتنا بڑا سرخ انقلاب لانے کے لئے سرخ خون کی سخت ضرورت ہے۔

اس مجلس میں کچھ دوسرے مقامات کے ساتھی بھی نظر آرہے ہیں۔ غالباً سکریٹری صاحب کو آج کوئی اہم خطبہ دینا ہوگا۔ پتہ نہیں کیوں کسی نے مکان کا دروازہ بھی بند کر دیا۔ چند منٹ ادھر اُدھر کی گفتگو ہوتی رہی۔ پھر سکریٹری صاحب نے جیب سے ایک تار نکالا اور کہنے لگے کہ دھرتیج نام کے ایک نامعلوم شخص نے ایک تار بھیجا ہے۔ کہ میں بیمار ہوں آکر لے چلو۔ دوستو خوشی کی بات ہے کہ ایک بہت بڑا کام ہوگیا۔ اس تار کا مطلب یہ ہے کہ کامریڈ دانیال اپنا کام ختم کر چکے۔ انھوں نے ہوشمندی سے فیکٹری میں ایک جگہ پائی مزدوروں میں گھلے ملے اور بڑی راہ و رسم پیدا کی۔ بالآخر اُن کے سینے جسم میں جو آگ بھری ہوئی تھی اُس نے اپنا جوہر دکھایا۔ اور فیکٹری کا روائی گودام پورا کا پورا جل کر خاک ہوگیا۔ لیکن آپ کو زیادہ خوش بھی نہیں ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ اس ایک واقعہ سے کچھ نہیں ہونے کا۔ سرخ انقلاب برپا کرنے کے لئے اس قسم کے ہزاروں حادثے ہم کو ملک میں پیدا کرنے پڑیں گے۔ کیونکہ تعمیر کے لئے بھیانک تخریب کی ضرورت ہے۔ اور اس تخریبی پروگرام کو عمل میں لانے کے لئے ہم کو نظام حکومت کے تمام شعبوں کو فیل کرنے اور رہے سہے نظم میں بھی بدنظمی پیدا کرنے کی انتہائی کوشش کرنی ہے۔ یہ کام مسلسل محنت اور بڑی مستعدی چاہتا ہے۔

اس ریلوے ہڑتال کے سلسلے میں ہمارے حلقے کی جماعتوں کو شہر نمبر ۳۱۸۔ نمبر ۳۲۵۔ اور نمبر ۴۵۲ میں تار کے ذرائع کو کاٹ دینا ہے اس بارے میں کامریڈ لارنس اپنی ذہانت اور صلاحیت سے کام لے کر عمال کی تقرری کر دیں اگر یہ کام بخوبی انجام پا گیا تو ہڑتال کی کامیابی کے علاوہ چیخ پکار کی صدائیں ہزاروں میل کی دوری میں پھیل جائیں گی۔ بے شمار مہاجنوں کو اپنے کاروبار میں لاکھوں روپیہ کا نقصان ہوگا۔ غریب طبقہ کو تار سے کم واسطہ ہوتا ہے۔ وسطی اور اونچے طبقہ میں کھلبلی مچے گی۔ لوگ کسی مرنے والے کو دیکھنے کے لئے کسی کو تار دینے جائیں گے اور تار کٹے ہوں گے۔ کہیں کوئی لاش پڑی ہوگی۔ کہیں کچھ لٹ چکا ہوگا کہیں کچھ جل گیا ہوگا۔ لیکن ان حادثات

کی کہیں خبر نہ بھیجی جا سکے گی۔ حاکموں کے دماغ کی نسیں تن جائیں گی۔ وہ سنک جائیں گے۔ بوکھلا جائیں گے۔ کہ اب کیا کریں۔ کیسے اطلاع دیں۔ کیسے فوج منگائیں۔ کیسے حفاظت کریں۔ اس سلسلے میں عوام کی پریشانیاں ایک خاص رنگ لائیں گی۔ لوگ ان تمام واقعات کو حکومت کی ناانصافی اور بدنظمی کا نتیجہ سمجھیں گے اور اس طرح ہم اُن میں موجودہ نظام کے خلاف ایک عام بے اطمینانی پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے رہیں گے۔

ریلوے لائن کے سلسلے میں آج کا اخبار آپ نے دیکھا ہے۔ جیسا کہ میں نے کسی پہلی نشست میں بیان کیا ہوگا یہ کام کامریڈ گھمسان اور کامریڈ زبیر کے سپرد تھا۔ اپنے بنائے ہوئے اس حادثے کی کچھ تصویر میرے ذہن میں آرہی ہے۔ دیکھئے یہ گاڑی لائن سے اتر گئی ہے۔ اتنے ڈبے خراب ہوگئے۔ اتنے افراد ہلاک ہوئے۔ یہ عورت رو رہی ہے۔ اس کا بیٹا وہاں مر رہا تھا۔ اُسے دیکھنے جا رہی تھی۔ وہ طالب علم کوئی امتحان دینے جا رہے تھے۔ وہ تین چار آدمی جو وہاں بدحواس نظر آرہے ہیں اُس نعش کے ساتھ ہیں جس کے جسم سے روح ابھی راستے ہی میں پرواز کر رہی ہے۔ وہ سوچ رہے ہیں کہ اس نعش کو وہ اس بیچ راہ میں کیا کریں۔ ساتھیو! یہ مناظر کچھ تکلیف دہ ضرور ہیں۔ اس میں کچھ غریب بھی پستے ہیں لیکن ہم کیا کریں۔ ہم ایسا کرنے پر مجبور ہیں۔ لیکن یہ حادثے کچھ خوش نما مناظر بھی پیش کرتے ہیں۔ وہ دیکھو فرسٹ کلاس اور آر۔ ایم۔ ایس کے ڈبوں میں لوٹ مار شروع ہوگئی۔ مہاجن لوگ چیخ رہے ہیں۔ افسران کراہ رہے ہیں۔ گورنمنٹ کا خزانہ لوٹا جا رہا ہے۔ ہاں — یہ لوٹنے والے کون ہیں؟ کیا ڈاکو؟ کیا چور؟ کیا غنڈے؟ نہیں، ایسا کہنے والے سب جھوٹے ہیں۔ کوئی چور۔ کوئی ڈاکو۔ کوئی غنڈہ نہیں۔ یہ ہیں بھوکے مزدور۔ غریب کسان۔ جب پیٹ نہیں بھرے گا۔ یہ سب کچھ کریں گے۔ باقی رہے دھوکے والے الفاظ۔ یعنی۔ ایمان۔ اخلاق۔ قناعت صبر و تحمل تو یہ سب سامراجی اصطلاحات ہیں۔

اوپر کا یہ نقشہ دیکھنے کے بعد یاد رکھئے کہ ہم سب کو اس قسم کے سرخ انقلابی مناظر پیدا کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرنی ہے۔ اس وقت جو کام آپ کے سامنے رکھا گیا ہے۔ اس کو بڑی ہوشیاری اور صفائی سے انجام دیجئے گا۔ اور بس باقی چیزیں آئندہ رات زیادہ گذر گئی ہے۔ اب یہ مجلس برخاست سمجھئے۔

ساتھیوں نے ایک دوسرے کو لال سلام کیا اور منتشر ہوگئے۔!

ادبیات نمبر کے طلب گاروں سے

۱۔ ادبیات نمبر ایک محدود تعداد میں شائع ہو رہا ہے اس لئے اُس کے آرڈر جلد از جلد روانہ کریجئے۔
۲۔ تمام ایجنٹ حضرات کے پاس ادبیات نمبر ذریعہ وی پی روانہ کیا جائے گا اس لئے آرڈر دینے کے بعد وی پی وصول کرنا لازمی ہے۔ ۳۔ ماہنامہ انوار کی سالانہ قیمت میں ۸ر کی کمی کر دی گئی ہے اس لئے آیندہ سے سالانہ صرف ۸؎ بدل اشتراک ہوگا۔ ۴۔ "ادبیات نمبر" کی قیمت تقریباً ۸؎ ہوگی۔
۵۔ جو حضرات سالانہ خریداری قبول فرمائیں گے صرف انہی کی خدمت میں ادبیات نمبر عام پرچوں کی طرح روانہ کیا جائے گا۔

مسائلِ حاضرہ

از:- ادارہ

ہندوستان اور دولت مشترکہ

ہندوستان کے دولت مشترکہ کے دائرہ اثر میں رہنے کی جو شرائط طے پائی ہیں۔ وہ مختصر طور پر یہ ہیں کہ (۱) ہندوستان شاہی ترجیح" IMPERIAL PREFERENCE کے قانون سے اُسی طرح فائدہ اٹھا سکتا ہے جس طرح دولت مشترکہ میں رہنے والے دوسرے ممالک اس معاشی بندھن سے مستفید ہوتے ہیں (۲) ڈومنین کی اصطلاح ہندوستان کے لئے استعمال نہ ہوگی۔ (۳) پوری دولت مشترکہ میں ہندوستان کے شہریوں کو وہ حقوق حاصل رہینگے جن سے وہ اب تک فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ (۴) جب ہندوستان ایک آزاد جمہوریہ (REPUBLIC) ہوجائے گا تو ہندوستان کے گورنر جنرل کا دفتر بہ حیثیت نمائندہ تاج کے برخاست کردیا جائے گا اسی طرح یہ بات بھی کہی گئی کہ ہندوستان دولت مشترکہ کے ممالک سے کسی فوجی معاہدہ کا پابند نہ ہوگا بلکہ اس معاملہ میں اُس کو پوری پوری آزادی حاصل رہیگی۔

ان چند نکات پہ غور کرنے سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان پر سے وہ تمام پابندیاں اُٹھ چکی ہیں جو دولت مشترکہ کا رکن رہنے کی صورت میں اس پر ابتک عائد تھیں اور جنکی وجہ سے اُس کی آزادی متاثر ہو رہی تھی مگر اب وہ سارے بندھن ٹوٹ چکے ہیں۔ غلامانہ زندگی کا ایک ایک تار بکھر چکا ہے اور ہندوستان آزادی کامل کی فضا میں سانس لے رہا ہے۔ لیکن کیا امر واقعہ بھی یہی ہے؟ اگر ہم کسی قدر غور سے ان اصولوں کا جائزہ لیں جن کے تحت ہندوستان کے دولت مشترکہ سے بندھے رہنے کی بات چیت طے پائی ہے تو ہم بآسانی اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ انگریزی اقتدار کے شکنجے میں ہندوستان کا جسم ابھی تک کسی نہ کسی حد تک کسا ہوا ہے۔ البتہ فرق یہ ہوا ہے کہ پہلے پابندیاں اوپر سے عائد ہوتی تھیں اور اب جو کچھ ہوا ہے وہ داخلی انشراح اور ایک دوسرے کے ساتھ فطری جذبۂ تعاون کے تحت ہوا ہے۔ "شاہی ترجیح" کے قاعدے کے مطابق جہاں ہندوستان کو دوسرے قلمروی ممالک سے تجارتی فائدہ اٹھانے کے مواقع حاصل ہیں۔ وہاں اس دائرے کے دوسرے ممالک بھی باہر کے ممالک کی بہ نسبت ہندوستان سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں گویا یہ اصول بہ یک وقت آزادی بھی ہے اور پابندی بھی۔ اسی طرح شہریوں کے حقوق کا معاملہ ہے جس کی رو سے ہندوستان مجبور ہوگا کہ ایک قلمروی ملک کے باشندے کو غیر قلمروی ملک کے باشندے کے مقابلہ میں ترجیح دے۔ اب رہا فوجی دفاع کا معاملہ تو اس میں شک نہیں کہ فی الحال اس بارے میں ہندوستان آزاد ہے لیکن کیا آئندہ اس بات کا کوئی موقع نکل سکتا ہے۔ کہ ہمارا ملک کسی ایسے ملک سے معاہدہ کر سکے جو دولت مشترکہ کے دائرے سے باہر یا اُس کا مخالف ہو؟ ظاہر بات ہے کہ ہندوستان کسی طرح اس دائرے کے باہر قدم نہ رکھ سکے گا اور اُن مفادات کی قربانی برداشت نہ کر سکے گا جو دولت مشترکہ میں رہنے سے اُس کو حاصل ہیں۔ گویا ان معاشی اور معاشرتی رشتوں کی تہہ میں ایک فوجی معاہدہ بھی خود بخود چھپا ہوا ہے جو حالات کی

نزاکت کے ساتھ ہر وقت اُبھر کر اوپر آسکتا ہے۔ اب رہیں دوسری تبدیلیاں تو وہ محض نام کی ہیں۔ ورنہ اُن کی اصل حقیقت نہ تو پہلے کچھ تھی اور نہ آئندہ اُن کی وجہ سے کوئی نمایاں فرق ہو سکے گا۔

ہماری رائے میں ہندوستان کی وہ ساری مجبوریاں جن کی وجہ سے وہ دولت مشترکہ کا رکن رہنے پر مجبور ہے صرف اس وجہ سے ہیں کہ ہندوستان اپنا کوئی جداگانہ نظام زندگی نہیں رکھتا۔ بلکہ دانستہ یا نادانستہ وہ بھی زندگی کے اُسی راستے پر چلا جا رہا ہے جس پر دولت مشترکہ کے دوسرے ارکان جا رہے ہیں۔ اس لئے اگر ہندوستان اس بات کا خواہشمند ہے کہ وہ دنیا کے مختلف گروہوں سے الگ رہے اور ہمیں یقین ہے کہ ہر ہندوستانی کی یہ دلی خواہش ہے ——— تو پھر اس کی صرف ایک ہی صورت ہو سکتی ہے۔ وہ یہ کہ ہندوستان خود کسی مخصوص نظام حیات کا علمبردار ہو۔ دوسروں کے پیچھے چلنے کے بجائے دوسروں کو اپنے پیچھے چلانے کی سکت رکھتا ہو اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ مادیت کو جو اس وقت مغربی ممالک کے تمام نظامات کی روح ہے ہندوستان سے خارج کیا جائے اور اس کے برعکس خدا پرستی کی بنیاد پر ایک ہمہ گیر نظام زندگی قبول کیا جائے۔ "دنیوی حکومت" اور "غیر مذہبی حکومت" کے موجودہ مغربی فیشن" کو ترک کیا جائے اور خدا شناسی اور "خدائی حکومت" کا علم بلند کیا جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر ہمارے ملک نے یہ کام کر لیا تو وہ دوسروں کے دائرہ اثر میں شریک ہونے اور اُن کے بندھنوں میں بندھنے کے بجائے دنیا بھر کا رہنما اور سربراہ کار بن کر رہے گا۔

جمعیۃ علماء ہند اور اسلام

جمعیۃ علماء ہند نے اپنے سولھویں اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں یہ طے کیا کہ جمعیۃ "سیاست" سے علیحدگی اختیار کرے گی۔ و نیز جمعیۃ مسلمانوں کے معاشرتی اور "مذہبی" سدھار کے لئے ایک پروگرام پر عمل کریگی۔ یہ دو باتیں بہت ممکن ہے رہنمایان جمعیۃ کے نزدیک وقت کا بہترین حل ہوں۔ لیکن ہمارے خیال میں یہ نہ صرف ایک غلط حل ہیں بلکہ ایک لحاظ سے یہ کوئی حل ہی نہیں ہیں۔ سیاست سے علیحدگی کا مطلب آخر کیا ہے؟ کیا یہ کہ جمعیۃ مسلمانوں کو موجودہ سیاسی جماعتوں۔ کانگریس، سوشلسٹ، اور کمیونسٹ ہر ایک میں شرکت کی اجازت دیتی ہے۔ یا یہ کہ اُس کے نزدیک یہ سب غلط سیاسی اصولوں پر چل رہی ہیں اور اس نے جو اصول اختیار کئے ہیں وہ درست ہیں۔ اگر بات یہی دوسری ہے تو پھر جمعیۃ کو اپنے جداگانہ سیاسی مسلک کا اعلان کرنا چاہئے۔ لیکن اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تمام سیاسی مسالک اس کے نزدیک یکساں درست ہیں۔ اور یہ چیز سیاست سے علیحدگی نہیں بلکہ ہر قسم کی سیاست کی اندھی تائید ہے۔

اسی طرح دوسری بات پر غور کیجئے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کی اصلاح کے لئے ایک "مذہبی" پروگرام پر عمل کیا جائے گا۔ لفظ "مذہبی" چونکہ "سیاست" سے علیحدگی کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ اس لئے اس کا مطلب یہ نکلا کہ ایک ایسے لائحہ عمل پر کام ہوگا جو "نیم مذہبی" یا "نیم اسلامی" بلکہ زیادہ صاف لفظوں میں "غیر اسلامی" ہوگا۔ کیونکہ اسلام کی رو سے مذہب اور سیاست دو جداگانہ چیزیں نہیں ہیں۔ سیاست مذہب کا ایک شعبہ ہے۔ اور مذہب یعنی اسلام کو اختیار کرنے اور اُس پر عمل کرنے کے معنی خود بخود ایک خاص قسم کے سیاسی اصول پر عمل کرنے کے ہو جاتے ہیں۔ لیکن جمعیۃ علماء ہند اسلام کے سیاسی اصولوں کو قبول کرنے یا ان کو پیش کرنے سے انکار کرتی ہے۔ اور صرف

مذہبی" اصولوں پر کاربند رہنا چاہتی ہے جو کہ خالص اسلامی نقطۂ نظر سے ایک مہمل بات ہے۔ اسی طرح کارپردازانِ جمعیتہ نے ایک تیسری راہ یہ بھی اختیار کی ہے کہ وہ خود تو "سیاست" سے الگ رہتے ہیں (جیسا کہ انہوں نے طے کیا ہے) اور صرف "مذہبی گروہ" بن گئے ہیں جس کا کہ انہیں اقرار ہے۔ لیکن مسلمان قوم کو اُن کا مشورہ یہ ہے کہ وہ کانگریسی سیاسیات میں حصہ لیں اور کانگریس کے دامن سے اپنا دامن باندھ لیں۔ حالانکہ ایک سادہ سا انسان بھی اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ یہ مشورہ بجائے خود ایک سیاست ہے، اور نہ تو جمعیتہ ایک غیر سیاسی ادارہ ہے اور نہ وہ ایک خالص مذہبی اور اسلامی جماعت ہے۔

الغرض یہ ہے ہندوستان کے علمائے اسلام کی سب سے بڑی شیرازہ بندی کا مختصر تجزیہ۔ ہمارے خیال میں اس وقت جو مشکل ایک پائدار نصب العین اختیار کرنے میں علمائے جمعیتہ کو پیش آرہی ہے اُس کی صرف ایک ہی وجہ ہے اور وہ ہے خالص اسلامی نصب العین اور موجودہ دنیوی اغراض، گروہی مفادات اور وقتی سیاسیات کے درمیان کسی ایسی پگڈنڈی کی تلاش، جو اسلام اور دنیاویت کے درمیان درمیان واقع ہو اور ع رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی، کہ مصداق دونوں چیزیں جمعیتہ کے دامن میں لا ڈالتی ہو۔ حالانکہ جیسا کہ قرآن مجید میں کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے دو دل نہیں بنائے ہیں کہ ایک دل میں تو دُنیا کی محبت ہو اور دوسرے دل میں خدا کی محبت اپنا جلوہ دکھلائے، ہم تمام علمائے ہندوستان کو اسلام خالص کی طرف دعوت دیتے ہیں اور انہیں اپنا حقیقی منصب یعنی جانشینیِ انبیاء، "یاد دلاتے ہیں۔ کیا اتنی ناکامیوں اور بے وقعتیوں کے بعد بھی وہ حقیقت کی طرف پلٹ آنے سے شرماتے ہی رہیں گے؟

پاکستان اور اسلامی نظام

پاکستان کی مجلس دستور ساز نے اپنے ملک میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے جہاں تک اصول کا تعلق ہے۔ ہم اس فیصلہ کو ایک نیک فال سمجھتے ہیں اور نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا کے دوسروں ملکوں کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کی بہت سی برکتوں میں سے ایک برکت قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یعنی اس اقرار لسانی کے بعد ہی پاکستان پر فوراً یہ ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے کہ وہ اسلامی اصولوں کو نافذ کرنے کے لئے جلد از جلد کوئی موثر اقدام کرے۔ پاکستان ہمارا ہمسایہ ملک ہے۔ اور جب اُس نے اسلام جیسے فلاح و خیر کے نظام کو قبول کرنے کا اعلان کیا ہے تو وہ اس پر عمل کرنے میں ذرا سی بھی کوتاہی نہ دکھائے۔ اگر خدانخواستہ پاکستان نے اس اعلان کے بعد کھلی ہوئی گمراہی اختیار کر لی تو اس سے اکیلے پاکستان ہی کو نہیں بلکہ ساری دنیا میں اسلام کے وقار کو دھکا پہنچے گا اور مسلمان اب سے زیادہ ذلیل اور مطعون ہونگے۔ انفرادی بدی، کسی نیکی کے مٹانے میں اتنا نقصان نہیں پہنچاتی جتنا نقصان نیکیوں کے خلاف اجتماعی بدی سے ہوتا ہے۔ فرد کے مقابلہ میں اسٹیٹ کی بے راہ روی اپنے اندر تباہیوں اور بربادیوں کا ایک زبردست آتش فشاں رکھتی ہے جس کے لاوے سے انسانی تاریخ کے اوراق صدیوں تک جھلس جاتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ پاکستان کے کارپرداز اسلام کا نام لینے کے بعد بھی اپنے داخلی اور خارجی مسائل کو اسی غلط طریقہ پر حل کرتے رہے جس طرح وہ اب تک کر رہے ہیں۔ اور انہوں نے خود اپنے ملک کے عوام اور اپنے ہمسایوں اور پڑوسیوں سے دوستی اور الفت کا رشتہ نہ بڑھایا، احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا فریضہ انجام نہیں دیا، بلکہ یوں تو اسلام ہی کا جزءِ شعار بننے دیا اور کام وہی ہوتا رہا جو پہلے ہوتا تھا۔ تو پھر پاکستان کا

دامن روز بروز خار دار جھاڑیوں میں الجھتا ہی رہے گا۔ کسی ہمسایہ ملک سے اُس کے دوستانہ روابط قائم نہ ہوسکیں گے۔ اور ایک دن اس کے وجود کو بھی سخت خطرہ لاحق ہوجائے گا۔

لیکن ہماری دعا ہے کہ پاکستان غلط منزل کی طرف چلنے کی بجائے صحیح راستہ اختیار کرے اور قرار داد مقاصد کے مطابق دنیا میں اسلام کی بھلائیوں اور خوبیوں کو پھیلانے والا سرچشمہ بن جائے!

اسٹیٹ کانگریس اور مسلمانوں

کچھ عرصے سے ریاست حیدرآباد کی اسٹیٹ کانگریس نے مسلم عوام سے رابطہ کی تحریک (MUSLIM MASSCONTACT MOVEMENT) بڑے زور سے شروع کردی ہے۔ اور مسلمانان حیدرآباد کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں کانگریس میں بھرتی کرنے کے لئے مختلف ڈھنگ اختیار کئے جارہے ہیں۔ یہ طریقہ کار بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی فضا کو ہموار اور یکساں بنانے کے لئے مفید رہے گا لیکن فی الواقع اس طرح کے طریقوں سے نہ تو کسی جماعت کو کوئی خاص تقویت حاصل ہوسکتی ہے اور نہ حقیقی معنوں میں جمہوریت، مساوات اور ہم خیالی کا بیج بویا جاسکتا ہے۔ بلکہ جہاں تک ہم نے غور کیا ہے۔ ہماری رائے میں یہ اصول "جماعتی آمریت" یعنی کانگریس PARTY DICTATORSHIP سے مماثلت رکھتا ہے جس کی ایک جھلک اس وقت روس کے بالشویک نظام میں نظر آتی ہے۔ اگر اسٹیٹ کانگریس کا منشاء یہ ہے کہ عوام کے خیالات جمہوری طرز پر ڈھلیں، معاشرت میں مساوات کا نظریہ کارفرما ہو، معاش میں ہر ایک کو اُس کا حق ملے یہاں تک کہ پوری سوسائٹی اور خود حکومت خالص جمہوریت کے رنگ میں رنگ جائے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ کانگریسی کارکن اپنی جمہوری تحریک کے اصولوں اور نظریات کا زیادہ سے زیادہ پرچار کریں۔ زندگی کے دوسرے اصولوں کے مقابلہ میں اُن کی علمی اور عملی بالاتری ثابت کر دکھائیں پھر اس کے ساتھ ساتھ دوسری جماعتوں کو بھی یہ موقع دیا جائے کہ اگر اُن کے پاس سچی جمہوریت، اور حقیقی مساوات کے اصول ہیں تو وہ اُن کو میدان میں لائیں۔ تاکہ کانگریس بھی خود اُن پر غور کرے اور اس طرح سب مل کر خوش دلی اور باہمی تعاون سے ایک سوسائٹی، اور ایک قوم بن جائیں۔ جو نظریہ اور اصول سب سے اچھا ہو اُسے سب اختیار کریں۔ اگر آپ جمہوریت پھیلانا چاہتے ہیں تو اس کے لئے طریقہ کار بھی جمہوری اختیار کرنا ہوگا۔ ورنہ جس طرح ایک شخص کو سرمایہ دار بن کر سوشلزم کو کامیاب نہیں بنا سکتا اُسی طرح جمہوری اصولوں کو بھی غیر جمہوری طریقوں سے پھیلانے کی کوشش کرنا بجائے خود جمہوریت کی نفی کرنا ہے۔ جس کے اثرات خود آپ کی جماعت کے حق میں بھی، اس ملک کے حق میں بھی، اور اُن عوام کے حق میں بھی جن سے ہمدردی کی بناء پر آپ یہ کچھ کر رہے ہیں شدید نقصان کا باعث ہونگے۔ اور یہ نقصان بہت ممکن ہے آج نظر نہ آتا ہو لیکن کل اگر خدانخواستہ اس کا کوئی شدید ردعمل ہو تو آپ دیکھ لینگے کہ مقصد کی پاکی کے ساتھ ساتھ طریق حصول مقصد کی پاکی کا خیال نہ رکھنے سے۔ کیسے بڑے بڑے فتنے پیدا ہوتے ہیں۔

گوناگوں رنگ

سلسبیل ماہنامہ

ادارۂ تحریر: آباد شاہ پوری، عاصی ضیائی رامپوری

سالانہ قیمت پانچ روپیہ ٭ پتہ:- خوشاب نزد مسجد استادان

فی پرچہ آٹھ آنے ٭ ضلع شاہ پور (مغربی پنجاب)

یہ جریدہ اپنی دوسری جلد کے دور میں قدم رکھ چکا ہے آباد شاہ پوری کی زندگی بخش محنتوں کا ایک خوشگوار ثمرہ ہے۔ تحریک اسلامی کے ادبی رجحانات اور انقلاب انگیز پیام کا داعی ہے۔ اس کے دامن میں شعر و نغمہ کی رنگینی بھی ہے۔ افسانہ و ادب پارہ کا تبسم بھی ہے۔ اور تنقید و بحث و نظر کی کرنیں بھی، لیکن ہر باب ہر عنوان اور ہر مضمون خدا پرستی اور بلند تر اخلاقی قدار سے رنگا ہوا ہے۔ لکھنے والوں کا قلم اسلامی حقائق کی "روشنائی" سے بھرا ہوا ہے۔ اور ہر ایک اپنے اپنے طرز ادا کے مطابق "سلسبیل" کو لذت و شیرینی کے مختلف اجزاء کا بہترین مرکب بنانے کی سعی کر رہا ہے۔ اوّل اوّل جب اس طرز فکر پر ادب میں کام شروع ہوا تو یہ کام ایک سخت چٹان کو کاٹنے اور جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ لیکن اب تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی موسم گل میں اپنے دامن کو بڑی تیزی سے عمدہ عمدہ پھولوں سے بھرتا چلا جا رہا ہے سلسبیل کو تحریک اسلامی کے سب ہی اچھے لکھنے والوں کا تعاون حاصل ہے ہماری دلی تمنا ہے کہ اسلامی ادب کی تشکیل جدید کے خواہشمند اس رسالے سے ضرور مستفید ہوں اور ان لوگوں کے لئے بھی جو ادبی بے راہ روی اور "قلمی تضاد" میں مبتلا ہیں "سلسبیل" ایک "سوا لسبیل" کا کام دیگا۔

فردوس ماہنامہ

ادارۂ تحریر:- محمد جلیل خاں، حکیم حمید اللہ خاں، عبدالجمیل خاں

چندہ سالانہ تین روپے ۱۲ آنے

قیمت فی کاپی ۵ر

پتہ:- قائم گنج ضلع فرخ آباد۔ (یوپی)

اس رسالے کے اب تک پانچ شمارے نکل چکے ہیں۔ اور ہر شمارہ پہلے شمارے کی بہ نسبت زیادہ اچھا ہے۔ اس کا مقصود مسلمان گھرانوں کی اصلاح ہے۔ اور یہ دعوت اسلامی کو خاص طور پر کم پڑھے لکھے لوگوں اور عورتوں و بچوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اسلوب نگارش عام فہم اور سادہ ہے چھوٹی چھوٹی کہانیوں نظموں اور مضامین کے ذریعہ اسلام کی دعوت کو روشناس کرانے کا طریقہ بہت ہی مفید اور کارآمد ہے اس سے مسلمانوں کے نوخیز طبقے کی اچھی آبیاری ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے علاوہ اس کے مضامین غیر مسلمین کے لئے بھی مفید ہو سکتے ہیں بشرطیکہ وہ ان پردوں کو چاک کر کے اسے پڑھیں جو گذشتہ قومی کشمکش نے ان کے اور اسلام کے درمیان چھوڑ دیئے ہیں رسالے کی ترتیب اور طباعت اچھی ہے البتہ کتابت میں ابھی اصلاح کی گنجائش ہے۔ مگر اس ترقی کا دار و مدار تو صرف اس بات پر ہے کہ کتنے لوگ ایسے نکلتے ہیں جو اس اہم خدمت سے فائدہ اٹھانے کیلئے آمادہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ آج کل کے زمانے میں کونسا دینی کام ایسا ہے جس کیلئے سرمایہ اور دیگر ذرائع کی قلت نہیں ہے۔ پھر اس کمی کو عدم تعاون اور بے توجہی اور زیادہ مہلک بنا رہے ہیں کیا ہم توقع رکھیں کہ "فردوس" جیسے اہم جریدے سے اشتراک عمل کر کے اس مفید کام کو مفید تر بنانے کی سعی کی جائیگی

(ا۔ ع)

رجسٹرڈ آصفیہ (۲۹۰)

حدیث استیٔ ابصار اور امن کا پیامی

ماہنامہ **انوار** حیدرآباد دکن

ادارۂ تحریر

سید اصغر علی عابدی

عمر بن عبداللہ ندیم بی۔ اے

جلد (۳) شمارہ (۲)

سالانہ سے

قیمت فی پرچہ

آٹھ آنے

مندرجات

مقام اشاعت۔ دفتر "انوار" ترپ خانہ قدیم۔ نظام شاہی روڈ۔ حیدرآباد دکن

چند باتیں

(۱) انوار کا گزشتہ شمارہ مئی و جون ۱۹۴۹ء جلد ۲ کا پہلا اور دوسرا شمارہ تھا۔ گذشتہ اشاعت میں صرف پانچ شمارے آ گئے کیونکہ جلد اول میں (۷) شمارے نکلے تھے یعنی اپریل و مئی ۱۹۴۸ء کا آخری شمارہ جس پر غلطی سے صرف نمبر (۹) لکھا تھا دراصل دو ماہ کا مشترکہ ہونے کے سبب ۱۰-۹ تھا۔ براہ کرم خریدار حضرات یہ تصحیح اور تبدیلی کو نوٹ فرما لیں اب اس حساب سے جن اصحاب کا چندہ جون ۱۹۴۸ء سے شروع ہوا تھا وہ اپریل ۱۹۴۹ء میں ختم ہو گیا اور مئی و جون کا پرچہ ان کے پاس زائد پہنچ گیا جس میں ان کے اختتام چندہ کی اطلاع دی جا چکی ہے۔

(۲) گزشتہ چند اشاعتوں سے "ادبیات نمبر" کا اعلان کیا جا رہا ہے لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جس معیار پر ہم اس خاص نمبر کو نکالنا چاہتے تھے اس کے لئے ابھی تک اسباب کی کمی ہے اس لئے کب یہ نمبر منصۂ شہود پر آئے گا اس کی تاریخ سے ناظرین کو قبل از وقت اطلاع نہیں دی جا سکتی۔ براہ کرم مضمون نگار اصحاب اس شمارے کے لئے اپنے مضامین بھیجتے رہیں۔

(۳) ایسے ایجنٹ حضرات جو ایجنسی جاری رکھنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں براہ کرم فروخت شدہ پرچوں کی قیمت روانہ فرمائیں اور دفتر کو جلد از جلد اطلاع دیں تاکہ ان کی ایجنسی بند کر دی جائے اور دفتر ایک خطرناک خسارے سے بچ جائے۔

(۴) "حلقۂ ادب اسلامی" کی روداد اس دفعہ شائع نہ ہو سکی انشاء اللہ آئندہ شمارہ میں شائع ہو جائے گی۔

(۵) جن اصحاب کا چندہ اس شمارہ پر یا اس سے قبل کے شمارے پر ختم ہو گیا ہے ان کی اطلاع کے لئے اس جگہ [ ] سرخ پنسل کا نشان کر دیا جاتا ہے براہ کرم ایسے اصحاب آئندہ سال کے لئے بدل اشتراک روانہ فرما کر ممنون فرمائیں ورنہ اگلا پرچہ وی پی آئے گا جس کا چھڑانا ان کا اخلاقی فرض ہوگا۔

(۶) ہر بہی خواہ "انوار" کے لئے ضروری ہے کہ وہ انوار کو زیادہ سے زیادہ خریدار فراہم کرے۔

منیجر

"ہمارا نیا سال"

انوار کا پہلا شمارہ جون ۱۹۴۷ء میں نکلا تھا اور اس کا نیا سال گذشتہ شمارہ سے شروع ہو چکا ہے۔ کیوں اور کس طرح؟ یہ ایک طویل داستان ہے جسے سنا کر ہم اپنے قارئین کو رنجیدہ کرنا نہیں چاہتے، تاہم اتنا تو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ موجودہ دور جس سے ہم گزر رہے ہیں باطل نظامات کی سربراہ کاری اور خدا سے باغیوں کی خدائی کا دور ہے اس میں زندگی کے تمام گوشوں پر خداناشناسی اور مادہ پرستی کے لوازم اپنے تمام ہتھیاروں کے ساتھ چھائے ہوئے ہیں اس لئے کسی شعبۂ حیات میں ایک ایسے کام کا پروان چڑھنا جو نہ صرف موجودہ نظام سے کوئی مفاہمت کرنے کے لئے آمادہ نہ ہو بلکہ اس کے خلاف ہو اور اسے بدل کر دوسرا نظام قائم کرنا چاہتا ہو۔ ان متضاد حالات میں نہایت ہی مشکل اور انتہائی کٹھن ہے بلکہ بعض دوں بہت لوگوں کے نزدیک تو یہ کام ناممکن ہی ہے لیکن بہرحال ایک مومن اور خداپرست کا نقطۂ نظر باطل پرست یا خداناشناس انسان کے نقطۂ نظر سے مختلف ہوتا ہے۔ مومن یہ سمجھتا ہے کہ یہ کائنات اور اس کی ساری چیزیں خدا کی بنائی ہوئی ہیں اس خدا کی جس کی اطاعت اور عبادت کا اس نے عہد کیا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ خود بخود اس کے لئے حالات کو سازگار کرتا جائے گا اور دنیا کے یہ ظاہری روڑے اور مصنوعی ذریعے اس راہ میں ادنیٰ سی رکاوٹ بھی ثابت نہ ہوں گے چنانچہ مومن اسی عزم و ارادہ اور یقین و اذعان کی بنا پر آگے بڑھتا جاتا ہے۔ اور پہاڑی چڑھائی بھی اس کے لئے چند قدم کی مسافت سے کم معلوم ہوتی ہے "انوار" کی اشاعت و اجرائی کا معاملہ خدا کے فضل و کرم سے کچھ ایسا ہی رہا اس دوران میں کئی الٹ پھیر ہوئے۔ ہندوستان کی آزادی اور آزادی کے بعد جاہل عوام کی تباہ کاریاں حیدرآباد کا پولس ایکشن اور یہاں کے جاہل عوام کی تباہ کاریاں اور ان کے نتیجہ میں آئے دن کا معاشی عدم توازن، ہر طرف سے ہمت شکن مشورے اور دل آزار تنقیدیں ان سب چیزوں کے ہوتے ہوئے بظاہر تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ "انوار" اب بند ہوا اور تب بند ہوا لیکن ؎ جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں ۔ ادھر ڈوبے ادھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے۔ ——— انوار رُک رُک کر اور وقفے وقفے سے ہی مگر نکلتا تو رہا اور اس کے خریداروں و چندہ دہندوں کا وہ بار گراں جو کسی طرح ادا ہوتا نظر نہیں آتا تھا ادا ہوتا گیا۔ اس مدت میں دفتر سے کوتاہیاں بھی ہوئیں غلطیاں بھی ہوئیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ چند ناگزیر مجبوریوں کے باعث دفتر کے اور ادارت و ترتیب کے انتظامات مختلف ہاتھوں میں ہوتے رہے اور اب کچھ عرصہ سے یہ گاڑی ایک ہی ڈگر پر چل رہی ہے خدا سے دعا ہے کہ اس کے چلانے والے ہاتھ اور زیادہ مضبوط ہو جائیں اور اس کو مرتب کرنے والے قلم زیادہ پرکاری سے اپنا کام کرتے جائیں اور جن عظیم مقاصد کی خاطر اس کی اجرائی عمل میں آئی ہے ان کے حصول کی جدوجہد روز بروز بڑھتی جائے۔ اسی طرح ہم ان ہمدردان "انوار" کے بھی ممنون احسان ہیں جنہوں نے ہماری ان ساری کوتاہیوں کو برداشت کیا وہ نہ صرف برداشت کیا بلکہ ہمیں مفید مشوروں سے نوازا ہمیں توقع ہے کہ یہ اصحاب آئندہ بھی ہمارے ساتھ اپنی ہمدردیاں جاری رکھیں گے اور وقتاً فوقتاً اپنے مفید مشوروں سے ہمارے کام کو آگے بڑھانے میں مدد دیں گے۔ ہمدردی اور اخلاق کوئی وقتی اور عارضی چیز نہیں ہوتی بلکہ اسلام کی رو سے اس کی حیثیت بالکل مستقل ہونی چاہیئے۔ اگر یہ وقتی اور عارضی قرار دی جائے تو پھر یہ ہمدردی کے بجائے خود غرضی اور ابن الوقتی ہوگی اور خدانخواستہ ہمیں اپنے کسی بہی خواہ اور ہمدرد کے بارے میں شبہ نہیں ہے کہ وہ محض وقتی جذبات سے متاثر ہو کر ہمارے ساتھ ہوا ہے یا اگر وہ ہمارا ساتھ ترک کر رہا ہے تو یہ بھی محض ایک وقتی تاثر ہی ہے ان دونوں حالتوں میں ہم اپنے پڑھنے والوں اور ہمدردوں سے خوش گمان

بجا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے کہ ہم اس کے ہر کام کو پوری بخندگی سے جاری رکھیں ہر قسم کے حالات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے آگے بڑھیں اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون عمل کرتے ہوئے اپنے [illegible]

لمعات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برکتوں والا نظام!

آج ہندوستان کا ہر سمجھدار باشندہ چاہے وہ ہندو قوم سے تعلق رکھتا ہو یا سکھ قوم سے، وہ مسلمان کے گھر پیدا ہوا ہو یا عیسائی یہودی، اور پارسی کے اس خیال کو اپنے ذہن میں جڑ پکڑتا ہوا محسوس کر رہا ہے کہ دنیا موجودہ نظام زندگی سے تنگ آچکی ہے، برسوں سے اس نظام کی چکی میں پستے پستے اس کا کچومر نکل چکا ہے، اور اگر کچھ دنوں یہی لیل و نہار رہے تو انسانیت اور تہذیب و تمدن کا خاتمہ قریب ہے پھر اس خیال کے ساتھ ساتھ مختلف شعبہ جات حیات کے بارے میں تعمیر و ترمیم کے کچھ نقشے بھی فطری طور پر لوگوں کے ذہنوں میں بن رہے ہیں اور ایک نئے نظام کا خاکہ رفتہ رفتہ کسی بھولی ہوئی یاد کی طرح ابھر رہا ہے۔

مثلاً زندگی کے بنیادی اصول FUNDAMENTALS کے بارے میں لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ان کے موجودہ عقائد DOCTRINES مسائل حیات کی کوئی صحیح اور واضح تعبیر ان کے سامنے نہیں رکھتے اور نہ وہ ایسے ہیں کہ ان کو ہر شخص بآسانی قبول کر سکے اور وہ زندگی کے ہر معاملہ میں کارآمد ہو سکیں اس لئے کسی ایسے نظریہ اور عقیدہ کی ضرورت ہے جو نہ صرف اس کائنات اور کائنات میں مقام انسانی کی حیثیت کو پوری وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے رکھدے بلکہ وہ تاریخ کے ہر واقعہ اور مسائل حیات کے ہر گوشہ کی ایک غیر مبہم، دائمی، اور حقیقت پسندانہ تعبیر کرے اور حیات انسانی کے ساتھ اس کا ربط کسی لمحہ میں ٹوٹنے نہ پائے۔ و نیز اس کے اندر یہ خصوصیت بھی ہو کہ وہ تمام دنیا کے انسانوں کے لئے چاہے وہ کسی رنگ کسی ذات کسی قوم، اور کسی ملک سے تعلق رکھتے ہوں۔ اور کوئی زبان بولتے اور کوئی لباس پہنتے ہوں یکساں مفید قابل عمل، اور کارآمد ہو۔ مصنوعی قیود اور حد بندیوں میں کسی عقیدۂ حیات کا الجھ کر رہ جانا ایک بہت بڑی خامی بلکہ اس کی ناکامی، اور اس کے غلط ہونے کی ایک کھلی ہوئی دلیل ہے۔ انسان کے بنیادی عقیدے کو ہر قسم کی تنگ نظریوں سے بالاتر ہونا چاہیئے۔ وہ ہر انسان کے دل کی آواز ہو۔ وہ کائنات کے دل کی آواز ہو۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے حق ہونے کی شہادت دیتا ہو۔ جب وہ کوئی انسان کے سامنے پیش کیا جائے تو وہ بے اختیار پکار اٹھے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اپنے عقائد و نظریات کے خلاء کو آج ہر عقلمند آدمی کچھ اسی طرح پر کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے اندر سے اس کا قلب بے چین ہے۔ وہ شعور رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو لیکن درا‌صل

اُس کے دل کی آواز یہی ہے۔

اسی طرح اخلاقی اصولوں کے بارے میں وہ موجودہ اخلاقی اقدار (MORAL VALUES) سے مطمئن نہیں ہے بلکہ وہ ان کو بدل دینا چاہتا ہے۔ وہ اس جامہ کو اتار کر نیا جامہ پہننا چاہتا ہے وہ اب خوب سمجھ گیا ہے کہ موجودہ اخلاقیات انسان کی ہوائے نفسانی کی نگرانی اور صحیح سمت میں ان کی رہنمائی کرنے کے بجائے اُلٹا ان کے پیچھے چلتے ہیں۔ اور کسی لونڈی غلام کی طرح ہر وقت ہاتھ باندھے اُن کی چاکری کرنے کے لئے آمادہ رہتے ہیں "اخلاق" آج کل صرف پروپیگنڈہ کا حربہ ہے۔ اخلاق صرف جھوٹ پھیلانے کا آلہ ہے۔ اخلاق کا مطلب ضمیر فروشی اور ایمان کشی ہے۔ اخلاق مال و دولت کی چادروں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ غریب کے اخلاق۔ اخلاق نہیں ہیں۔ محض کمزوری کا مظاہرہ ہیں۔ آج اخلاق تو در اصل ہر بری سے بری چیز کا نام ہے۔ پھر اخلاق کی مختلف قسمیں ہیں۔ ہر قوم کے الگ الگ اخلاقیات ہیں۔ ایک کے نزدیک جو اچھا ہے دوسرے کے نزدیک وہی برا ہے۔ ایک کے نزدیک جو مضر ہے دوسرے کے نزدیک وہی مفید ہے۔ اخلاق اپنی کوئی مستقل قدر بھی نہیں رکھتے ہر وقت ہر لحظہ اور ہر لمحہ ان کے بدل جانے یا بدل دئے جانے کا موقع ہر شخص کو حاصل ہے ہر ایک کا اپنا ایک کارخانۂ اخلاق ہے۔ اور اپنا ایک جداگانہ معیار ہے جو خود اس کی اغراض اور ضروریات کے اعتبار سے بدلتا رہتا ہے۔

لہٰذا ان سب حالات پر غور کرنے سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ اس وقت کوئی خاص اخلاقی اصول رائج ہی نہیں ہے۔ اس لئے ضرورت ہے اور شدید ضرورت ہے کہ ایسے اخلاقی اصول رائج ہوں جو ایک طرف تو فطرت انسانی اور قانون قدرت سے حاصل ہونے والے بنیادی اخلاقیات پر مبنی ہوں اور دوسری طرف ان بنیادوں پر انسانی زندگی کے تمام گوشوں کے لئے پائدار اخلاقی ضوابط کی ایک شاندار عمارت تعمیر کریں ایسی عمارت جس میں ہر موسم ہر ملک ہر زمانہ اور ہر جغرافیائی حد بندی سے تعلق رکھنے والا باشندہ یکساں طور پر رہ سکتا ہو اور یکساں لطف اندوز ہو سکتا ہو۔ اخلاق کو قانون سے ماوری ایک ایسی پائدار حقیقت ہونا چاہئے جو ساری دنیا کے انسانوں کے لئے بغیر کسی فوج اور پولس کے قابل قبول اور قابل عمل ہو۔ اور اگر انسان اس قسم کے دائمی، ہمہ گیر اور عالمگیر اخلاقی اصولوں کو حاصل نہیں کر سکتا تو وہ یقیناً اس دنیا میں کبھی امن و چین کی زندگی نہیں گزار سکتا۔

معاشرتی امور کے بارے میں بھی سوچنے والوں کے خیالات کچھ اسی قسم کے ہو چلے ہیں۔ اُن کو نسلی برتری اور تفوق کے اصول پر اعتراض ہے ان کو خاندانی بڑائی اور بزرگی کے نظریہ پر اعتراض ہے وہ اس بات کو ہرگز گوارا نہیں کر سکتے کہ کوئی آدمی مال اور دولت کی وجہ سے سوسائٹی میں اونچا مرتبہ پائے۔ یا عہدے اور منصب کی بنا پر زیادہ قابل عزت بن جائے۔ گورے رنگ والا

پسند کیا جائے اور [illegible]لے کا سب ہی مذاق اڑائیں۔ اچھے کپڑے والے کی آؤ بھگت کی جائے اور معمولی کپڑوں والے کو لوگ جوتیوں کے پاس جگہ دیں۔ اسی طرح شادی بیاہ نکاح و طلاق، تجارت و کاروبار، دوستی اور دشمنی رشتہ داری اور آپس کے تعلقات کے بارے میں لوٹ کھسوٹ فضول خرچی۔ بیجا رعایت۔ غرضمندی۔ اعزہ پروری جھوٹی شان، اور کھوٹی عزت کے جو اصول اور قاعدے چل پڑے ہیں وہ بھی اب کچھ زیادہ پسندیدہ نہیں رہے ہیں۔ ان کو بھی سمجھدار انسانوں اور اصلاح پسندوں کے کھولتے ہوئے سینوں کا طوفان توڑ پھوڑ کر رکھ دینا چاہتا ہے اور نئے قوانین اور اصول ایسے جاری کرنا چاہتا ہے جن میں موجودہ رسموں اور ریتوں کی سی کوئی خرابی نہ ہو۔ اُن میں نسل، ذات، خاندان، دولت، اور عہدے کے اعتبار سے کسی کو بزرگی حاصل نہ ہو بلکہ بزرگ اور قابل عزت صرف وہ ہو جو عالم باعمل، اور مصلح نیک سیرت ہو۔ طبیعت کا اچھا اور بات کا پکا ہو۔ امین ہو۔ صادق ہو۔ غرضیکہ بحیثیت مجموعی کردار کے اعتبار سے دوسروں سے اچھا ہو۔ پھر اس کی عزت و بزرگی اس کو فوق الانسان (SCPER MAN) کے درجہ میں تو کبھی نہ پہنچا سکے گی، بلکہ انسان ہونے اور نسل آدم سے رشتہ رکھنے کی وجہ سے اس میں اور دوسرے انسانوں میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ اصل میں بڑائی تو اچھے اصولوں اور اچھے اخلاق کی ہوتی ہے اور کسی انسان میں محض اِن کے توسط سے آتی ہے۔

اسی طرح رسوم و رواج، دوستی اور اختلاف، شادی بیاہ، اور رشتہ و طلاق کے مسائل بھی ایک ایسے ضابطۂ معاشرت کے مطابق حل کئے جائیں جس کی رو سے کسی انسان کو اس کی حیثیت سے زیادہ بار برداشت کرنا نہ پڑے وہ کسی رنج اور غم کے موقع پر اتنا ہی خوش اور اتنا ہی رنجیدہ ہو۔ جتنا ہونے سے انسانی معاشرہ کے وقار پر کوئی اثر نہ پڑتا ہو۔ وہ کسی عید بقرید کے موقع پر اُسی قدر رسم و رواج کا پابند ہو اور ان کو منانے کا اتنا ہی اہتمام کرے جتنا کرنے سے اس کی ذات میں ارتقا ہوتا ہو، انسانی تمدن میں ترقی ہوتی ہو۔ انسانی تہذیب کو چار چاند لگتے ہوں۔ اور جو انسانی فطرت کے مطابق اور انسان کی سکت کے اندر ہو۔ جس سے زندگی کے دوسرے شعبوں پر کوئی ناخوشگوار اثر نہ پڑتا ہو بلکہ ان میں خوش گوار اور خوش آیند اصلاح ہوتی ہو۔ جس سے انسانیت کی تجدید ہوتی ہو، اور جو انسانی تاریخ کی سربلندی کے لئے ایک سیڑھی کا کام دیتا ہو۔ انسان کے نفسی مطالبات کو نہ تو بالکل رد کر دیا جائے اور نہ ان کو بغیر کسی حد کے آزاد چھوڑ دیا جائے بلکہ مختلف حالات میں مختلف مواقع پر مختلف قاعدوں کے مطابق متعدد گنجائش اور سہولتیں ایسی ہونی چاہئیں جو انسانی ضروریات کی تکمیل اس طرح کریں کہ اس کی کوئی طاقت افراط کی چوٹی پر چڑھ کر بے کار نہ ہو جائے۔ اور تفریط کے کھڈ میں گر کر پژمردہ اور زائل نہ ہو جائے بلکہ ہر کام میانہ روی اور اعتدال کے طریقہ پر کیا جائے۔ ہر قدم تول تول کر اُٹھایا جائے، اور ہر ضرورت ایک توازن اور عدل

کے ساتھ پوری کی جائے۔

اسی طرح ان اصولی حد بندیوں کے علاوہ ذیلی اور فروعی معاملات میں انسان کو فکر و اجتہاد کی آزادی حاصل ہو معاشرے کے ہر ہر فرد کو اپنے ذوق اپنی ذاتی اپج اور اپنی فطری اٹھان کے مطابق انسانی تمدن کے خاکے میں طرح طرح کے رنگ بھرنے کی سہولت حاصل ہو۔ طرح طرح کی ایجادات، اختراعات اور ذاتی کاوشوں سے معاشرتی ضروریات کی تکمیل میں تنوع رنگا رنگی، اور گوناگونی پیدا کرنے کے مواقع موجود ہوں۔ کیونکہ اس طرح کا اختلاف، ایک رحمت اور ایک برکت ہے۔ جس سے انسانی قوتوں کو صحیح نشو نما اور سچے ارتقا کا موقع ملتا ہے۔

معاشیات کے موجودہ اصولوں سے بھی انسانیت کا ضمیر مطمئن نہیں ہے۔ کوئی سلجھے ہوئے ذہن کا آدمی اس قاعدے کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہے کہ انسان اچھے بُرے کی تمیز کئے بغیر جس طریقہ سے چاہے دولت پیدا کرے، اور پھر جس طرح چاہے اس کو لٹائے اور صرف کرے، تقسیم دولت کا بھی کوئی ایسا اصول قابل قبول نہیں ہو سکتا جس کی رو سے دولت ہمیشہ ایک محدود طبقے کے درمیان گردش کرتی رہے، اور سوسائٹی کے بڑے حصے کے اوپر دولت کمانے، اور دولت حاصل کرنے کے تمام دروازے بند ہوں۔ بڑے بڑے ڈالمیا اور برلا اجارہ دار اور خزانہ کے سانپ بن کر دولت کے راستوں اور دولت کے انباروں پر قابض ہوں۔ مختلف ذرائع پیداوار پر ان کا مستقل قبضہ ہو۔ وہ دولت کے ٹھیکہ دار اور اجارہ دار ہوں ——— لیکن عوام الناس کا ایک گروہ کثیر دانے دانے کو ترستا پھرے

کپڑے کی ایک ایک دھجی کے لئے ترستا پھرے یہ اصول زیادہ دنوں برداشت نہیں کئے جا سکتے۔ پھر اسی طرح باپ کی جائداد کو تمام اولاد میں تقسیم کرنے کے بجائے صرف بڑے بیٹے کی جیبوں میں بھرنے کا اصول بھی نہایت ہی لغو اور مہمل ہے۔ لہذا ان تمام اصولوں اور قاعدوں کو دریا برد کر کے ایسے اصول اور قاعدے جاری کرنے کی ضرورت ہے جن میں انسانی تمدن کو نقصان پہنچانے والے تمام ذرائع پیداوار پر پابندی ہو۔ جن میں ہر آجر ہر مزدور کو اس کی محنت کا پورا پورا اجر دے، تقسیم دولت کے ایسے طریقے نافذ کئے جائیں جن کی رو سے دولت سوسائٹی کے ایک ایک کونے میں پہنچے۔ انسانیت کی کھیتی کی ہر کیاری اس سے سیراب ہو اگر کچھ طبقے اپنی "نااہلی" عدم مستعدی" یا مواقع کی غیر موجودگی کے باعث حصول دولت میں پیچھے رہ جائیں تو وہ لوگ جو ان سے آگے بڑھ گئے ہوں کوئی طریقہ ایسا اختیار کریں جس پر عمل کرنے سے پیچھے رہ جانے والے بھی آگے آ جائیں۔ نیچے گرنے والے بھی اونچے ہو جائیں۔ کیونکہ پوری انسانیت کا مفاد اسی میں ہے کہ سب ساتھ چلیں اور اگر کوئی نہ چل سکتا ہو تو اس کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر ساتھ لیجائیں ورنہ ایک کے گرنے سے سب گریں گے ایک کے پامال ہونے سے سب پامال ہوں گے چہ جائیکہ ایک بڑا طبقہ پامال ہو اور صرف چند لوگ سربلند ہوں ——— یہ تو انسانیت کی مکمل تباہی ہوئی!

پھر اسی طرح سب کیلئے مواقع یکسانی (EQUAL OPPORTUNITIES) ——— بھی ضروری ہے کسی کو اجارہ داری (MONOPLY) کا حق حاصل نہ ہو کیونکہ اس دنیا میں کوئی بھی خدا کا بیٹا نہیں ہے کوئی بھی خدا کے سر سے پیدا نہیں ہوا ہے سب انسان ہیں

ایک ہی نسل آدم سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے سب کو سوسائٹی میں یکساں مواقع حاصل ہونا ضروری ہے۔ مواقع کے فرق و امتیاز سے انسانی تمدن کی کشتی نیچے اوپر ہو جائیگی۔ اس سے معیشت کے دریا میں خواہ مخواہ تلاطم پیدا ہوگا اور بہت ممکن ہے یہ تلاطم بڑھتے بڑھتے طوفان کی شکل اختیار کرلے اور کشتی بالآخر غرق ہوجائے۔

پھر مبادلہ (EXCHANGE) صرف (CONSUMPTION) اور پیدائش (PRODUCTION) کے موجودہ بین الاقوامی اور ملکی طریقوں میں بھی یہ اصلاح ہونی چاہیئے کہ ان میں طرح طرح کی چالیں چلنے اور اس نظام کو زیادہ سے زیادہ پیچیدہ بنانے کے بجائے اس کو صاف اور سیدھے اصولوں پر قائم کیا جائے اس سے سود کی لعنت کو بالکلیہ ختم کیا جائے جو اشیاء کی خرید کے بجائے زر کی فروخت ہے اور اس سے زر اور شئے کا رشتہ ٹوٹتا ہے حالانکہ ابتداء میں زر بطور آلۂ مبادلہ MEDIUM OF EXCHANGE کے صرف انہی اغراض کی خاطر وجود میں آیا تھا کہ اشیاء سے اشیاء کے تبادلہ کی دقتوں کو حل کیا جائے۔ لیکن اب انسان زر کے اس اصل مصرف کو نظر انداز کرکے بجائے خود زر کو ایک "دولت" سمجھنے لگا ہے جو ایک صریح غلطی اور کھلی ہوئی معاشیاتی گمراہی ہے اس لئے اس "زربازی" کو جتنی جلدی ہوسکے ختم کیا جائے اور تقسیم دولت اور مبادلۂ دولت کے طریقوں کو با عصمت اور با عفت بنایا جائے۔ پھر معاشیات میں یہ طریقہ بھی کچھ صحیح نہیں ہے کہ ساری سوسائٹی کی دولت حکومت کے ہاتھ میں یعنی ان چند افراد کے ہاتھ میں دیدی جائے جو بدقسمتی یا خوش قسمتی سے دوسرے تمام انسانوں پر حکمران بن جاتے ہیں کوئی انسان بھی

جو اپنے سینے میں دل رکھتا ہے اور دل میں فطری خواہشات اور فطری مطالبات کا ایک سرچشمہ بھی اس طرز عمل کو ہرگز گوارا نہیں کرسکتا اس دولت کو قومیانے کے اصول، میں ہزاروں لاکھوں قسم کے مفاسد ہیں۔ چھوٹے پیمانے پر ایک سرمایہ دار دولت کا مالک بن کر جس بدمستی اور خرمستی کا مظاہرہ کرتا ہے بڑے پیمانے پر حکمران افراد بھی اسی خرمستی اور بدمستی کا مظاہرہ یقیناً کریں گے اور نہ تو ان کے ایسا نہ کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے اور نہ ان کو ایسا کرتے وقت باز رکھنے یا روک دینے کی کوئی قوت عوام کے ہاتھ میں ہوتی ہے جس سے کام لے کر حکومت کی سرمایہ داری کو روکا جاسکے اور اس کے طوفان استبداد کے آگے کوئی بند باندھا جاسکے۔ پھر اس طرح کا طریقہ کار دولت کو معدوم بھی کردیتا ہے۔ کیونکہ ایک ہی طرح کے ہاتھوں میں اور ایک ہی سوچے سمجھے ہوئے "پنج سالہ" پروگرام کے مطابق مصنوعی طریقہ پر دولت بڑھانے کی خواہش سے بہت جلد قانون تقلیل افادہ کا عمل شروع ہوجاتا ہے اور دولت معدوم ہونے لگتی ہے۔ پورے ملک کی دولت کے قومی بن جانے سے عام لوگوں کی قوت کارکردگی پر بھی مردنی چھاجاتی ہے، عام لوگوں کی جد و جہد کا مقصود صرف ایک "مفقادہ" جاتا ہے جس کا وہ خالی فضاء میں شکار کرتے ہیں۔ ہر شخص کے انفرادی سرمایہ رکھنے اور جداگانہ طریق پر کام کرنے سے تمدن میں جو گوناگونی اور تنوع پیدا ہوتا ہے وہ ارتقائے تاریخ کی جان ہے دولت کو قومیانے کے معنے اس ارتقا کا گلا گھونٹ دینا ہے ایجاد و اختراع کی کاوشوں کو روک دینا ہے۔ تمدنی ترقی کو صرف پسند لوگوں کی

کے ساتھ پوری کی جائے ۔

اسی طرح ان اصولی حد بندیوں کے علاوہ ذیلی اور فروعی معاملات میں انسان کو فکر و اجتہاد کی آزادی حاصل ہو معاشرے کے ہر ہر فرد کو اپنے ذوق اپنی ذاتی اپج اور اپنی فطری اٹھان کے مطابق انسانی تمدن کے خاکے میں طرح طرح کے رنگ بھرنے کی سہولت حاصل ہو۔ طرح طرح کی ایجادات، اختراعات اور ذاتی کاوشوں سے معاشرتی ضروریات کی تکمیل میں تنوع رنگا رنگی، اور گوناگونی پیدا کرنے کے مواقع موجود ہوں۔ کیونکہ اس طرح کا اختلاف، ایک رحمت اور ایک برکت ہے۔ جس سے انسانی قوتوں کو صحیح نشو نما اور سچے ارتقا کا موقع ملتا ہے۔

معاشیات کے موجودہ اصولوں سے بھی انسانیت کا ضمیر مطمئن نہیں ہے۔ کوئی سلجھے ہوئے ذہن کا آدمی اس قاعدے کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہے کہ انسان اچھے برے کی تمیز کئے بغیر جس طریقہ سے چاہے دولت پیدا کرے، اور پھر جس طرح چاہے اس کو لٹائے اور صرف کرے، تقسیم دولت کا بھی کوئی ایسا اصول قابل قبول نہیں ہو سکتا جس کی رو سے دولت ہمیشہ ایک محدود طبقے کے درمیان گردش کرتی رہے، اور سوسائٹی کے بڑے حصے کے اوپر دولت کمانے، اور دولت حاصل کرنے کے تمام دروازے بند ہوں۔ بڑے بڑے ڈالیا اور بڑا اجارہ دار اور خزانہ کے سانپ بن کر دولت کے راستوں اور دولت کے انباروں پر قابض ہوں۔ مختلف ذرائع پیداوار پر ان کا مستقل قبضہ ہو۔ وہ دولت کے ٹھیکہ دار اور اجارہ دار ہوں ———

لیکن عوام الناس کا ایک گروہ کثیر دانے دانے کو ترسا پھرے

کپڑے کی ایک ایک دمڑی کے لئے تجویز کیا یہ اصول زیادہ دن تک برداشت نہیں کئے جا سکتے۔ پھر اسی طرح باپ کی جائداد کو تمام اولاد میں تقسیم کرنے کے بجائے صرف بڑے بیٹے کی جیبوں میں بھر دینے کا طریقہ بھی نہایت ہی لغو اور مہمل ہے۔ لہذا ان تمام اصولوں اور قاعدوں کو دریا برد کر کے ایسے اصول اور قاعدے جاری کرنے کی ضرورت ہے جن میں انسانی تمدن کو نقصان پہنچانے والے تمام ذرائع پیداوار پر پابندی ہو۔ جن میں ہر آجر ہر مزدور کو اس کی محنت کا پورا پورا اجر دے، تقسیم دولت کے ایسے طریقے اختیار کئے جائیں جن کی رو سے دولت سوسائٹی کے ایک ایک گوشے میں پہنچے۔ انسانیت کی کھیتی کی ہر کیاری اس سے سیراب ہو اور اگر کچھ طبقے اپنی "نااہلی" عدم مستعدی" یا مواقع کی غیر موجودگی کے باعث حصول دولت میں پیچھے رہ جائیں تو وہ لوگ جو ان سے آگے بڑھ گئے ہوں کوئی طریقہ ایسا اختیار کریں جس پر عمل کرنے سے یہ پیچھے رہ جانے والے بھی آگے آ جائیں۔ نیچے گرنے والے بھی اونچے ہو جائیں۔ کیونکہ پوری انسانیت کا وقار اسی میں ہے کہ سب ساتھ چلیں اور اگر کوئی نہ چل سکتا ہو تو دوسرے اس کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر ساتھ لیجائیں ورنہ ایک کے گرنے سے سب گریں گے ایک کے پامال ہونے سے سب پامال ہوں گے کجا کہ ایک بڑا طبقہ پامال ہو اور صرف چند لوگ سربلند ہوں ——— یہ تو انسانیت کی مکمل تباہی ہوگی۔!

پھر اسی طرح سب کیلئے مواقع یکسانی — (EQUAL OPPERTUNITIES) بھی ضروری ہے کسی کو اجارہ داری (MONOPLY) کا اختیار حاصل نہ ہو کیونکہ اس دنیا میں کوئی بھی خدا کا بیٹا نہیں ہے کوئی بھی خدا کے سر سے پیدا نہیں ہوا ہے سب انسان ہیں سب

ایک ہی نسل آدم سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے سب کو سوسائٹی میں یکساں مواقع حاصل ہونا ضروری ہے۔ مواقع کے فرق و امتیاز سے انسانی تمدن کی کشتی نیچے اوپر ہو جائیگی۔ اس سے معیشت کے دریا میں خواہ مخواہ تلاطم پیدا ہوگا اور بہت ممکن ہے یہ تلاطم بڑھتے بڑھتے طوفان کی شکل اختیار کرلے اور کشتی بالآخر غرق ہو جائے۔

پھر مبادلہ (EXCHANGE) صرف (CONSUMPTION) اور پیدائش (PRODUCTION) کے موجودہ بین الاقوامی اور ملکی طریقوں میں بھی یہ اصلاح ہونی چاہیئے کہ ان میں طرح طرح کی چالیں چلنے اور اس نظام کو زیادہ سے زیادہ پیچیدہ بنانے کے بجائے اس کو صاف اور سیدھے اصولوں پر قائم کیا جائے اس سے سود کی لعنت کو بالکلیہ ختم کیا جائے جو اشیا کی فروخت کے بجائے زر کی فروخت ہے اور اس سے زر اور شئے کا رشتہ ٹوٹتا ہے۔ حالانکہ ابتدا میں زر بطور آلۂ مبادلہ MEDIUM OF EXCHANGE کے صرف انہی اغراض کی خاطر وجود میں آیا تھا کہ اشیا سے اشیا کے تبادلہ کی دقتوں کو حل کیا جائے۔ لیکن اب انسان زر کے اس اصل مصرف کو نظر انداز کرکے بجائے خود زر کو ایک "دولت" سمجھنے لگا ہے جو ایک صریح غلطی اور کھلی ہوئی معاشیاتی گمراہی ہے اس لئے اس "زربازی" کو جتنی جلدی ہوسکے ختم کیا جائے اور تقسیم دولت اور مبادلۂ دولت کے طریقوں کو باعصمت اور باعفت بنایا جائے۔ پھر معاشیات میں یہ طریقہ بھی کچھ صحیح نہیں ہے کہ ساری سوسائٹی کی دولت حکومت کے ہاتھ میں یعنی ان چند افراد کے ہاتھ میں دیدی جائے جو بدقسمتی یا خوش قسمتی سے دوسرے تمام انسانوں پر حکمران بن جاتے ہیں کوئی انسان بھی

جو اپنے سینے میں دل رکھتا ہے اور دل میں فطری خواہشات اور فطری مطالبات کا ایک سرچشمہ بھی، اس طرز عمل کو ہرگز گوارا نہیں کرسکتا، اس دولت کو قومیانے کے اصول میں ہزاروں لاکھوں قسم کے مفاسد ہیں۔ چھوٹے پیمانے پر ایک سرمایہ دار دولت کا مالک بن کر جس بدمستی اور خرمستی کا مظاہرہ کرتا ہے بڑے پیمانے پر حکمران افراد بھی اسی خرمستی اور بدمستی کا مظاہرہ یقیناً کریں گے، اور نہ تو ان کے ایسا نہ کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے اور نہ ان کو ایسا کرتے وقت باز رکھنے یا روک دینے کی کوئی قوت عوام کے ہاتھ میں ہوتی ہے جس سے کام لے کر حکومت کی سرمایہ داری کو روکا جاسکے اور اس کے طوفان استبداد کے آگے کوئی بند باندھا جاسکے۔ پھر اس طرح کا طریقہ کار دولت کو معدوم بھی کر دیتا ہے۔ کیونکہ ایک ہی طرح کے ہاتھوں میں اور ایک ہی سوچے سمجھے ہوئے "پنج سالہ" پروگرام کے مطابق مصنوعی طریقہ پر دولت بڑھانے کی خواہش سے بہت جلد قانون تقلیل افادہ

کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور دولت معدوم ہونے لگتی ہے۔ پورے ملک کی دولت کے قومی بن جانے سے عام لوگوں کی قوت کارکردگی پر بھی مردنی چھا جاتی ہے، عام لوگوں کی جدوجہد کا مقصود صرف ایک "منقارہ" جاتا ہے جس کا وہ خالی فضا میں شکار کرتے ہیں۔ ہر شخص کے انفرادی سرمایہ رکھنے اور جداگانہ طریق پر کام کرنے سے تمدن میں جو گوناگونی اور تنوع پیدا ہوتا ہے وہ ارتقائے تاریخ کی جان ہے دولت کو قومیانے کے معنے اس ارتقا کا گلا گھونٹ دینا ہے ایجاد و اختراع کی کاوشوں کو روک دینا ہے۔ تمدنی ترقی کو صرف پسند لوگوں کی

کے ساتھ پوری کی جائے ۔

اسی طرح ان اصولی حدبندیوں کے علاوہ ذیلی اور فروعی معاملات میں انسان کو فکر و اجتہاد کی آزادی حاصل ہو معاشرے کے ہر ہر فرد کو اپنے ذوق اپنی ذاتی اپج اور اپنی فطری اٹھان کے مطابق انسانی تمدن کے خاکے میں طرح طرح کے رنگ بھرنے کی سہولت حاصل ہو۔ طرح طرح کی ایجادات، اختراعات اور ذاتی کاوشوں سے معاشرتی ضروریات کی تکمیل میں تنوع رنگا رنگی، اور گوناگونی پیدا کرنے کے مواقع موجود ہوں۔ کیونکہ اس طرح کا اختلاف، ایک رحمت اور ایک برکت ہے۔ جس سے انسانی قوتوں کو صحیح نشونما اور سچے ارتقا کا موقع ملتا ہے۔

معاشیات کے موجودہ اصولوں سے بھی انسانیت کا ضمیر مطمئن نہیں ہے۔ کوئی سلجھے ہوئے ذہن کا آدمی اس قاعدے کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہے کہ انسان اچھے بُرے کی تمیز کئے بغیر جس طریقہ سے چاہے دولت پیدا کرے، اور پھر جس طرح چاہے اس کو لٹائے اور صرف کرے، تقسیم دولت کا بھی کوئی ایسا اصول قابل قبول نہیں ہو سکتا جس کی رو سے دولت ہمیشہ ایک محدود طبقے کے درمیان گردش کرتی رہے، اور سوسائٹی کے بڑے حصے کے اوپر دولت کمانے، اور دولت حاصل کرنے کے تمام دروازے بند ہوں۔ بڑے بڑے ڈاملیا اور برلا اجارہ دار اور خزانے کے سانپ بن کر دولت کے راستوں اور دولت کے انباروں پر قابض ہوں۔ مختلف ذرائع پیداوار پر ان کا مستقل قبضہ ہو۔ وہ دولت کے ٹھیکہ دار اور اجارہ دار ہوں ــــــــ

لیکن عوام الناس کا ایک گروہ کھیڑ دانے کو ترسا پھرے کپڑے کی ایک ایک دھجی کے لئے محتاج ہو۔ یہ اصول زیادہ دن تک برداشت نہیں کئے جا سکتے۔ پھر اسی طرح باپ کی جائداد کو تمام اولاد میں تقسیم کرنے کے بجائے صرف بڑے بیٹے کی جیبوں میں بھر دینے کا طریقہ بھی نہایت ہی لغو اور مہمل ہے۔ لہذا ان تمام اصولوں اور قاعدوں کو دریا برد کر کے ایسے اصول اور قاعدے جاری کرنے کی ضرورت ہے جن میں انسانی تمدن کو نقصان پہنچانے والے تمام ذرائع پیداوار پر پابندی ہو۔ جن میں ہر آجر ہر مزدور کو اس کی محنت کا پورا پورا اجر دے، تقسیم دولت کے ایسے طریقے نافذ کئے جائیں جن کی رو سے دولت سوسائٹی کے ایک ایک کونے میں پہنچے۔ انسانیت کی کھیتی کی ہر کیاری اس سے سیراب ہو۔ اگر کچھ طبقے اپنی نااہلی، عدم مستعدی، یا مواقع کی غیر موجودگی کے باعث حصول دولت میں پیچھے رہ جائیں تو وہ لوگ جو ان سے آگے بڑھ گئے ہیں کوئی طریقہ ایسا اختیار کریں جس پر عمل کرنے سے یہ پیچھے رہ جانے والے بھی آگے آ جائیں۔ نیچے گرنے والے بھی اونچے ہو جائیں۔ کیونکہ پوری انسانیت کا فائدہ اسی میں ہے کہ سب ساتھ چلیں اور اگر کوئی نہ چل سکتا ہو تو دوسرے اس کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر ساتھ لیجائیں ورنہ ایک کے گرنے سے سب گریں گے ایک کے پامال ہونے سے سب پامال ہوں گے گویا کہ ایک بڑا طبقہ پامال ہو اور صرف چند لوگ سربلند ہوں ــــــــ یہ تو انسانیت کی مکمل تباہی ہوئی۔!

پھر اسی طرح سب کیلئے مواقع یکساں ــــ EQUAL OPPERTUNITIES بھی ضروری ہے کسی کو اجارہ داری (MONOPLY) کا اختیار حاصل نہ ہو کیونکہ اس دنیا میں کوئی بھی خدا کا بیٹا نہیں ہے کوئی بھی خدا کے سر سے پیدا نہیں ہوا ہے سب انسان ہیں۔

ایک ہی نسل آدم سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے سب کو سوسائٹی میں یکساں مواقع حاصل ہونا ضروری ہے۔ مواقع کے فرق و امتیاز سے انسانی تمدن کی کشتی نیچے اوپر ہو جائیگی۔ اس سے معیشت کے دریا میں خواہ مخواہ تلاطم پیدا ہوگا اور بہت ممکن ہے یہ تلاطم بڑھتے بڑھتے طوفان کی شکل اختیار کرلے اور کشتی بالآخر غرق ہو جائے۔

پھر مبادلہ (EXCHANGE) صرف (CONSUMPTION) اور پیدائش (PRODUCTION) کے موجودہ بین الاقوامی اور ملکی طریقوں میں بھی یہ اصلاح ہونی چاہیئے کہ ان میں طرح طرح کی چالیں چلنے اور اس نظام کو زیادہ سے زیادہ پیچیدہ بنانے کے بجائے اس کو صاف اور سیدھے اصولوں پر قائم کیا جائے اس سے سود کی لعنت کو بالکلیہ ختم کیا جائے جو اشیاء کی خرید کے بجائے زر کی فروخت ہے اور اس سے زر اور قیمت کا رشتہ ٹوٹتا ہے حالانکہ ابتداء میں زر بطور آلہ مبادلہ MEDIUM OF EXCHANGE کے صرف انہی اغراض کی خاطر وجود میں آیا تھا کہ اشیاء سے اشیاء کے تبادلہ کی دقتوں کو حل کیا جائے۔ لیکن اب انسان زر کے اس اصل مصرف کو نظر انداز کرکے بجائے خود زر کو ایک "دولت" سمجھنے لگا ہے جو ایک صریح غلطی اور کھلی ہوئی معاشیاتی گمراہی ہے اس لئے اس "زربازی" کو جتنی جلدی ہوسکے ختم کیا جائے اور تقسیم دولت اور مبادلۂ دولت کے طریقوں کو باعصمت اور باعفت بنایا جائے۔ پھر معاشیات میں یہ طریقہ بھی کچھ صحیح نہیں ہے کہ ساری سوسائٹی کی دولت حکومت کے ہاتھ میں یعنی ان چند افراد کے ہاتھ میں دیدی جائے جو بدقسمتی یا خوش قسمتی سے دوسرے تمام انسانوں پر حکمراں بن جاتے ہیں کیونکہ انسان بھی جو اپنے سینے میں دل رکھتا ہے اور دل میں فطری خواہشات اور فطری مطالبات کا ایک سرچشمہ بھی، اس طرز عمل کو ہرگز گوارا نہیں کرسکتا۔ اس دولت کو قومیانے کے اصول، میں ہزاروں لاکھوں قسم کے مفاسد ہیں۔ چھوٹے پیمانے پر ایک سرمایہ دار دولت کا مالک بن کر جس بدمستی اور خرمستی کا مظاہرہ کرتا ہے بڑے پیمانے پر حکمراں افراد بھی اسی خرمستی اور بدمستی کا مظاہرہ یقیناً کریں گے اور نہ تو ان کے ایسا نہ کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے اور نہ ان کو ایسا کرتے وقت باز رکھنے یا روک دینے کی کوئی قوت عوام کے ہاتھ میں ہوتی ہے جس سے کام لے کر حکومت کی سرمایہ داری کو روکا جاسکے اور اس کے طوفان استبداد کے آگے کوئی بند باندھا جاسکے۔ پھر اس طرح کا طریقہ کار دولت کو معدوم بھی کردیتا ہے۔ کیونکہ ایک ہی طرح کے ہاتھوں میں اور ایک ہی سوچے سمجھے ہوئے "پنج سالہ" پروگرام کے مطابق مصنوعی طریقہ پر دولت بڑھانے کی خواہش سے بہت جلد قانون تقلیل افادہ کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور دولت معدوم ہونے لگتی ہے۔

پورے ملک کی دولت کے قومی بن جانے سے عام لوگوں کی قوت کارکردگی پر بھی مردنی چھا جاتی ہے، عام لوگوں کی جدوجہد کا مقصود صرف ایک "خنقارہ" جاتا ہے جس کا وہ خالی فضا میں خنکار کرتے ہیں۔ ہر شخص کے انفرادی سرمایہ رکھنے اور جداگانہ طریق پر کام کرنے سے تمدن میں جو گوناگونی اور تنوع پیدا ہوتا ہے وہ ارتقائے تاریخ کی جان ہے دولت کو قومیانے کے معنے اس ارتقا کا گلا گھونٹ دینا ہے ایجاد و اختراع کی کاوشوں کو روک دینا ہے۔ تمدنی ترقی کو صرف پسند لوگوں کی

…ہنی [illegible] محدود کرکے اس گنوار مسافر کے مماثل قرار دینا
ہے جو ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کو اکثر پیدل جاتا ہے
…ور موٹر اور ریل کے سفر سے محض اپنے گنوار پن کی وجہ سے
…ترا تا ہے ۔

اس کے بجائے ہونا تو صرف یہ چاہیئے کہ حکومت انسانوں
…کمانے کے لئے آزاد چھوڑ دے البتہ اُن کے حقوق کی نگرانی
…رنے اور کسی کو کسی پر زبردستی کرنے اور ظلم و زیادتی سے چڑھ
…دوڑنے کا کوئی موقع نہ دے ۔ بلکہ ایسے مجرموں کو سخت سزائیں
…ی جائیں ۔ اور پھر یہ انتظام ہو کہ ——— حکومت کا
…ئی خزانہ ایسا ہو جس میں سب دولت مندوں کی ضرورت
…ے زیادہ دولت جمع ہو جائے تاکہ غیر محدود سرمایہ داری ختم ہو
…ر ایک محدود سرمایہ داری کا اصول رائج ہو اور پھر اس جمع شدہ
…رقم کے ذریعہ ہر ضرورت مند شخص کی مدد کی جائے ، ہر نادار کی
…روٹی اور کپڑے کا انتظام کیا جائے ۔ بلکہ اس طرح کے قانونی
…دباؤ کے علاوہ بھی معاشرت میں کچھ ایسے اخلاقی اصول رائج
…ہوں کہ انسان ایک دوسرے کی ضرورتوں کو سمجھیں اور ان کو پورا کرنے
…مائل جائیں ، خیرات اور حسنات کا اس قدر زور ہو اور ان
…کے ذریعہ ہمدردی اور محبت سے ایک دوسرے تک زر کو اس
…طرح گردش میں لایا جائے کہ سوسائٹی کی مجموعی دولت گھٹنے
…کے بجائے بڑھتی جائے ۔ ایک جگہ جمع ہو کر سڑنے اور گلنے
…کے بجائے مختلف نہروں ، چشموں اور نالیوں کے ذریعہ بہہ نکلے اور
…چپہ چپہ کو سیراب کردے ۔ اس طریقہ سے نہ تو وہ مفاسد پیدا ہونگے
…جو سرمایہ داری سے پیدا ہوتے ہیں اور نہ اس میں وہ خامیاں
…ہیں جو دولت کو قومیانے سے وجود میں آتی ہیں ۔

سیاست کے دائرہ اثر میں چاہے وہ علمی ہو یا عملی آج
کوئی انسان دوسرے انسان کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرنے کے
لئے تیار نہیں ہے ۔ ہر وہ شخص جس کا دماغ حریت فکر و ضمیر کی دولت
سے مالامال ہے انسانوں کو خود اپنے ہی جیسے انسانوں کے
پنجۂ استبداد میں دیکھکر کڑھتا اور جلتا ہے ۔ نہ تو وہ کسی بادشاہ
کے شخصی اقتدار کو اچھا سمجھتا ہے اور نہ وہ کسی ایک گروہ ایک
پارٹی اور ایک قوم کے اقتدار کو دوسروں کے لئے روا رکھتا ہے
چنانچہ اسی جھنجھلاہٹ اور کڑھن ہی کا نتیجہ ہے جو وہ دنیا
میں سچی جمہوریت کے لئے سرگرداں و حیران ہے ۔ مگر افسوس
سچی جمہوریت بھی سیاسی جماعتوں کی غرضمندیوں ، لیڈروں
کی خود پرستیوں اور انتخابات میں سرمایہ داروں یا با اقتدار شخصیتوں
کے پروپیگنڈے کی نذر ہو چکی ہے اور آج کہیں بھی حقیقی جمہوریت
کا چہرۂ انور دکھائی نہیں دیتا ۔ اس لئے وہ پریشان اور حیران ہے
کہ کس طرح اس "اقتدار اعلیٰ" کے مسئلہ کو حل کرے ۔ چنانچہ بڑی کد و
کاوش کے بعد جو بات اُس کے ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہوتی
ہے کہ اقتدار کی باگ ڈور تو صرف قانون ہی کے ہاتھ میں
ہو سکتی ہے یا اگر ہو سکتی ہے تو کسی ایسی ہستی کے ہاتھ میں جو انسانوں
سے بالاتر ہو ۔

اسی طرح جماعتی ، اور قومی تنظیم کے بارے میں ایک ضمیر کی
آواز کو سمجھنے والا انسان اس بات کا خواہشمند ہے کہ اس
میں کسی قسم کی عصبیت کا کوئی شائبہ تک نہ ہو ۔ نہ اس میں گروہی
عصبیت ہو ، نہ وطنی تعصب و عناد ہو اور نہ رنگ و نسل ، اور
ذات پات کی بناء پر کوئی تفرقہ ہو بلکہ سب انسان انسان

ہونے کے اعتبار سے برابر ہیں چاہے کوئی افریقہ کا زولو ہو
یا خاندانِ ہنود کا رکن رکین۔ برہمن ہو یا ویش۔ شیخ ہو یا سید
امریکی ہو۔ یا چینی اور ہندی۔ سب انسان یقیناً مساوی ہیں
اور سب کے ایک دوسرے پر یکساں حقوق ہیں۔ کسی کے لئے
اسباب بڑائی اور فخر موجود نہیں ہیں۔ اس لئے اگر کوئی تنظیم ہو
تو اس طرح کہ اس میں انسانیت عامہ کے مفاد کو کوئی دھکا نہ
پہنچے۔ انساں کا انسان سے رشتہ نہ ٹوٹے بلکہ ہر تنظیم انسانوں
کو ایک دوسرے سے جوڑنے اور ملانے والی ہو۔ ایک دوسرے
سے قریب کرنے اور انسانیت کا درس دینے والی ہو

پھر قانون حکومت کے بارے میں بھی یہ رائے بڑی تیزی
سے ابھر رہی ہے کہ قانون ہمہ گیر ہو اس کے اندر زیادہ سے
زیادہ لوچ ہو اور وسعت وپہنائی ہو۔ وہ ہر زمانے اور ہر مقام
کے لئے یکساں مفید اور کارآمد ہو۔ یا کم سے کم اس کے بنیادی
اصول تو دائمی ہوں اور زمان ومکان کی قید سے آزاد ہوں
ذیلی اور فروعی مسائل میں بدلتے ہوئے حالات کے اعتبار
سے اجتہاد کیا جائے، اس میں کوئی ہرج نہیں اور ایسا
اجتہاد فکر ونقل تو تمدنی ترقی کے لئے ناگزیر ہے۔ پھر قانون
کا کسی خاص قوم، خاص گروہ خاص جماعت اور خاص فرد
یا مجموعہ افراد سے کوئی رشتہ ناطہ بھی نہ ہو قانون بے لاگ ہو۔
وہ کسی کے ساتھ رعایت نہ کرے۔ اور کسی پر خواہ مخواہ سختی
بھی نہ کرے۔ بلکہ وہ عین فطرت انسانی کے مطابق ہو۔

اسی طرح قانون کو روبہ عمل لانے والے گروہ کو بھی خود
قانون پر پوری طرح عمل پیرا ہونا چاہیئے اُسے اُس کا "متقی"
اور مومن ہونا چاہیئے۔ قانون چلانے اور نافذ کرنے کے
لئے ہمیشہ ایسا طبقہ اوپر آئے جو دوسرے انسانوں کے
مقابلہ میں خود سب سے زیادہ قانون داں اور قانون آشنا
ہو۔ محض پروپیگنڈے کے زور سے ابھر کر آنے والے لوگ
اور خود اپنے آپ کو عہدیداری کے لئے پیش کرنے والے افراد
کسی طرح قابل اعتماد نہیں ہو سکتے۔ بلکہ ایسے افراد تو عموماً
خود غرض، جاہ پسند، اور اپنے ہی جیسے انسانوں پر حکومت
کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں اس لئے ایسی ادنیٰ خواہشات
رکھنے والوں کو تو اوپر لیجانے کے بجائے گھسیٹ کر نیچے
پھینک دینا چاہیئے کیونکہ یہ لوگ اوپر پہنچ کر قانون کو چلانے
اور نافذ کرنے کے بجائے اپنے ہر ہر لفظ کو قانون کا جامہ
پہنا دیتے ہیں اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں اگر عوام
کو قانون ہاتھ میں لینے کا حق نہیں ہے تو پھر ان کرسی نشینوں
کو کیا حق ہے کہ وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیں؟

الغرض یہ ہیں وہ خیالات وتاثرات جو عام طور پر موجودہ
نظام زندگی کی بدعنوانیوں کو دیکھکر ہر سوچنے والے اور ٹھنڈے
دل سے غور کرنے والے کے ذہن میں پیدا ہو رہے ہیں۔ بہت
ممکن ہے اکثر اصحاب فکر ہمارے اس جائزے کے بعض پہلوؤں
سے اختلاف ہو اور ابھی یہ باتیں ان کے تحت الشعور
SUB-CONSCIOUS MIND میں محفوظ ہوں اور شعور کے دائرے
میں انہوں نے قدم نہ رکھا ہو۔ لیکن اگر وہ بالکل غیر جانبدار ہو کر
آزاد خیالی کے ساتھ موجودہ نظام حیات اور اس کے مختلف
گوشوں اور شعبوں پر نظر ڈالیں تو ہمیں یقین ہے کہ وہ بڑی حد
تک ہماری رائے سے اتفاق کرینگے۔ بہرحال اب جو

چیز غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ آیا ضمیر کی اس آواز پر دنیا میں کوئی نظام زندگی ایسا بن سکتا ہے یا ایسا موجود ہے جو نہ صرف ان اعتراضات اور تنقیدوں کو صحیح قرار دیتا ہو بلکہ انسانی ذہن نے ایک نئے برکتی فلاحی نظام کیلئے جو خاکہ تیار کیا ہے اُس کا خیر مقدم کرتا ہو اور اس کی اصلاح کرکے اُس کو چند تکمیلی نقطے FINISHING TOUCHES دے کر مکمل کرتا ہو اور اس کے مطابق انسانیت عامہ کے مفاد کی خاطر عالمگیر، دائمی، ہمہ گیر اور فطرت انسانی سے مطابقت رکھنے والا ایسا تصور حیات تصور اخلاق، اصول معیشت اصول معاشرت اور اصول سیاست ... پیش کرتا ہو جو فلاح وکامرانی' اور سعادت و نیکی کا سرچشمہ' اور سلامتی ورحمت اور اخوت ومحبت کا منبع اصلی ہو۔

ہمارے خیال میں ایسا ایک پروگرام اور ایسا ایک نظام تو پہلے سے اس دنیا میں موجود ہے۔ اس لئے کسی نئے نظام کو من مانے طریقے پر بنانے کی کوشش کرنے کے بجائے بہتر یہ ہے اسی نظام کو قبول کرلیا جائے۔ اور وہ ہے اس کائنات کے خالق اور انسان کے حقیقی حاکم کا بھیجا ہوا دین ——— "اسلامی نظام"!

بہت ممکن ہے اکثر غیر مسلم اصحاب، اور مسلمانوں کے بھی 'ترقی پسند' گروہ سے تعلق رکھنے والے حضرات اسلام کا نام سن کر یکایک چونک پڑیں۔ لیکن ہم ان تمام اصحاب فکر ونظر کو اس امر کی دعوت دیتے ہیں کہ اگر وہ اسلام کی طرف سے ان خیالات کو اپنے ذہن سے نکال دیں جو اسلام کے حقیقی مطالعہ کی وجہ سے نہیں بلکہ چند سنی سنائی باتوں یا عام مسلمانوں کے طرزِ عمل سے اُن کی سمجھ میں آئی ہیں اور اس کے بعد وہ اسلام خالص کا مطالعہ اُس کے اصلی لٹریچر کو سامنے رکھکر کریں تو پھر ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کے بارے میں اُن کی ساری غلط فہمیاں دور ہوجائیں گی اور اسلام کی طرف آنے میں اُن کے لئے سوائے کسی مصنوعی رکاوٹ کے کوئی حقیقی رکاوٹ باقی نہ رہے گی۔ اسلام تو ایک ایسی سچائی ہے جس کو خدا کے اولوالعزم پیغمبروں نے ہر زمانے ہر قوم' اور ہر ملک میں پیش کیا ہے۔ اور کیا تعجب ہے جو خود ہمارے ملک ہندوستان میں بھی خدا کا کوئی سچا پیغمبر جلوہ افروز ہوا ہو سری کرشن جی اور مہاتما گوتم بدھ بہت ممکن ہے خدا کے پیغمبر ہی ہوں۔ لیکن ان کی جو تعلیمات اس وقت موجود ہیں بد قسمتی سے وہ امتداد زمانہ کی نذر ہوچکی ہیں اور "حقیقت خرافات میں کھو گئی ہے" ورنہ اگر آج اُن کی اصلی تعلیمات موجود ہوتیں تو پھر عرب کے نبی امی محمد صلعم کے لائے ہوئے اور ان کے دئے ہوئے ایڈیشن میں کوئی خاص فرق نہ ہوتا۔ ایک سچا مسلمان تو اس بات پر مکلف ہے کہ وہ تمام دنیا میں آنے والے پیغمبروں کو یکساں اسلام کا پیغمبر تسلیم کرے اور ان کی تعظیم وتکریم کرے یہ اور بات ہے کہ بعض جاہل لوگ اپنے جہل کی وجہ سے دوسرے بڑے انسانوں کی تذلیل کرتے ہیں اور بغیر کسی استدلال کے سب کو یکساں جھوٹا قرار دیتے ہیں۔

اسی طرح ہم جدید خیالات کے حامین سے یہ کہیں گے کہ اگر آپ حضرات واقعی اسلام کی طرف سے بے پرواہ ہوچکے ہیں تو پھر جرات سے کام لیں اسلام کا مطالعہ کریں اور آزما دیکھیں کہ کامیابی کی راہ کیا ہے۔ لیکن صدق دل سے پھر سے

اسلام کو سمجھنے کے لئے آمادہ ہیں تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ انسانیت کے دکھوں کا حل اسلام کے سوا اور کسی نظام کے پاس نہیں ہے۔ سب جھوٹے سہارے اور عارضی اور وقتی علاج ہیں۔ حقیقی اور دائمی علاج تو صرف قرآن کے نسخۂ شفا پر عمل کرنے سے ہی ہو سکتا ہے۔

وہ عام مسلمان جو صرف "اسلام زندہ باد" کا نعرہ لگانا جانتے ہیں اور اس کے آگے پیچھے انھیں کچھ معلوم نہیں ہے۔ ہم ان سے بھی یہ کہیں گے کہ اگر تم اپنے آپ کو اسلام کا سچا پیرو بنانے کے لئے تیار ہو تو خود کو مسلمان کہہ سکتے ہو۔ ورنہ محض نام اور نسل کی وجہ سے اسلام سے تعلق نہیں جڑ سکتا۔ اسلام چند اعلیٰ حقیقتوں اور ایک باقاعدہ نظام زندگی کا نام ہے۔ جو ان حقیقتوں کو سمجھتا اور ان پر عمل کرتا ہے وہ مسلمان ہے۔ چاہے وہ نسلی طور پر مسلمان ہو یا غیر مسلم دنیا اس وقت اسلام جیسی کسی حقیقت کیلئے بیتاب ہے۔ وہ چاہتی تو اس کے جیسا ہی کوئی برکتوں والا نظام ہے مگر وہ نہیں جانتی کہ جو کچھ وہ چاہتی ہے وہ سب کچھ اسلام ہی اس کو دے سکتا ہے۔ وہ اسلام کی طرف سے سخت غلط فہمی میں مبتلا ہے اور اس غلط فہمی کی ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے۔ اگر تم اسلام کے سچے علمبردار بن کر اٹھو تو دنیا تم سے سبق حاصل کرے اور اسلام کے پانی سے اپنی پیاس بجھائے۔ لیکن تم حقیقی اسلام کو لیکر اٹھنے کے بجائے صرف اسلام کا لیبل لگا کر اپنی مادی اغراض کو پورا کرنے میں لگے ہوئے ہو کبھی نسل پرستی کے جھنڈے تلے اور کبھی وطن پرستی کے جھنڈے تلے۔ یہ دورنگی تضاد ایک مسلمان کی زندگی سے دور ہونا چاہیئے اگر وہ تضاد کو دور کرنے کے لئے تیار نہ ہوگا تو خدا کا عذاب اُسے نگل جائے گا۔ اور خدا کسی دوسری قوم کو اُٹھائے گا جو سچے اور پورے اسلام کو لے کر اُٹھے گی۔ اور دنیا بھر کی رہنما بن جائے گی۔

لکھنے والوں سے

"انوار" جس مقصد کے لئے شائع ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے دین کی اشاعت اور اسکے انبیا کے لائے ہوئے نظام زندگی کے قیام کی جدوجہد ہے۔ اس غرض کیلئے ہم اس بات کے خواہشمند ہیں کہ ہمارے قلم کار رفقاء مضامین خالص اسلامی نقطۂ نظر سے لکھا کریں۔ جن مضامین میں اسلامی نظام کی انسان کے بنائے ہوئے نظامات کے مقابلہ میں بالاتری ثابت کی گئی ہو وہ خاص طور پر شکریہ کے ساتھ قبول کئے جائیں گے۔ افسانہ، نظم اور ادبی تنقید میں بھی ہم اسی بات کے قائل ہیں کہ ان کے ذریعہ شکم پرستی نفس پرستی اور وطنیت و نسلیت کے بندھنوں سے آزاد ہو کر خالص اخلاقی اور انسانی بنیادوں پر زندگی کے مختلف گوشوں کو صرف بندگی رب کے لئے تیار کیا جائے ہمیں امید ہے کہ ہمارے لکھنے والے اپنے شعور کو اس قدر بیدار کریں گے کہ کوئی بے مقصد تحریر ان کے قلم سے نہ ٹپک پڑے گی۔ ایک اور بات یہ بھی عرض کرنی ہے کہ اکثر رفقاء کا انداز بیان خشک اور زبان بے لطف ہوتی ہے ضرورت ہے کہ نوک قلم زیادہ تیز ہو اور روشنائی میں حلاوت و شیرینی کثیر تعداد میں گھلی ہوئی ہو ورنہ اس کے بغیر یہ بہت مشکل ہوگا کہ ہم اپنے مدعا کو لوگوں کے ذہنوں میں اتار سکیں۔

قرآنی ادب کے جواہر ریزے

"اور یہ منافق"

یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی،
مگر یہ سودا بھی اُن کے لئے نفع بخش نہ ہوا ـــ
اور ہدایت قبول کرنے والے تو یہ تھے ہی نہیں !

ان کی مثال تو ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی، اور جب سارا ماحول روشن ہوگیا تو اللہ نے اِن کی آنکھوں کا نور چھین لیا ـــ اور انہیں اس حال میں چھوڑ دیا کہ تاریکیوں میں انھیں کچھ نظر نہیں آتا۔

یہ تو بہرے ـ گونگے ـ اور اندھے ہیں ـــ یہ اب کبھی نہ پلٹیں گے !!
یا پھر اِن کی مثال تو یوں ہوئی کہ ـــ

آسمان سے زور کی بارش ہورہی ہے ـــ اور اس کے ساتھ اندھیری گھٹا اور کڑک اور چمک بھی ہے ـ یہ بجلی کے کڑاکے سن سن کر کانوں میں انگلیاں ٹھونسے لیتے ہیں ـــ اور حال یہ ہے کہ اللہ نے منکرین حق کو ہر طرف سے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ ـــ

بجلی کی چمک سے اُن کی یہ حالت ہے کہ گویا عنقریب اُن کی بصارت غائب ہوجائیگی،
جب ذرا کچھ روشنی انھیں محسوس ہوتی ہے تو اس میں کچھ دور چل لیتے ہیں !
اور جب اُن پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو کھڑے ہوجاتے ہیں !!
اگر اللہ چاہتا تو ان کی سننے اور دیکھنے کی طاقت بالکل ہی سلب کرلیتا !!!
کیونکہ اللہ بلاشک ہر چیز پر قادر ہے !

(قرآن مجید)
(البقرہ ۲)

تفہیم القرآن

از:—
سید ابوالاعلیٰ مودودی

البقرہ ——— رکوع ۱۹ و ۲۰

[اس ترجمانی کا مطالعہ کرتے وقت قرآن مجید کی اصل عبارت کا پڑھنا ضروری ہے]

اے ایمان لانے والو! صبر اور نماز سے مدد لو۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں انھیں مردہ نہ کہو، ایسے لوگ تو حقیقت میں زندہ ہیں مگر تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہوتا۔ اور ہم ضرور ہی تمھیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کرکے تمھاری آزمائش کریں گے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے تو کہیں کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔ انھیں خوشخبری دیدو، اُن پر اُن کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی اور اُس کی رحمت اُن پر سایہ کرے گی۔ اور ایسے ہی لوگ راست رَو ہیں[1]۔

یقیناً صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، لہٰذا جو شخص بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے اس کے لئے کوئی گناہ کی بات نہیں کہ وہ ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان سعی کرلے[2]۔ اور جو برضا و رغبت کوئی بھلائی کا کام کرے گا[3]

---

[1] منصب امامت پر مامور کرنے کے بعد اب اس امت کو ضروری ہدایات دی جارہی ہیں، مگر تمام دوسری باتوں سے پہلے انہیں جس بات پر متنبہ کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ کوئی پھولوں کا بستر نہیں ہے جس پر تم لٹائے جا رہے ہو، بلکہ اس عظیم الشان خدمت کا بار اُٹھانے کے ساتھ ہی تم پر ہر قسم کے مصائب کی بارش ہوگی، سخت آزمائشوں میں ڈالے جاؤ گے۔ طرح طرح کے نقصان اُٹھانے پڑیں گے۔ اور جب صبر و ثبات، اور عزم و استقلال کے ساتھ ان تمام مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے خدا کی راہ میں بڑھے جاؤ گے تب تم پر عنایات کی بارش ہوگی۔ [2] صفا اور مروہ مسجد حرام کے قریب دو پہاڑیاں ہیں جن کے درمیان دوڑنا منجملہ ان مناسک کے تھا جو اللہ تعالیٰ نے حج کے لئے حضرت ابراہیم کو سکھائے تھے۔ بعد میں جب مکہ اور آس پاس کے تمام علاقوں میں مشرکانہ جاہلیت پھیل گئی تو صفا پر "اساف" اور مروہ پر "نائلہ" کے استھان بنالیے گئے اور ان کے گرد طواف ہونے لگا۔ پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اسلام کی روشنی اہل عرب تک پہنچی تو مسلمانوں کے دلوں میں یہ سوال کھٹکنے لگا کہ آیا صفا اور مروہ کی سعی حج کے اصلی مناسک میں سے ہے یا محض زمانہ شرک کی ایجاد ہے اور یہ کہ اس سعی سے کہیں ہم ایک مشرکانہ فعل کے مرتکب تو نہیں ہو جائیں گے۔ لہٰذا کعبہ کو قبلہ مقرر کرنے کے بعد ضروری احکام و ہدایات

باقی اگلے صفحہ پر

اللہ کو اس کا علم ہے اور وہ اس کی قدر کرنے والا ہے۔

جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں درآں حالیکہ ہم انھیں سب انسانوں کی رہنمائی کے لیے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں۔ یقین جانو ان پر اللہ بھی لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں[۱] البتہ جو اس روش سے باز آجائیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لیں اور جو کچھ چھپاتے تھے اسے بیان کرنے لگیں اُن کو میں معاف کر دوں گا اور میں بڑا درگذر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔

جن لوگوں نے کفر کا رویہ[۲] اختیار کیا اور کفر کی حالت ہی میں جان دی ان پر اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔ اسی لعنت زدگی کی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کی سزا میں تخفیف ہوگی اور نہ انھیں پھر کوئی دوسری مہلت دی جائے گی۔

تمھارا الٰہ ایک ہی الٰہ ہے۔ اس رحمٰن اور رحیم کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں ہے[۳] (اس حقیقت کو پہچاننے کے لئے اگر کوئی نشانی ۱۹ع اور علامت درکار ہے تو) جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں اُن کے لئے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۱۳) ہدایات بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اسی غلط فہمی کو دور فرمایا اور مسلمانوں کو بتایا کہ یہ فعل حج کے ان مناسک میں سے ہے جو اللہ نے مقرر فرمائے تھے اور اس فعل کے کرنے سے تمھیں ہرگز یہ خوف نہ کرنا چاہئے کہ کسی گناہ کے مرتکب ہوگے۔

ف۔ یعنی بہتر تو یہ ہے کہ یہ کام دلی رغبت کے ساتھ کرو ورنہ حکم بجالانے کے لیے تو کرنا ہی ہوگا۔

[۱] علماء یہود کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ انھوں نے کتاب اللہ کا علم پھیلانے کے بجائے ربیوں اور مذہبی پیشہ وروں کے ایک محدود طبقہ تک اسے مقید رکھا اور عامۂ خلائق تو درکنار خود یہودی عوام تک کو علم کتاب کی ہوا نہ لگنے دی۔ پھر جب عام جہالت کی وجہ سے ان میں گمراہیاں پھیلیں تو ان کے علماء نے نہ صرف یہ کہ اصلاح کی کوئی کوشش نہ کی بلکہ عوام میں اپنی مقبولیت برقرار رکھنے کے لئے ان کی ضلالتوں کو اپنے قول و عمل یا اپنے سکوت سے الٹی سندِ جواز عطا کرنے لگے۔ اسی سے بچنے کی تاکید مسلمانوں کو کی جا رہی ہے۔ دنیا کی ہدایت کا کام جس امت کے سپرد کیا جائے اس کا فرض اس ہدایت کو زیادہ سے زیادہ پھیلانا ہے نہ کہ بخیل کے مال کی طرح چھپا کر رکھنا۔

[۲] "کفر" کے اصلی معنی چھپانے کے ہیں۔ اسی سے انکار کا مفہوم پیدا ہوا اور یہ لفظ ایمان کے مقابلہ میں بولا جانے لگا۔ ایمان کے معنے ہیں ماننا، قبول کرنا، تسلیم کر لینا۔ اسکے برعکس کفر کے معنی ہیں نہ ماننا، رد کر دینا، انکار کرنا۔ قرآن کی رو سے کفر کے رویہ کی مختلف صورتیں ہیں۔

ایک یہ کہ انسان سرے سے اللہ ہی کو نہ مانے، یا اس کے اقتدارِ اعلیٰ ہی کو تسلیم نہ کرے اور اس کو اپنا اور ساری کائنات کا الٰہ اور رب ماننے سے انکار کردے، یا اُسے واحد الٰہ اور رب نہ مانے۔

دوسرے یہ کہ اللہ کو تو مانے مگر اُس کے احکام اور اس کی ہدایات کو واحد منبعِ علم و قانون تسلیم کرنے سے انکار کردے۔

(باقی آئندہ صفحہ پر)

پے بہم ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں، اُن کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیئے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اُس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے پھر اُس کے ذریعہ سے زمین کو زندگی بخشتا ہے، اور اپنے اسی انتظام کی بدولت زمین میں ہر قسم کی جان دار مخلوق کو پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں۔ بے شمار نشانیاں ہیں[ـه]۔ مگر (وحدت الٰہ پر دلالت کرنے والے ان کھلے کھلے آثار کے ہوتے ہوئے بھی) کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر اور

(بقیہ سلسلہ حواشی صفحہ ۱۴۱) تیسرے یہ کہ اصولاً اس بات کو بھی تسلیم کرلے کہ اسے اللہ کی ہدایت پر چلنا چاہیئے، مگر اللہ اپنی ہدایات اور اپنے احکام پہنچانے کے لئے جن پیغمبروں کو واسطہ بناتا ہے، انھیں تسلیم نہ کرے۔

چوتھے یہ کہ پیغمبروں کے درمیان تفریق کرے، اور اپنی پسند یا اپنے تعصبات کی بنا پر ان میں سے کسی کو مانے اور کسی کو نہ مانے۔

پانچویں یہ کہ پیغمبروں نے خدا کی طرف سے عقائد، اخلاق اور قوانینِ حیات کے متعلق جو تعلیمات بیان کی ہیں ان کو یا ان میں سے کسی چیز کو قبول نہ کرے۔

چھٹے یہ کہ نظری طور پر تو ان سب چیزوں کو مان لے مگر عملاً احکام الٰہی کی دانستہ نافرمانی کرے اور اس نافرمانی پر اصرار کرتا رہے۔

یہ سب مختلف رویے اللہ کے مقابلہ میں بغاوت کے رویے ہیں اور ان میں سے ہر ایک رویہ کو قرآن کفر سے تعبیر کرتا ہے۔

اور بعض مقامات پر قرآن میں کفر کا لفظ کفرانِ نعمت کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے جو شکر کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔ شکر کے معنی یہ ہیں کہ نعمت جس نے دی ہے انسان اس کا احسان مند ہو، اس کے احسان کی قدر کرے، اس کی دی ہوئی نعمت کو اسی کی رضا کے مطابق استعمال کرے اور اس کا دل اپنے محسن کے لئے وفاداری کے جذبہ سے لبریز ہو۔ اس کے مقابلہ میں کفر یا کفرانِ نعمت یہ ہے کہ آدمی یا تو اپنے محسن کا احسان ہی نہ مانے اور اسے اپنی قابلیت یا کسی غیر کی عنایت یا سفارش کا نتیجہ سمجھے۔ یا اس کی دی ہوئی نعمت کی ناقدری کرے اور اسے ضائع کردے، یا اس کی نعمت کو اس کی رضا کے خلاف استعمال کرے، یا اس کے احسانات کے باوجود اس کے ساتھ غدر اور بیوفائی کرے۔ اس نوع کے کفر کو ہماری زبان میں بالعموم احسان فراموشی، نمک حرامی، غداری اور ناشکرے پن کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ـه یعنی اگر انسان کائنات کے اس کارخانے کو جو شب و روز اس کی آنکھوں کے سامنے چل رہا ہے، محض جانوروں کی طرح نہ دیکھے بلکہ عقل سے کام لے کر اس نظام پر غور کرے اور ضد یا تعصب سے آزاد ہو کر سوچے تو یہ آثار جو اس کے مشاہدے میں آرہے ہیں اُسے اس نتیجہ پر پہنچانے کے لئے بالکل کافی ہیں کہ یہ عظیم الشان نظام ایک ہی قادر مطلق حکیم کے زیر فرمان ہے تمام اختیار و اقتدار بالکل اسی ایک کے ہاتھ میں ہے، کسی دوسرے کی خود مختارانہ مداخلت یا شراکت کے لئے اس نظام میں ذرہ برابر کوئی گنجایش نہیں، لہٰذا فی الحقیقت وہی ایک خدا تمام موجوداتِ عالم کا الٰہ ہے، اس کے سوا کوئی دوسری ہستی کسی قسم کے اختیارات رکھتی ہی نہیں کہ الوہیت میں اس کا کوئی حصہ ہو۔

مدمقابل بناتے ہیں[1] اور ان کے ایسے گرویدہ ہیں جیسی اللہ کے ساتھ گرویدگی ہونی چاہیئے ـــــ حالانکہ ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں[2] ـــــ کاش جو کچھ عذاب کو سامنے دیکھ کر سوجھنے والا ہے وہ آج ہی ان ظالموں کو سوجھ جائے کہ ساری طاقتیں اور سارے اختیارات اللہ ہی کے قبضہ میں ہیں، اور یہ کہ اللہ سزا دینے میں بھی بہت سخت ہے۔ جب وہ سزا دے گا اس وقت کیفیت یہ ہوگی کہ وہی پیشوا اور رہنما جن کی دنیا میں پیروی کی گئی تھی اپنے پیرؤں سے بے تعلقی ظاہر کریں گے، مگر سزا پاکر رہیں گے اور ان کے سارے اسباب و وسائل کا سلسلہ کٹ جائیگا۔ اور وہ لوگ جو دنیا میں ان کی پیروی کرتے تھے، کہیں گے کہ کاش ہم کو پھر ایک موقع دیا جاتا تو جس طرح آج یہ ہم سے بیزاری ظاہر کر رہے ہیں ہم ان سے بیزار ہوکر دکھا دیتے[3]۔ یوں اللہ ان لوگوں کے وہ اعمال جو یہ دنیا میں کر رہے ہیں ان کے سامنے اس طرح لائے گا کہ یہ حسرتوں اور پشیمانیوں کے ساتھ ہاتھ ملتے رہیں گے مگر آگ سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے۔

---

[1] یعنی جو صفات اللہ کے لئے خاص ہیں اُن میں سے بعض کو اُن کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور جو حقوق اللہ کے ہیں اُن میں سے بعض یا تمام حقوق ان کو دیتے ہیں۔ مثلاً سلسلۂ اسباب پر حکمرانی، حاجت روائی، مشکل کشائی، فریادرسی، دعائیں سننا اور غیب و شہادت ہر چیز سے واقف ہونا یہ سب اللہ کی مخصوص صفات ہیں اور یہ صرف اللہ ہی کا حق ہے کہ بندے اسی کو مقتدرِ اعلیٰ مانیں، اُسی کے آگے اعترافِ بندگی میں سر جھکائیں، اسی کی طرف اپنی حاجتوں میں رجوع کریں، اسی کو مدد کے لئے پکاریں، اسی پر بھروسہ کریں، اسی سے امیدیں وابستہ کریں۔ اور اسی سے ظاہر و باطن میں ڈریں۔ اسی طرح مالک الملک ہونے کی حیثیت سے یہ بات بھی اللہ ہی کے لئے خاص ہے کہ اپنی رعیت کے لئے حرام و حلال کے حدود مقرر کرے، ان کے فرائض اور حقوق معین کرے، ان کو امر و نہی کے احکام دے اور انھیں یہ بتائے کہ اس کی دی ہوئی قوتوں اور اس کے بخشے ہوئے وسائل کو وہ کس طرح کن کاموں میں کن مقاصد کے لئے استعمال کریں۔ اور یہ صرف اللہ کا حق ہے کہ بندے اس کی حاکمیت تسلیم کریں اس کو منبعِ قانون مانیں، اس کے امر و نہی کا مختار سمجھیں اپنی زندگی کے معاملات میں اس کے حکم کو فیصلہ کن قرار دیں، اور ہدایت و رہنمائی کے لئے اس کی طرف رجوع کریں۔ جو شخص ان صفات میں سے کسی صفت کو بھی کسی دوسرے کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اور ان حقوق میں سے کوئی ایک حق بھی کسی دوسرے کو دیتا ہے وہ دراصل اسے اللہ کا مدمقابل اور اس کا ہمسر بناتا ہے۔ اور اسی طرح جو شخص یا جماعت ان صفات میں سے کسی صفت کا مدعی ہے اور ان حقوق میں سے کسی حق کا انسانوں سے مطالبہ کرتا ہے وہ دراصل خدا کا مدمقابل اور ہمسر بنتا ہے خواہ زبان سے اس کا دعویٰ کرے یا نہ کرے۔

[2] یعنی ایمان کا اقتضاء یہ ہے کہ آدمی کے لئے اللہ کی رضا ہر دوسرے کی رضا پر مقدم ہو، اور کسی چیز کی محبت بھی انسان کے دل میں یہ مرتبہ اور مقام حاصل نہ کرے کہ وہ اللہ کی محبت پر اُسے قربان نہ کرسکتا ہو۔

[3] یہاں خاص طور پر گمراہ کرنے والے پیشواؤں اور لیڈروں اور ان کے نادان پیرووں کے انجام کا اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ جس غلطی میں مبتلا ہوکر پچھلی امتیں بھٹک گئیں اس سے مسلمان ہشیار رہیں اور رہبروں میں امتیاز کرنا سیکھیں اور غلط رہبری کرنے والوں کے پیچھے چلنے سے بچیں۔

مجھے معلوم نہ تھا

از

ابوالبیان حماد

داغ دل شعلہ فشاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
عشق کا راز عیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

جلوۂ دوست کہ معدوم سمجھتا تھا جسے
وہ بھی در پردہ نہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

خواب میں ان کا دھندلکا سا جو دیکھا تھا کبھی
وہ عیاں تھا کہ نہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

ہو لیا ساتھ کہ چل کر کہیں ٹھیریں گے ضرور
کارواں بس گذراں تھا مجھے معلوم نہ تھا

سود بہبود سمجھتا تھا جسے میں اب تک
وہ حقیقت میں زیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

مجھ سے کیا پوچھتے ہو جلوہ گہ دوست کا حال
اشک گلزار جناں تھا مجھے معلوم نہ تھا

تیری بے لوث محبت کا یقیں تھا مجھ کو
تو خفا اے میری جاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

فصلِ گل میں بھی کہیں دور قفس میں بلبل
محوِ فریاد و فغاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

کب رُکا قافلۂ عمر گریزاں کا قدم
سوِ منزل وہ رواں تھا مجھے معلوم نہ تھا

دل فرخندہ، وہی شمع یقیں کا فانوس
کشتۂ وہم و گماں تھا مجھے معلوم نہ تھا

جستجوئے مہ تاباں میں رہا سرگرداں
وہ تو با دل میں نہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

حسن کی گود میں شاید وہ پلا پھولا ہے
جذبۂ عشق جواں تھا مجھے معلوم نہ تھا

سجدۂ شوق میں حاصل ہوئی معراج یقیں
آستان وجد کناں تھا مجھے معلوم نہ تھا

میں نے ڈھونڈے ہے عبث گوہر مقصود و فا
وہ تو بے نام و نشاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

جسے ایوان فلک بوس سے تشبیہ دی تھی
ایک بوسیدہ مکاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

ان کے خلوت کدۂ عیش سے مدہوش رہا
غم سے معمور جہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

دشت و صحرا و گلستاں میں رہی جس کی تلاش
خود میرے دل میں نہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

ہائے وہ شعلۂ سرکش کہ جلا اور بجھا
ایک تاریک دھواں تھا مجھے معلوم نہ تھا

میں سمجھتا تھا جسے گلشن ہستی کی بہار
وہ بھی اک دور خزاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

کسوت شعر و سخن میں بھی ازل سے پنہاں
حسن انداز بیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

حبذا [illegible] بیدار نیاز حماد
نازش بزم جہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

بناؤ اور بگاڑ

ہندوستان کو "بنانے" والوں کے لئے قابلِ غور!

(از۔ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی)

(یہ تقریر ۱۰ر مئی ۱۹۴۷ء کو دار السلام پٹھان کوٹ کے جلسہ عام میں کی گئی تھی۔ سامعین میں دو ہزار مسلمانوں کے علاوہ ڈیڑھ دو سو ہندو اور سکھ اصحاب بھی شریک تھے۔ پس منظر میں اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سارا مشرقی پنجاب ایک کوہ آتش فشاں کی طرح پھٹنے کے لئے تیار تھا۔ اور تین ہی مہینے بعد وہاں فتنہ و فساد کی وہ آگ بھڑکنے والی تھی جس کی تباہ کاریاں اب تاریخ انسانی کا ایک دردناک ترین باب بن چکی ہیں)

تعریف اور شکر اس خدا کے لئے ہے جس نے ہمیں پیدا کیا۔ عقل اور سمجھ بوجھ عطا۔ بُرے اور بھلے کی تمیز بخشی اور ہماری ہدایت و رہنمائی کے لئے اپنے بہترین بندوں کو بھیجا اور سلام ہو خدا کے ان نیک بندوں پر جنہوں نے آدم کی اولاد کو آدمیت کی تعلیم دی۔ بھلے مانسوں کی طرح رہنا سکھایا۔ انسانی زندگی کے اصل مقصد سے انہیں آگاہ کیا۔ اور وہ اصول ان کو بتائے جن پر چل کر وہ دنیا میں سکھ اور آخرت میں نجات پا سکتے ہیں۔

حاضرین و حاضرات! یہ دنیا جس خدا نے بنائی ہے اور جس نے اس زمین کا فرش بچھا کر اس پر انسان کو بسایا ہے وہ کوئی اندھا دھند اور الل ٹپ کام کرنے والا خدا نہیں ہے۔ وہ چوپٹ راج نہیں ہے کہ اس کی نگری اندھیر نگری ہو۔ وہ اپنے مستقل قانون۔ پختہ ضابطہ اور مضبوط قاعدے رکھتا ہے جن کے مطابق وہ اس سارے جہان پر خدائی کر رہا ہے۔ اس کے قانون سے جس طرح سورج۔ چاند۔ زمین اور تارے بندھے ہوئے ہیں جس طرح ہوا پانی، درخت اور جانور بندھے ہوئے ہیں۔ اسی طرح ہم آپ سب انسان بھی بندھے ہوئے ہیں۔ اس کا قانون جس طرح ہماری پیدائش اور موت پر ہمارے بچپن اور جوانی اور بڑھاپے پر ہمارے سانس کی آمد و رفت پر ہمارے ہاضمے اور خون کی گردش پر اور ہماری بیماری اور تندرستی پر بےلاگ اور اٹل طریقے سے چل رہا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اس کا ایک اور قانون بھی ہے جو ہماری تاریخ کے اتار چڑھاؤ پر ہمارے گرنے اور اٹھنے پر ہماری ترقی اور تنزل پر اور ہماری ذاتی قومی اور ملکی تقدیروں پر حکومت کر رہا ہے۔ اور یہ قانون بھی اتنا ہی بےلاگ اور اٹل ہے۔ اگر یہ ممکن نہیں ہے کہ آدمی ناک سے سانس لینے کے بجائے آنکھوں سے سانس لینے لگے۔ اور معدے میں کھانا ہضم کرنے کے بجائے دل میں ہضم کرنے لگے تو یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ خدا کے قانون کی رو سے جس راہ پر چل کر کسی قوم کو نیچے جانا چاہیئے۔ وہ اسے بلندی پر لے جائے۔ اگر آگ ایک کے لئے گرم اور دوسرے کے لئے ٹھنڈی نہیں ہے تو بُرے کرتوت بھی جو خدا کے قانون کی رو سے بُرے ہیں۔ ایک کو گرانے والے اور دوسرے کو اٹھانے والے نہیں ہو سکتے۔ جو اصول بھی خدا نے انسان کی بھلی اور بری تقدیر بنانے کے لئے مقرر کئے ہیں۔

وہ نہ کسی کے بدلے بدل سکتے ہیں نہ کسی کے ٹالے ٹل سکتے ہیں۔ اور نہ ان میں کسی کے ساتھ دشمنی اور کسی دوسرے کے ساتھ رعایت ہی پائی جاتی ہے۔

خدا کے اس قانون کی پہلی اور سب سے اہم دفعہ یہ ہے کہ

وہ بناؤ کو پسند کرتا ہے اور بگاڑ کو پسند نہیں کرتا

مالک ہونے کی حیثیت سے اس کی خواہش یہ ہے کہ اس کی دنیا کا انتظام ٹھیک کیا جائے۔ اس کو زیادہ سے زیادہ سنوارا جائے۔ اس کے دئے ہوئے ذرائع اور بخشی ہوئی قوتوں اور قابلیتوں کو زیادہ سے زیادہ بہتر طریقے سے استعمال کیا جائے۔ وہ اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا — اور اس سے یہ توقع کی بھی نہیں جا سکتی کہ وہ کبھی اسے پسند کرے گا — کہ اس کی دنیا بگاڑی جائے اجاڑی جائے اور اس کو بدنظمی سے اور ظلم وستم سے خراب کر ڈالا جائے۔ انسانوں میں سے جو لوگ بھی دنیا کے انتظام کے امیدوار بن کر کھڑے ہوتے ہیں۔ ان میں سے صرف وہ لوگ خدا کی نظرِ انتخاب میں مستحق ٹھہرتے ہیں جن کے اندر بنانے کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت ہوتی ہے انہی کو وہ یہاں انتظام کے اختیارات سپرد کرتا ہے۔

پھر وہ دیکھتا رہتا ہے کہ یہ لوگ بناتے کتنا ہیں اور بگاڑتے کتنا۔ جب تک ان کا بناؤ ان کے بگاڑ سے زیادہ ہوتا ہے اور کوئی دوسرا امیدوار ان سے اچھا بنانے والا اور ان سے کم بگاڑنے والا میدان میں موجود نہیں رہتا۔ اس وقت تک ان کی ساری برائیوں اور ان کے تمام قصوروں کے باوجود دنیا کا انتظام انہی کے سپرد رہتا ہے۔ مگر جب وہ کم بنانے اور زیادہ بگاڑنے لگتے ہیں تو خدا انھیں ہٹا کر پھینک دیتا ہے اور دوسرے امیدواروں کو اسی لازمی شرط پر انتظام سونپ دیتا ہے۔

فطری قانون

یہ قانون بالکل ایک فطری قانون ہے اور آپ کی عقل گواہی دے گی کہ اس کو ایسا ہی ہونا چاہئیے۔ اگر آپ میں سے کسی شخص کا کوئی باغ ہو اور وہ اسے ایک مالی کے سپرد کرے تو آپ خود بتائیے کہ وہ اس مالی سے اولین بات کیا چاہے گا؟ باغ کا مالک اپنے مالی سے اس کے سوا آخر اور کیا چاہ سکتا ہے کہ وہ اس کے باغ کو بنائے نہ کہ خراب کرکے رکھ دے۔ وہ تو لازماً یہی چاہے گا کہ اس کے باغ کو زیادہ سے زیادہ بہتر حالت میں رکھا جائے زیادہ سے زیادہ ترقی دی جائے۔ اس کے حسن میں۔ اس کی صفائی میں۔ اس کی پیداوار میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو۔ جس مالی کو وہ دیکھے گا کہ وہ خوب محنت سے جی لگا کر سلیقے اور قابلیت کے ساتھ اس کے باغ کی خدمت کر رہا ہے۔ اس کی روشوں کو سنوار رہا ہے۔ اس کے اچھے درختوں کو پرورش کر رہا ہے اس کو بری ذات کے درختوں اور جھاڑ جھنکاڑ سے صاف کر رہا ہے اور اس میں اپنی جدت اور جودت سے عمدہ پھلوں اور پھولوں کی نئی نئی قسموں کا اضافہ کر رہا ہے تو ضرور ہے کہ وہ اس سے خوش ہو اسے ترقی دے اور ایسے لائق فرض شناس اور خدمت گزار مالی کو نکالنا کبھی پسند نہ کرے۔ لیکن اس کے برعکس اگر وہ دیکھے کہ مالی نالائق بھی ہے۔ کام چور بھی ہے اور جان بوجھ کر یا بے جانے بوجھے اس باغ کے ساتھ بدخواہی بھی کر رہا ہے۔ سارا باغ گندگیوں سے اٹا پڑا ہے۔ روشیں ٹوٹ پھوٹ رہی ہیں۔ پانی کہیں بلا ضرورت بہہ رہا ہے اور کہیں قطعے کے قطعے سوکھتے جا رہے ہیں۔ گھانس پھونس اور جھاڑ جھنکاڑ بڑھتے چلے جاتے ہیں اور پھولوں اور پھلدار درختوں کو

بے دردی کے ساتھ شاخ کاٹ کر اس ٹھنٹھ کو پھینک دیا جاتا ہے جو اچھے درخت مرجھا رہے ہیں۔ اور خاردار جھاڑیاں بڑھ رہی ہیں تو آپ خود ہی سوچیے کہ باغ کا مالک ایسے مالی کو کیسے پسند کر سکتا ہے یا نہیں۔۔ بعض نادانوں کو نسی عرض معروض اور دست بستہ التجائیں اور کونسے کیا اُس کے حقوق یا دوسرے خود ساختہ حقوق کا لحاظ اس کو۔ اب باغ ایسے مالی کے حوالے کے رہنے پر آمادہ کر سکتا ہے، زیادہ سے زیادہ رعایت وہ بس اتنی ہی تو کرے گا کہ اسے تنبیہ کر کے پھر ایک موقع دیدے۔ مگر مالی تنبیہ پر بھی ہوش میں نہ آئے، اور باغ کو اجاڑتا ہی چلا جائے اس کا علاج اس کے سوا اور کیا ہے کہ باغ کا مالک کان پکڑ کر اسے نکال باہر کرے۔ اور دوسرا مالی اس کی جگہ رکھ لے۔

اب غور کیجیے کہ اپنے ایک ذرا سے باغ کے انتظام میں جب آپ یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں تو خدا جس نے اتنی بڑی زمین اتنے سروسامان کے ساتھ انسانوں کے حوالے کی ہے۔ اور اتنے وسیع اختیارات ان کو اپنی دنیا اور اس کی چیزوں پر دے رکھے ہیں۔ وہ آخر اس سوال کو نظر انداز کیسے کر سکتا ہے کہ آپ اس کی دنیا بنا رہے ہیں یا بگاڑ رہے ہیں۔ آپ بنا رہے ہوں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ آپ کو خواہ مخواہ ہٹا دے لیکن اگر آپ بنائیں کچھ نہیں اور اس کے اس عظیم الشان باغ کو بگاڑتے اور اجاڑتے ہی چلے جائیں تو آپ نے اپنے دعوے اپنی دانست میں خواہ کیسی ہی زبردست من مانی بنیادوں پر قائم رکھے ہوں، وہ اپنے باغ پر آپ کے کسی حق کو تسلیم نہیں کرے گا۔ اور کچھ تنبیہات کر کے سنبھلنے کے دو چار مواقع دے کر آخر آپ کو انتظام سے بے دخل ہی کر کے چھوڑے گا۔

سبکدوشی اور تقرر

اس معاملہ میں خدا کا نقطۂ نظر انسانوں کے نقطۂ نظر سے اسی طرح مختلف ہے جس طرح خود انسانوں میں ایک باغ کے مالک کا نقطۂ نظر اس کے مالی کے نقطۂ نظر سے مختلف ہوا کرتا ہے۔ فرض کیجیے کہ مالیوں کا ایک خاندان دو چار پشت سے ایک شخص کے باغ میں کام کرتا چلا آ رہا ہے۔ ان کا کوئی دادا پردادا اپنی لیاقت و قابلیت کی وجہ سے یہاں رکھا گیا تھا پھر اس کی اولاد نے بھی اچھا کام کیا تو مالک نے سوچا کہ خواہ مخواہ انھیں ہٹانے اور نئے آدمی رکھنے کی کیا ضرورت ہے جب کام یہ بھی اچھا ہی کر رہے ہیں تو ان کا حق دوسروں سے زیادہ ہے۔ اس طرح یہ خاندان باغ میں جم گیا۔ لیکن اب اس خاندان کے لوگ نہایت نالائق۔ بے سلیقہ، کام چور اور نا فرض شناس اٹھے ہیں۔ باغبانی کی کوئی صلاحیت ان کے اندر نہیں ہے۔ سارے باغ کا ستیاناس کیے ڈالتے ہیں۔ اور اس پر ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم باپ دادا کے وقتوں سے اس باغ میں رہتے چلے آتے ہیں۔ ہمارے پردادا ہی کے ہاتھوں اول اول یہ باغ آباد ہوا تھا لہٰذا ہمارے اس پر پیدائشی حقوق ہیں اور اب کسی طرح یہ جائز نہیں ہے کہ ہمیں بے دخل کر کے کسی دوسرے کو مالی بنا دیا جائے۔ یہ ان نالائق مالیوں کا نقطۂ نظر ہے مگر کیا باغ کے مالک کا نقطۂ نظر بھی یہی ہو سکتا ہے؟ کیا وہ یہ نہ کہے گا کہ میرے نزدیک تو سب سے مقدم چیز میرے باغ کا حسن انتظام ہے۔ میں نے یہ باغ تمہارے پردادا کے لئے نہیں لگایا تھا بلکہ تمہارے پردادا کو اس باغ کے لئے نوکر رکھا تھا۔ تمہارے اس پر جو حقوق بھی ہیں خدمت اور قابلیت کے ساتھ مشروط ہیں۔ باغ کو بناؤ گے تو تمہارے سب حقوق کا لحاظ کیا جائے گا۔ اپنے پرانے مالیوں سے آخر مجھے کیا دشمنی ہو سکتی ہے کہ وہ کام اچھا کریں تب بھی میں انہیں خواہ مخواہ نکال ہی دوں اور نئے امیدواروں کا بلا ضرورت تجربہ کروں۔ لیکن اگر اس باغ کو تم بگاڑو اور اجاڑتے رہے جس کے انتظام کی خاطر تمہیں رکھا گیا تھا تو پھر تمہارا حق مجھے تسلیم نہیں ہے دوسرے امیدوار موجود

ہی باغ کا انتظام ان کے حوالے کر دوں گا اور تم کو ان کے ماتحت محض خدمت گار بن کر رہنا ہوگا۔ اس پر بھی اگر تم درست نہ ہوئے اور ثابت ہوا کہ ماتحت کی حیثیت سے بھی تم کسی کام کے نہیں ہو بلکہ کچھ بگاڑنے ہی والے ہو تو تمہیں یہاں سے نکال باہر کیا جائے گا۔ اور تمہاری جگہ خدمت گار کہیں دوسرے ہی لا کر بسائے جائیں گے۔

یہ فرق جو مالک اور مالیوں کے نقطۂ نظر میں ہے۔ ٹھیک یہی فرق دنیا کے مالک اور دنیا والوں کے نقطۂ نظر میں بھی ہے۔ دنیا کی مختلف قومیں زمین کے جس جس خطے میں بستی ہیں۔ ان کا دعویٰ یہی ہے کہ یہ خطہ ہمارا قومی وطن ہے۔ پشتہا پشت سے ہم اور ہمارے باپ دادا یہاں رہتے چلے آرہے ہیں اس ملک پر ہمارے پیدائشی حقوق ہیں۔ لہٰذا یہاں انتظام ہمارا ہی ہونا چاہیے۔ کسی دوسرے کو حق نہیں پہنچتا کہ باہر سے آکر یہاں کا انتظام کرے۔ مگر زمین کے اصلی مالک خدا کا نقطۂ نظر یہ نہیں ہے۔ اس نے کبھی ان قومی حقوق کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ وہ نہیں مانتا کہ ہر ملک پر اس کے باشندوں کا پیدائشی حق ہے جس سے اس کو کسی حال میں بے دخل نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تو یہ دیکھتا ہے کہ کوئی قوم اپنے وطن میں کام کیا کر رہی ہے اگر وہ بناؤ اور سنوار کے کام کرتی ہو۔ اگر وہ اپنی قوتیں زمین کی اصلاح و ترقی میں استعمال کرتی ہو۔ اگر وہ برائیوں کی پیداوار روکنے اور بھلائیوں کی کھیتی سینچنے میں لگی ہوئی ہو تو مالک کائنات کہتا ہے کہ بے شک تم اس کے مستحق ہو کہ یہاں کا انتظام تمہارے ہاتھ میں رہنے دیا جائے تم پہلے سے یہاں آباد بھی ہو اور اہل بھی ہو لہٰذا تمہارا ہی حق دوسروں کی بہ نسبت مقدم ہے۔ لیکن اگر معاملہ برعکس ہو بناؤ کچھ نہ ہو اور سب بگاڑ ہی کے کام ہوئے جا رہے ہوں۔ بھلائیاں کچھ نہ ہوں اور برائیوں ہی سے خدا کی زمین بھری جا رہی ہو۔ جو کچھ خدا نے زمین پر پیدا کیا ہے اسے بیدردی کے ساتھ تباہ کیا جا رہا ہو۔ اور کوئی بہتر کام اس سے لیا ہی نہ جاتا ہو تو پھر خدا کی طرف سے پہلے کچھ ہلکی اور کچھ سخت چوٹیں لگائی جاتی ہیں تاکہ یہ لوگ ہوش میں آئیں اور اپنا رویہ درست کر لیں۔ پھر جب وہ قوم اس پر بھی درست نہیں ہوتی تو اسے ملک کے انتظام سے بے دخل کر دیا جاتا ہے اور کسی دوسری قوم کو جو کم از کم اس کی نسبت اہل تر ہو وہاں کی حکومت دے دی جاتی ہے۔ اور بات اسی پر ختم نہیں ہو جاتی۔ اگر ماتحتی میں بھی باشندگان ملک کسی لیاقت و اہلیت کا ثبوت نہیں دیتے۔ اور اپنے عمل سے یہی ظاہر کرتے ہیں کہ ان سے کچھ بھی بن نہ آئے گا بلکہ کچھ بگڑے گا ہی تو خدا پھر ایسی قوم کو مٹا دیتا ہے۔ اور دوسروں کو لے آتا ہے جو اس کی جگہ بستے ہیں۔ اس معاملہ میں خدا کا نقطۂ نظر ہمیشہ وہی ہوتا ہے جو مالک کا ہونا چاہیے۔ وہ اپنی زمین کے انتظام میں دعویداروں اور امیدواروں کے آبائی یا پیدائشی حقوق نہیں دیکھتا۔ بلکہ یہ دیکھتا ہے کہ ان میں سے کون بناؤ کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت اور بگاڑ کی طرف کم سے کم میلان رکھتا ہے۔ ایک وقت کے امیدواروں میں سے جو اس لحاظ سے اہل تر نظر آتے ہیں انتخاب انہی کا ہوتا ہے اور جب تک ان کے بگاڑ سے ان کا بناؤ زیادہ رہتا ہے۔ یا جب تک ان کی بہ نسبت زیادہ اچھا بنانے والا اور کم بگاڑنے والا کوئی میدان میں نہیں آ جاتا اس وقت تک انتظام انہی کے سپرد رہتا ہے۔

ہندوستان کی تاریخ

یہ جو کچھ عرض کر رہا ہوں تاریخ گواہ ہے کہ خدا نے ہمیشہ اپنی زمین کا انتظام اسی اصول پر کیا ہے۔ دور کیوں جائیے خود اپنے ہی ملک کی تاریخ دیکھ لیجئے۔ یہاں جو قومیں پہلے آباد تھیں۔ ان کی تعمیری صلاحیتیں جب ختم ہو گئیں تو خدا نے آریوں کو یہاں کے انتظام کا موقع دیا جو اپنے وقت کی قوموں میں سب سے زیادہ اچھی صلاحیتیں رکھتے تھے۔ انہوں نے یہاں آکر ایک بڑے

اندار تمدن کی بنا رکھی۔ بہت سے علوم و فنون ایجاد کئے۔ زمین کے خزانوں کو نکالا اور انہیں بہتری میں استعمال کیا۔ بگاڑ سے زیادہ بناؤ کے کام
رکے دکھائے۔ یہ قابلیتیں جب تک ان میں رہیں تاریخ کے سارے نشیبوں اور فرازوں کے باوجود وہی اس ملک کے منتظم رہے۔ دوسرے
میدوار بڑھ بڑھ کر آگے آئے مگر دھکیل دیے گئے کیونکہ ان کے ہوتے دوسرے منتظم کی ضرورت نہ تھی۔ ان کے حملے زیادہ سے زیادہ بس یہ حیثیت
رکھتے تھے کہ جب کبھی یہ ذرا بگڑنے لگے تو کسی کو بھیجا گیا تاکہ انہیں متنبہ کر دے۔ مگر جب یہ بگڑتے ہی چلے گئے۔ اور انہوں نے بناؤ کے کام
اور بگاڑ کے کام زیادہ کرنے شروع کر دیئے۔ جب انہوں نے اخلاق میں پستی اختیار کی جس کے آثار رام مارگی تحریک میں آپ اب بھی دیکھ سکتے
ہیں جب انہوں نے انسانیت کو تقسیم کر کے خود اپنی ہی سوسائٹی کو دونوں اور ذاتوں میں پھاڑ ڈالا اور اپنی اجتماعی زندگی کو ایک زینے
کی شکل میں ترتیب دیا جس کی ہر سیڑھی کا بیٹھنے والا اپنے سے اوپر کی سیڑھی والے کا بندہ اور نیچے کی سیڑھی والے کا خدا بن گیا۔ جب انہوں نے
. . . . خدا کے لاکھوں کروڑوں بندوں پر وہ ظلم ڈھایا جو آج تک اچھوت پن کی شکل میں موجود ہے۔ جب انہوں نے علم کے دروازے
عام انسانوں پر بند کر دیئے۔ اور ان کے پنڈت علم کے خزانوں پر سانپ بن کر بیٹھ گئے اور جب ان کے کار فرما طبقوں کے پاس اپنے زبردستی جمائے ہوئے حقوق
وصول کرنے اور دوسروں کی محنتوں پر داد عیش دینے کے سوا کوئی کام نہ رہا تو خدا نے آخرکار ان سے ملک کا انتظام چھین لیا۔ اور وسط ایشیا
کی ان قوموں کو یہاں کام کرنے کا موقع دیا جو اس وقت اسلام کی تحریک سے متاثر ہو کر زندگی کی بہتر صلاحیتوں سے آراستہ ہو گئی تھیں۔

یہ لوگ سینکڑوں برس تک یہاں کے انتظام پر سرفراز رہے۔ اور اس کے ساتھ خود اس ملک کے بھی بہت سے لوگ اسلام قبول
کر کے شامل ہو گئے۔ اس میں شک نہیں کہ ان لوگوں نے بہت کچھ بگاڑا بھی۔ مگر جتنا بگاڑا اس سے زیادہ بنایا۔ کئی سو برس تک ہندوستان
میں بناؤ کا جو کام بھی ہوا انہیں کے ہاتھوں ہوا یا پھر ان کے اثر سے ہوا۔ انہوں نے علم کی روشنی پھیلائی۔ خیالات کی اصلاح کی۔ تمدن
و معاشرت کو بہت کچھ درست کیا۔ ملک کے ذرائع و وسائل کو اپنے عہد کے معیار کے لحاظ سے بہتری میں استعمال کیا۔ اور امن و انصاف
کا عمدہ نظام قائم کیا۔ جو اگرچہ اسلام کے اصلی معیار سے بہت کم تھا۔ مگر پہلے کی حالت اور گرد و پیش کے دوسرے ملکوں کی حالت
سے مقابلہ کرتے ہوئے کافی بلند تھا۔ اس کے بعد وہ بھی اپنے پیش روؤں کی طرح بگڑنے لگے۔ ان کے اندر بھی بناؤ کی صلاحیتیں
گھٹنی شروع ہوئیں اور بگاڑ کے میلانات بڑھتے چلے گئے۔ انہوں نے بھی اونچ نیچ اور نسلی امتیازات اور طبقاتی تفریقیں کر کے خود
اپنی سوسائٹی کو پھاڑ دیا جس کے بے شمار اخلاقی سیاسی اور تمدنی نقصانات ہوئے انہوں نے بھی انصاف کم اور ظلم زیادہ کرنا شروع
کر دیا۔ وہ بھی حکومت کی ذمہ داریوں کو بھول کر صرف اس کے فائدوں اور زیادہ تر ناجائز فائدوں پر نظر رکھنے لگے۔ انہوں نے بھی تعمیر
و ترقی اور اصلاح کے کام چھوڑ کر دی ہوئی قوتوں اور ذرائع کو ضائع کرنا شروع کیا۔ اور اگر استعمال کیا بھی تو زیادہ تر زندگی کو
بگاڑنے والے کاموں میں کیا۔ تن آسانی و عیش پرستی میں وہ اتنے کھوئے گئے کہ جب آخری شکست کھا کر ان کے فرمانرواؤں
نے دلی کے لال قلعہ سے نکلنا پڑا تو ان کے شاہزادے ـــــ وہی جو ملک کی حکومت کے امیدوار تھے۔ جان بچانے کے لئے بھاگ
بھی نہ سکتے تھے کیونکہ زمین پر چلنا انہوں نے چھوڑ رکھا تھا۔ مسلمانوں کی عام اخلاقی پستی اس حد تک پہنچ گئی کہ ان کے عوام سے

لے کر چھوٹے بڑے ذمہ دار لوگوں تک کسی میں بھی اپنی ذات کے سوا دوسری کسی چیز کی وفاداری باقی نہ رہی جو انھیں دین فروشی، قوم فروشی اور ملک فروشی سے روکتی۔ ان میں ہزاروں لاکھوں پیشہ ور سپاہی پیدا ہونے لگے جن کی اخلاقی حالت پالتو کتوں کی سی تھی کہ جو چاہے روٹی دیکر انھیں پال لے اور پھر جس کا دل چاہے ان سے شکار کرالے ان میں یہ احساس بھی باقی نہ رہا تھا کہ ذلیل ترین پیشہ، جس کی بدولت ان کے دشمن خود انھیں کے ہاتھوں ان کا ملک فتح کر رہے تھے۔ اپنے اندر کوئی ذلت کا پہلو بھی رکھتا ہے۔ غالب جیسا شخص فخریہ کہتا ہے کہ "سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری" یہ بات کہتے ہوئے ہمارے اتنے بڑے شاعر کو ذرا خیال تک نہ گزرا کہ پیشہ ورانہ سپہ گری کوئی فخر کی نہیں ڈوب مرنے کی بات ہے

جب یہ ان کی حالت ہو گئی تو خدا نے ان کی معزولی کا بھی فیصلہ کر لیا۔ اور ہندوستان کے انتظام کا منصب پھر نئے امیدواروں کے لئے کھل گیا۔ اس موقع پر چار امیدوار میدان میں تھے۔ مرہٹے۔ سکھ۔ انگریز اور بعض مسلمان رئیس۔ آپ خود انصاف کے ساتھ قومی تعصب کی عینک اتار کر اس دور کی تاریخ اور بعد کے حالات کو دیکھیں گے تو آپ کا دل گواہی دے گا کہ دوسرے امیدواروں میں سے کسی میں بھی بناؤ کی وہ صلاحیتیں نہ تھیں جو انگریزوں میں تھیں اور جتنا بگاڑ انگریزوں میں تھا۔ اس سے کہیں زیادہ بگاڑ مرہٹوں۔ سکھوں اور مسلمان امیدواروں میں تھا۔ جو کچھ انگریزوں نے بنایا وہ ان میں سے کوئی نہ بناتا اور جو کچھ انہوں نے بگاڑا اس سے بہت زیادہ یہ امیدوار بگاڑ کر رکھ دیتے۔ مطلقاً دیکھئے تو انگریزوں میں بہت سے پہلوؤں سے بے شمار برائیاں آپ کو نظر آئیں گی۔ مگر مقابلتاً دیکھئے تو اپنے ہم عصر حریفوں سے ان کی برائیاں بہت کم اور ان کی خوبیاں بہت زیادہ نکلیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے قانون نے پھر ایک مرتبہ انسانوں کے اس من مانے اصول کو توڑ دیا جو انہوں نے بغیر کسی حق کے بنا رکھا ہے کہ ہر ملک خود ملکیوں کے ہی خواہ وہ اسے بنائیں یا بگاڑیں" اس نے تاریخ کے اٹل فیصلہ سے ثابت کیا کہ نہیں ملک تو خدا کا ہے وہی یہ طے کرنے کا حق رکھتا ہے کہ اس کا انتظام کس کے سپرد کرے۔ اور اس کا فیصلہ کسی نسلی۔ قومی یا آبائی حق کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ اس بنیاد پر ہوتا ہے کہ مجموعی بھلائی کون سے انتظام میں ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ٘ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِیَدِكَ الْخَیْرُ اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ [1]

اس طرح اللہ تعالیٰ ہزاروں میل کے فاصلہ سے ایک ایسی قوم کو لے آیا جو کبھی یہاں تین چار لاکھ کی تعداد سے زیادہ نہیں رہی اور اس نے یہیں کے ذرائع اور یہیں کے آدمیوں سے یہاں کی ہندو مسلم۔ سکھ سب طاقتوں کو زیر کرکے اس ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یہاں کے کروڑوں باشندے ان مٹھی بھر انگریزوں کے تابع فرمان بنکر رہے۔ ایک ایک انگریز نے تن تنہا ایک ایک ضلع پر حکومت کی۔ بغیر اس کے کہ اس کی قوم کا کوئی دوسرا فرد اس کا ہاتھ مضبوط کرنے کے لئے اس کے پاس موجود ہوتا۔ اس تمام دوران میں ہندوستانیوں نے جو کچھ کیا پیش خدمت

---

[1] کہو کہ خدایا ملک کے مالک! تو جس کو چاہتا ہے ملک دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ملک چھین لیتا ہے جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔ بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے اور تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

کی حیثیت سے کیا نہ کہ کارفرما کی حیثیت سے ہم سب کو یہ ماننا پڑے گا اور نہ ماننا چاہیں تو حقیقت کو جھٹلائیں گے کہ اس ساری مدت میں جب کہ انگریز یہاں رہے بناؤ کا جو کچھ بھی کام ہوا انگریزوں کے ہاتھوں سے اور ان کے اثر سے ہوا جس حالت میں انہوں نے ہندوستان کو پایا تھا اس کے مقابلہ میں آج کی حالت دیکھئے تو آپ اس بات سے انکار نہ کر سکیں گے کہ ..... بگاڑ کے باوجود بناؤ کا بہت سا کام ہوا ہے جس کے خود اہل ملک کے ہاتھوں انجام پانے کی ہرگز توقع نہ کی جا سکتی تھی۔ اس لئے ... یہ الہیٰ کا وہ فیصلہ غلط نہ تھا جو اس نے اٹھارویں صدی کے وسط میں کر دیا تھا۔

اب دیکھئے کہ جو کچھ انگریز بنا سکتے تھے وہ بنا چکے ہیں۔ ان کے بناؤ کے حساب میں اب کوئی خاص اضافہ نہیں ہو سکتا۔ اس حساب میں جو اضافہ وہ کر سکتے ہیں وہ دوسروں کے ہاتھوں بھی ہو سکتا ہے مگر دوسری طرف ان کے بگاڑ کا حساب بہت بڑھ چکا ہے اور جتنی مدت بھی وہ یہاں رہیں گے بناؤ کی بہ نسبت بگاڑ ہی زیادہ بڑھائیں گے ــــ ان کی فرد جرم اتنی لمبی ہے کہ اسے ایک صحبت میں بیان کرنا مشکل ہے اور اس کے بیان کی کوئی حاجت بھی نہیں ہے کیونکہ وہ سب کے سامنے ہے۔ اب تقدیر الہیٰ کا فیصلہ یہی ہے کہ وہ یہاں کے انتظام سے بے دخل کر دئے جائیں انہوں نے بہت عقلمندی سے کام لیا کہ خود سیدھی طرح رخصت ہونے کے لئے تیار ہو گئے۔ سیدھی طرح نہ جاتے تو ٹیڑھی طرح نکالے جاتے کیونکہ خدا کے اٹل قوانین اب ان کے ہاتھ میں یہاں کا انتظام رکھنے کے روادار نہیں ہیں۔

خدمت کے نئے امیدوار

یہ موقع جس کے عین سرے پر ہم آپ کھڑے ہیں۔ تاریخ کے ان اہم مواقع میں سے ہے جب زمین کا اصلی مالک کسی ملک میں ایک انتظام کو ختم کرتا ہے اور دوسرے انتظام کا فیصلہ کرتا ہے۔ بظاہر جس طرح یہاں انتقال اختیارات کا معاملہ طے ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے اس سے دھوکا نہ کھانا چاہئے کہ یہ قطعی فیصلہ ہے جو ملک کا انتظام خود اہل ملک کے حوالے کئے جانے کے حق میں ہو رہا ہے۔ آپ شاید معاملہ کی سادہ سی صورت یہ سمجھتے ہیں کہ اجنبی لوگ جو باہر سے آ کر حکومت کر رہے تھے۔ واپس جا رہے ہیں ۔ اس لئے اب یہ آپ سے آپ ہونا ہی چاہئے کہ ملک کا انتظام خود ملکیوں کے ہاتھ آئے نہیں۔ خدا کے فیصلے اس طرح کے نہیں ہوتے وہ ان اجنبیوں کو نہ پہلے بلا وجہ لایا تھا اور نہ اب بلا وجہ لے جا رہا ہے نہ پہلے اس نے اہل ملک سے آپ سے انتظام چھینا تھا۔ اور نہ اب اہل ملک وہ اسے آپ کے حوالہ کر دے گا۔ دراصل اس وقت ہندوستان کے باشندے امیدوار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندو۔ مسلمان۔ سکھ سب امیدوار ہیں۔ چونکہ یہ پہلے سے یہاں آباد چلے آ رہے ہیں اس لئے پہلا موقع انہی کو دیا جاتا ہے لیکن یہ مستقل تقرر نہیں ہے بلکہ محض امتحانی موقع ہے۔ اگر فی الواقع انہوں نے ثابت کیا کہ ان کے اندر بگاڑ سے بڑھ کر بناؤ کی صلاحیتیں ہیں تب تو ان کا تقرر مستقل ہو جائے گا ورنہ اپنے بناؤ سے بڑھ کر اپنا بگاڑ پیش کر کے یہ بہت جلدی دیکھ لیں گے کہ انہیں پھر اس ملک کے انتظام سے بے دخل کر دیا جائے گا اور دور اور نزدیک کی قوموں میں سے کسی ایک کو اس خدمت کے لئے منتخب کر لیا جائے گا۔ پھر اس فیصلے کے خلاف یہ کوئی فریاد تک نہ کر سکیں گے دنیا بھر کے سامنے اپنی نالائقی کا کھلا ثبوت دے چکنے کے بعد ان کا منہ کیا ہو گا کہ فریاد کریں اور ڈھیٹ بن کر فریاد کریں گے بھی تو اس کی داد کون دے گا۔

اب ذرا آپ جائزہ لے کر دیکھیں کہ ہندوستان کے لوگ ہندو، مسلمان۔ سکھ اس امتحان کے موقع پر اپنے خدا کے سامنے اچھا کیا عملا جیتنی اور قابلیتیں اور اپنے کیا اوصاف اور کارنامے پیش کر دے ہیں جن کی بنا پر یہ امید کر سکتے ہوں کہ خدا اپنے ملک کا انتظام پھر ان کے سپرد

کر دے گا اس موقع پر اگر میں بے لاگ طریقے سے کھلم کھلا وہ فرد جرم سنا دوں جو اخلاق کی عدالت میں ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں سب پر لگتی ہے تو میں امید کرتا ہوں آپ بُرا نہ مانیں گے۔ اپنی قوم اور اپنے وطنی بھائیوں کے عیوب بیان کر کے خوشی تو مجھے بھی نہیں ہوتی حقیقت میں میرا دل روتا ہے کیونکہ میں گویا اپنی آنکھوں سے اس انجام کو دیکھ رہا ہوں جو ان عیوب کی بنا پر کل انھیں دیکھنا ہی نہیں بھگتنا بھی پڑے گا مجھے اندیشہ ہے کہ یہ عیوب انھیں لے ڈوبیں گے ہم آپ کوئی بھی ان کے انجام بد سے نہ بچے گا اس لئے میں انہیں دلی رنج کے ساتھ بیان کرتا ہوں تاکہ جن کے کان ہوں وہ سنیں اور اصلاح کی کچھ فکر کریں

ہمارے عوام کی اخلاقی حالت

ہمارے افراد کی عام اخلاقی حالت جیسی کچھ ہے آپ اس کا اندازہ خود اپنے دلی تجربات و مشاہدات کی بنا پر کیجئے۔ ہم میں کتنے فیصدی آدمی ایسے پائے جاتے ہیں جو کسی کا حق تلف کرنے میں کوئی ناجائز فائدہ اٹھانے میں کوئی "سفید" جھوٹ بولنے اور کوئی "نفع بخش" بے ایمانی کرنے میں صرف اس بنا پر تامل کرتے ہوں کہ ایسا کرنا اخلاقی بُرا ہے جہاں قانون گرفت نہ کرتا ہو جہاں قانون کی گرفت سے بچ نکلنے کی امید ہو وہاں کتنے فیصدی اشخاص محض اپنے اخلاقی احساس کی بنا پر کسی جرم اور کسی بُرائی کا ارتکاب کرنے سے باز رہ جاتے ہیں۔ جہاں اپنے کسی ذاتی فائدے کی توقع نہ ہو وہاں کتنے آدمی دوسروں کے ساتھ بھلائی ہمدردی۔ ایثار۔ حق رسانی اور حسن سلوک کا برتاؤ کرتے ہیں؟ ہمارے تجارت پیشہ لوگوں میں ایسے تاجروں کا اوسط کیا ہے جو دھوکے اور فریب اور جھوٹ اور ناجائز نفع اندوزی سے پرہیز کرتے ہوں؟ ہمارے صنعت پیشہ لوگوں میں ایسے افراد کا تناسب کیا ہے جو اپنے فائدے کے ساتھ کچھ اپنے خریداروں کے مفاد اور اپنی قوم اور اپنے ملک کی مصلحت کا بھی خیال رکھتے ہوں؟ ہمارے زمینداروں میں کتنے ہیں جو غلہ روکتے ہوئے اور بے محا گراں قیمتوں پر بیچتے ہوئے یہ سوچتے ہوں کہ اپنی اس نفع اندوزی سے وہ کتنے لاکھ بلکہ کتنے کروڑ انسانوں کو فاقہ کشی کا عذاب دے رہے ہیں؟ ہمارے مالداروں میں کتنے ہیں جن کی دولت مندی میں کسی ظلم کسی حق تلفی کسی بددیانتی کا دخل نہیں ہے۔ ہمارے محنت پیشہ لوگوں میں کتنے ہیں جو فرض شناسی کے ساتھ اپنی اجرت اور اپنی تنخواہ کا حق ادا کرتے ہیں؟ ہمارے سرکاری ملازموں میں کتنے ہیں جو رشوت اور خیانت سے ظلم اور مردم آزاری سے کام چوری اور حرام خوری سے اور اپنے اختیارات کے ناجائز استعمال سے بچے ہوئے ہیں؟ ہمارے وکیلوں میں ہمارے ڈاکٹروں اور حکیموں میں۔ ہمارے اخبار نویسوں میں۔ ہمارے ناشرین و مصنفین میں اور ہمارے قومی "خدمت گزاروں" میں کتنے ہیں جو اپنے فائدے کی خاطر ناپاک سے ناپاک طریقے اختیار کرنے اور خلق خدا کو ذہنی۔ اخلاقی۔ مالی اور جسمانی نقصان پہنچانے میں کچھ بھی شرم محسوس کرتے ہوں؟ شاید میں مبالغہ نہ کروں گا۔ اگر یہ کہوں کہ ہماری آبادی میں بمشکل ۵ فیصدی لوگ اس اخلاقی جذام سے بچے رہ گئے ہیں ورنہ ۹۵ فیصدی کو یہ چھوت بری طرح لگ چکی ہے اس معاملہ میں ہندو مسلمان سکھ۔ عیسائی اور ہریجن کے درمیان کوئی امتیاز نہیں۔ سب کے سب یکساں بیمار ہیں۔ سب کی اخلاقی حالت انتہائی خوفناک حد تک گری ہوئی ہے اور کسی گروہ کا حال دوسرے سے بہتر نہیں

اجتماعی شر و فساد کا آغاز

اخلاقی تنزل کی یہ وبا جب افراد کی ایک بہت بڑی اکثریت کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تو قدرتی بات تھی کہ وسیع پیمانے پر اجتماعی شکل میں اس کا ظہور شروع ہو جائے۔ اس آنے والے طوفان کی پہلی علامت اس وقت نظر آئی جب جنگ کی وجہ سے ریلوں میں مسافروں کا ہجوم ہونے لگا۔ وہاں ایک ہی قوم اور ایک ہی ملک کے لوگوں نے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جس خود غرضی، بے دردی اور سنگدلی کا سلوک کیا وہ پتہ دے رہا تھا کہ ہمارے عام اخلاق کس تیز رفتاری کے ساتھ گر رہے ہیں۔ پھر اشیاء کی گرانی کے ساتھ ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری بڑے وسیع پیمانہ پر شروع ہوئی۔ پھر بنگال کا وہ ہولناک مصنوعی قحط رونما ہوا جس میں ہمارے ایک طبقہ نے اپنے ہی ملک کے لاکھوں انسانوں کو اپنے نفع کی خاطر بھوک سے تڑپا تڑپا کر مار دیا۔ یہ سب ابتدائی علامات تھیں۔ اس کے بعد خباثت، کمینہ پن، درندگی اور وحشت کا وہ لاوا یکایک پھٹ پڑا جو ہمارے اندر مدتوں سے پک رہا تھا۔ اور اب وہ فرقہ وارانہ فساد کی شکل میں ہندوستان کو ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک بھسم کر رہا ہے۔ کلکتہ کے فساد کے بعد سے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کی کشمکش کا جو نیا باب شروع ہوا ہے۔ اس میں یہ تینوں قومیں اپنی ذلیل ترین صفات کا مظاہرہ کر رہی ہیں جن افعال کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کوئی انسان کبھی ان کا بھی مرتکب ہو سکتا ہے۔ آج ہماری بستیوں کے رہنے والے علانیہ ان کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ بڑے بڑے علاقوں کی پوری پوری آبادیاں غنڈہ بن گئی ہیں۔ اور وہ کام کر رہی ہیں جو کسی غنڈے کے خواب و خیال میں بھی کبھی نہ آئے تھے۔ شیر خوار بچوں کو ماؤں کے سینوں پر رکھ کر ذبح کیا گیا ہے۔ زندہ انسانوں کو آگ میں بھونا گیا ہے۔ شریف عورتوں کو برسر عام ننگا کیا گیا ہے۔ اور ہزاروں کے مجمع میں ان کے ساتھ بدکاری کی گئی ہے۔ باپوں، شوہروں اور بھائیوں کے سامنے ان کی بیٹیوں، بیویوں اور بہنوں کو بے عزت کیا گیا ہے۔ عبادت گاہوں اور مذہبی کتابوں پر غصہ نکالنے کی ناپاک ترین شکلیں اختیار کی گئی ہیں۔ بیماروں اور زخمیوں اور بوڑھوں کو انتہائی بے رحمی کے ساتھ مارا گیا ہے۔ مسافروں کو چلتی ریل پر سے پھینکا گیا ہے۔ زندہ انسانوں کے اعضاء کاٹے گئے ہیں۔ نہتے اور بے بس انسانوں کا جانوروں کی طرح شکار کیا گیا ہے۔ ہمسایوں نے ہمسایوں کو لوٹا ہے۔ دوستوں نے دوستوں سے دغا کی ہے۔ پناہ دینے والوں نے خود اپنی دی ہوئی پناہ کو توڑا ہے۔ امن و امان کے محافظ پولیس اور فوج اور مجسٹریٹوں نے علانیہ فساد میں حصہ لیا ہے۔ بلکہ خود فساد کیا۔ اور اپنی حمایت و نگرانی میں فساد کرایا ہے۔ غرض ظلم و ستم سنگدلی و بے رحمی اور کمینگی و بد معاشی کی کوئی قسم ایسی نہیں رہ گئی ہے جس کا ارتکاب ان چند مہینوں میں ہمارے ملک کے رہنے والوں نے اجتماعی طور پر نہ کیا ہو۔ اور ابھی دلوں کا غبار پوری طرح نکلا نہیں ہے۔ آثار بتا رہے ہیں کہ یہ سب کچھ اس سے بہت زیادہ بڑے پیمانہ پر اور بدرجہا بدتر صورت میں ابھی ہونے والا ہے۔

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ محض کسی اتفاقی ہیجان کا نتیجہ ہے؟ اگر یہ آپ کا گمان ہے تو آپ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ ابھی میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اس ملک کی آبادی کے (۹۵) فیصدی افراد اخلاقی حیثیت سے بیمار ہو چکے ہیں۔ جب افراد کی اتنی بڑی اکثریت بد اخلاق ہو جائے تو قوموں کا اجتماعی رویہ آخر کیسے درست رہ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو، مسلمان اور سکھ تینوں قوموں میں سچائی، انصاف اور حق پسندی کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہی ہے۔ راست باز، دیانت دار اور شریف انسان ان کے اندر اکّا دکّا بن کر رہ گئے ہیں جن کی

سے روکنا اور بھلائی کی نصیحت کرنا ان کی سوسائٹی میں ایک ناقابل برداشت جرم ہو گیا ہے۔ حق اور انصاف کی بات سننے کے لئے وہ تیار نہیں ان میں سے ہر ایک قوم کو وہی لوگ پسند ہیں جو اس کی حد سے بڑھی ہوئی خواہشات اور اغراض کی وکالت کریں۔ دوسروں کے خلاف اس کے تعصبات کو بھڑکائیں۔ اور اس کے جائز و ناجائز مقاصد کے لئے لڑنے کو تیار رہیں۔ اسی بنا پر ان قوموں نے چھانٹ چھانٹ کر اپنے اندر سے بدترین آدمیوں کو چنا اور انھیں اپنا نمائندہ بنایا۔ انہوں نے اپنے اکابر مجرمین کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا اور انھیں اپنا سربراہ کار بنا لیا۔ ان کی سوسائٹی میں جو لوگ سب سے زیادہ پست اخلاق، بے ضمیر اور بے اصول تھے۔ وہ ان کی ترجمانی کے لئے اٹھے۔ اور اخبار نویسی کے میدان میں وہی سب سے بڑھ کر مقبول ہوئے۔ پھر یہ سب لوگ بگاڑ کی راہ پر اپنی اپنی بگڑی ہوئی قوموں کو سرپٹ لے کر چلے۔ انہوں نے متضاد قومی خواہشات کو کسی نقطۂ انصاف پر جمع کرنے کے بجائے اتنا بڑھایا کہ وہ آخر کار نقطۂ تصادم پر پہنچ گئیں۔ انہوں نے معاشی و سیاسی اغراض کی کشمکش میں غصہ اور نفرت اور عداوت کا زہر ملایا اور اسے روز بروز بڑھاتے چلے گئے۔ انہوں نے برسوں اپنی اپنی زیر اثر قوموں کو اشتعال انگیز تقریروں اور تحریروں کے انجکشن دے دے کر یہاں تک بھڑکایا کہ وہ جوش میں آ کر کتوں اور بھیڑیوں کی طرح لڑنے کھڑی ہو گئیں۔ انہوں نے عوام اور خواص کے دلوں کو ناپاک جذبات کی سنڈاس اور اندھی دشمنی کا تنور بنا کر رکھ دیا۔ اب جو طوفان آپ کی نگاہوں کے سامنے برپا ہے یہ کوئی وقتی اور ہنگامی چیز نہیں ہے جو اچانک رونما ہو گئی ہو۔ یہ تو قدرتی نتیجہ ہے بگاڑ کے ان بے شمار اسباب کا جو مدتوں سے ہمارے اندر کام کر رہے تھے۔ اور یہ نتیجہ بس ایک ہی دفعہ ظاہر ہو کر نہیں رہ جائیگا۔ بلکہ جب تک وہ اسباب اپنا کام کئے جا رہے ہیں یہ روز افزوں ترقی کے ساتھ ظاہر ہوتا چلا جائے گا۔ یہ ایک بس بھری فصل ہے جو برسوں کی تخم ریزی و آبیاری کے بعد اب پک کر تیار ہوئی ہے اور اسے آپ کو اور آپ کی نسلوں کو نہ معلوم کب تک کاٹنا پڑے گا۔

نااہلیت کا ثبوت

حضرات آپ ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ عین اس وقت جب کہ قانون قدرت کے مطابق اس ملک کی قسمت کا نیا انتظام درپیش ہے۔ ہم مالک زمین کے سامنے اپنی اہلیت و قابلیت کا کیا ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ موقع تو یہ تھا کہ ہم اپنے طرز عمل سے یہ ثابت کرتے کہ وہ اپنی زمین کا انتظام ہمارے حوالے کریگا تو ہم اسے خوب بنا سنوار کر گلزار بنا دیں گے۔ ہم اس میں انصاف کریں گے۔ اسے ہمدردی اور تعاون اور رحمت کا گہوارہ بنائیں گے۔ اس کے وسایل کو اپنی اور انسانیت کی فلاح میں استعمال کریں گے اس میں بھلائیوں کو پروان چڑھائیں گے اور برائیوں کو دبائیں گے۔ لیکن ہم اسے بتا رہے ہیں کہ ہم ایسے غارت گر اس قدر مفسد اور اتنے ظالم ہیں کہ اگر تو نے یہ زمین ہمارے حوالے کی تو ہم اس کی بستیوں کو اجاڑیں گے محلے کے محلے اور اور گاؤں کے گاؤں پھونک دیں گے۔ انسانی جان کو مکھی اور مچھر سے زیادہ بے قیمت کر دیں گے۔ عورتوں کو بے عزت کریں گے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کا شکار کریں گے۔ بوڑھوں اور بیماروں اور زخمیوں پر بھی رحم نہ کھائیں گے۔ عبادت گاہوں اور مذہبی کتابوں تک کو اپنے نفس کی گندگی سے لیس دیں گے اور جس زمین کو تو نے انسانوں سے آباد کیا ہے اس کی رونق ہم لاشوں اور جلی ہوئی عمارتوں سے بڑھائیں گے۔ کیا واقعی آپ کا ضمیر یہ گواہی دیتا ہے کہ اپنی یہ خدمات۔ یہ اوصاف یہ کارنامے پیش کر کے آپ خدا کی نگاہ میں اس کی

زمین کے انتظام کے لئے اہل ترین بندے قرار پائیں گے۔ کیا یہ کرتوت دیکھ کر وہ آپ سے کہے گا کہ "شاباش! اے میرے پرانے مالیوں کی اولاد تم ہی سب سے بڑھ کر میرے اس باغ کی رکھوالی کے قابل ہو۔ اسی لئے میں نے پچھلے ساہی اجاڑنے اور بگاڑنے، اسی تباہی و بربادی اور گندگی و غلاظت کے لئے تو میں نے یہ باغ لگایا تھا۔ تو اب اسے اپنے ہاتھ میں لے کر خوب خراب کرو۔"

میں یہ باتیں آپ سے اس لئے نہیں کہہ رہا ہوں کہ آپ اپنے آپ سے اور اپنے ملک کے مستقبل سے مایوس ہو جائیں۔ میں نہ خود مایوس ہوں اور نہ کسی کو مایوس کرنا چاہتا ہوں۔ دراصل میرا مدعا آپ کو یہ بتانا ہے کہ ہندوستان کے لوگ اپنی حماقت اور جہالت سے اس زرین موقع کو کھونے پر تلے ہوئے ہیں جو کسی ملک کی قسمت بدلتے وقت صدیوں کے بعد خداوند عالم اس کے باشندوں کو دیا کرتا ہے۔ یہ وقت تھا کہ وہ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اپنے اعلیٰ اوصاف اور اپنی بہتر صلاحیتوں کا ثبوت پیش کرتے تاکہ خدا کی نگاہ میں انتظام زمین کے اہل قرار پاتے مگر آج ان کے درمیان مقابلہ اس چیز میں ہو رہا ہے کہ کون زیادہ غارت گر، زیادہ سفاک اور زیادہ ظالم ہے تاکہ سب سے بڑھ کر خدا کی لعنت کا وہی مستحق قرار پائے۔ یہ لچھن آزادی و ترقی اور سرفرازی کے نہیں ہیں۔ ان سے تو اندیشہ ہے کہ کہیں پھر ایک مدت دراز کے لئے ہمارے حق میں غلامی اور ذلت کا فیصلہ نہ لکھ دیا جائے۔ لہٰذا جو لوگ عقل و ہوش رکھتے ہیں انھیں ان حالات کی اصلاح کے لئے کچھ فکر کرنی چاہیئے۔

اصلاح حال کا طریقہ

اس مرحلہ پر آپ کے دل میں یہ سوال خود بخود پیدا ہو جائے گا کہ اصلاح کی صورت کیا ہے۔ میں اس کا جواب دینے کے لئے حاضر ہوں۔

اس تاریکی میں ہمارے لئے امید کی ایک ہی شعاع ہے اور وہ یہ ہے کہ ہماری پوری آبادی بگڑ کر نہیں رہ گئی ہے بلکہ اس میں کم از کم چار پانچ فیصدی لوگ ایسے ضرور موجود ہیں جو اس عام بداخلاقی سے بچے ہوئے ہیں۔ یہی وہ سرمایہ ہے جس کو اصلاح کی ابتدا کرنے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اصلاح کی راہ میں پہلا قدم یہ ہے کہ اس صالح عنصر کو چھانٹ کر منظم کیا جائے۔ ہماری بدقسمتی کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ہمارے ہاں بدی تو منظم ہے اور پوری باقاعدگی کے ساتھ اپنا کام کر رہی ہے لیکن نیکی منظم نہیں ہے۔ نیک لوگ موجود ضرور ہیں مگر منتشر ہیں۔ ان کے اندر کوئی ربط اور تعلق نہیں ہے۔ کوئی تعاون اور اشتراک عمل نہیں ہے۔ کوئی لائحہ عمل اور مشترک آواز نہیں ہے۔ اسی چیز نے ان کو بالکل بے اثر بنا دیا ہے۔ کبھی کوئی اللہ کا بندہ اپنے گردوپیش کی برائیوں کو دیکھ کر چیخ اٹھتا ہے۔ مگر جب کسی طرف سے کوئی آواز اس کی تائید میں نہیں اٹھتی تو مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ کبھی کوئی شخص حق اور انصاف کی بات علانیہ کہہ بیٹھتا ہے مگر منظم بدی زبردستی اس کا منہ بند کر دیتی ہے اور حق پسند لوگ بس اپنی جگہ چپکے سے اس کو داد دے کر رہ جاتے ہیں۔ کبھی کوئی شخص انسانیت کا خون ہوتے دیکھ کر صبر نہیں کر سکتا۔ اور اس پر احتجاج کر گزرتا ہے۔ مگر ظالم لوگ ہجوم کر کے اسے دبا لیتے ہیں۔ اور اس کا حشر دیکھ کر بہت سے ان لوگوں کی ہمتیں پست ہو جاتی ہیں جن کے ضمیر میں ابھی کچھ زندگی باقی ہے۔ یہ حالت اب ختم ہونی چاہیئے۔ اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہمارا ملک خدا کے عذاب میں مبتلا ہو اور اس عذاب میں نیک و بد سب گرفتار ہو جائیں تو ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ ہمارے اندر جو صالح عناصر اس اخلاقی وبا سے بچے رہ گئے ہیں وہ اب مجتمع اور منظم ہوں! اور اجتماعی طاقت سے اس بڑھتے ہوئے فتنے کا مقابلہ کریں جو تیزی کے ساتھ ہمیں تباہی کی طرف لئے جا رہا ہے۔

منظم نیکی کی ضرورت

آپ اس سے نہ گھبرائیں کہ یہ صالح عنصر اس وقت بظاہر بہت ہی مایوس کن اقلیت میں ہے۔ یہی تھوڑے سے لوگ اگر منظم ہو جائیں۔ اگر ان کا اپنا ذاتی اور جماعتی رویہ خالص راستی۔ انصاف۔ حق پسندی اور خلوص و دیانت کے مضبوطی کے ساتھ قائم ہو۔ اور اگر وہ مسائل زندگی کا ایک بہترین حل اور دنیا کے معاملات کو درست طریقہ پر چلانے کے لئے ایک اچھا پروگرام بھی رکھتے ہوں تو یقین جانئے کہ اس منظم نیکی کے مقابلہ میں منظم بدی۔ اپنے لشکروں کی کثرت اور اپنے گندے ہتیاروں کی تیزی کے باوجود شکست کھا کر رہے گی۔ انسانی فطرت شر پسند نہیں ہے۔ اسے دھوکہ ضرور دیا جا سکتا ہے اور ایک بڑی حد تک مسخ بھی کیا جا سکتا ہے مگر اس کے اندر بھلائی کی قدر کا جو مادہ خالق نے ودیعت کر دیا ہے اسے بالکل معدوم نہیں کیا جا سکتا۔ انسانوں میں ایسے لوگ تھوڑے ہی ہوتے ہیں جو بدی ہی سے دلچسپی رکھتے ہوں اور اس کے علمبردار بنکر کھڑے ہوں اور ایسے لوگ بھی کم ہوتے ہیں جنہیں نیکی سے عشق ہو اور اسے قائم کرنے کی جدو جہد کریں۔ ان دونوں گروہوں کے درمیان عام انسان نیکی اور بدی کے ملے جلے رجحانات رکھتے ہیں۔ وہ نہ بدی کے گرویدہ ہوتے ہیں۔ اور نہ نیکی ہی سے انھیں غیر معمولی دلچسپی ہوتی ہے۔ ان کے کسی ایک طرف جھک جانے کا انحصار تمام تر اس پر ہوتا ہے کہ خیر و شر کے علمبرداروں میں سے کون آگے بڑھ کر انھیں اپنے راستہ کی طرف کھینچتا ہے۔ اگر خیر کے علمبردار سرے سے میدان میں آئیں ہی نہیں اور ان کی طرف سے عوام الناس کو بھلائی کی راہ پر چلانے کی کوئی کوشش ہی نہ ہو تو لامحالہ میدان علمبرداران شر ہی کے ساتھ رہے گا۔ اور وہ عام انسانوں کو اپنی راہ پر کھینچ لے جائیں گے۔ لیکن اگر خیر کے علمبردار بھی میدان میں موجود ہوں اور وہ اصلاح کی کوشش کا حق ٹھیک ٹھیک ادا کریں تو عوام الناس پر علمبرداران شر کا اثر زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ ان دونوں کا مقابلہ آخر کار اخلاق کے میدان میں ہوگا اور اس میدان میں نیک انسانوں کو برے انسان کبھی شکست نہیں دے سکتے۔ سچائی کے مقابلہ میں جھوٹ ایمانداری کے مقابلہ میں بے ایمانی اور پاکبازی کے مقابلہ میں بدکرداری خواہ کتنا ہی زور لگالے۔ آخری جیت۔ بہرحال سچائی، پاکبازی اور ایمانداری ہی کی ہوگی۔ دنیا اس قدر بے حس نہیں ہے کہ اچھے اخلاق کی مٹھاس اور برے اخلاق کی تلخی کو چکھ لینے کے بعد آخر کار اس کا فیصلہ یہی ہو کہ مٹھاس سے تلخی زیادہ بہتر ہے۔

بناؤ اور بگاڑ کا ضابطہ

اصلاح کے لئے نیک انسانوں کی تنظیم کے ساتھ دوسری چیز یہ ہے کہ ہمارے سامنے بناؤ اور بگاڑ کا ایک واضح تصور موجود ہو۔ ہم اچھی طرح یہ سمجھ لیں کہ بگاڑ کیا ہے تاکہ اسے دور کرنے کی کوشش کی جائے اور بناؤ کیا ہے تاکہ اسے عمل میں لانے پر سارا زور لگا دیا جائے۔ تفصیلات میں جانے کا اس وقت موقع نہیں ہے۔ میں بڑے اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے ان دونوں چیزوں کی ایک تصویر پیش کروں گا۔

انسانی زندگی میں بگاڑ جن چیزوں سے پیدا ہوتا ہے ان کو ہم چار بڑے بڑے عنوانات کے تحت جمع کر سکتے ہیں۔

۱۔ خدا سے بے خوفی جو دنیا میں بے انصافی۔ بے رحمی۔ خیانت اور ساری اخلاقی برائیوں کی جڑ ہے۔

۲۔ خدا کی ہدایت سے بے نیازی جس نے انسان کے لئے کسی معاملہ میں بھی ایسے مستقل اخلاقی اصول باقی نہیں رہنے دئے ہیں جن کی پابندی کی جائے۔ اسی چیز کی بدولت اشخاص اور گروہوں اور قوموں کا سارا طرز عمل۔ مفاد پرستی۔ لذت پرستی اور خواہشات کی غلامی پر قائم

ہو گیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ نہ اپنے مقاصد میں جائز و ناجائز کی تمیز کرتے ہیں اور نہ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے کسی قسم کے بُرے سے بُرے ذرائع اختیار کرنے میں انہیں ذرا سا تامل ہوتا ہے۔

(۳) خود غرضی جو صرف افراد ہی کو ایک دوسرے کی حق تلفی پر آمادہ نہیں کرتی بلکہ بڑے پیمانہ پر نسل پرستی، قوم پرستی اور طبقاتی امتیاز کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور اس سے فساد کی بے شمار صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔

(۴) جمود یا بے راہ روی جس کی وجہ سے انسان یا تو خدا کی دی ہوئی قوتوں کو استعمال ہی نہیں کرتا یا غلط استعمال کرتا ہے یا تو خدا کے بخشے ہوئے ذرائع سے کام نہیں لیتا یا غلط کام لیتا ہے۔ پہلی صورت میں اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ کاہل اور نکمے لوگوں کو زیادہ دیر تک اپنی زمین پر قابض نہیں رہنے دیتا بلکہ ان کی جگہ ایسے لوگوں کو لے آتا ہے جو کچھ نہ کچھ بنانے والے ہوں۔ دوسری صورت میں جب غلط قوموں کی تخریب ان کی تعمیر سے بڑھ جاتی ہے تو وہ ہٹا کر پھینک دی جاتی ہیں۔ اور بسا اوقات خود اپنی ہی کارروائیوں کا لقمہ بنا دی جاتی ہیں۔

اس کے مقابلہ میں وہ چیزیں بھی، جن کی بدولت انسانی زندگی بنتی اور سنورتی ہے چار ہی عنوانات کے تحت تقسیم ہوتی ہیں۔

(۱) خدا کا خوف جو آدمیوں کو برائیوں سے روکنے اور سیدھا چلانے کے لئے ایک ہی قابلِ اعتماد ضمانت ہے۔ راستبازی۔ انصاف، امانت، حق شناسی، ضبطِ نفس اور تمام دوسری خوبیاں جن پر ایک پُر امن اور ترقی پذیر تمدن و تہذیب کی پیدائش کا انحصار ہے۔ اسی کے تخم سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگرچہ بعض دوسرے عقیدوں کے ذریعہ سے بھی کسی نہ کسی حد تک انھیں پیدا کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح مغربی قوموں نے کچھ نہ کچھ اپنے اندر پیدا کیا ہے۔ لیکن ان ذرائع سے پیدا کی ہوئی خوبیوں کا نشو و نما بس ایک حد پر جا کر رُک جاتا ہے، اور اس حد میں بھی ان کی بنیاد متزلزل رہتی ہے۔ صرف خدا ترسی ہی وہ پائیدار بنیاد ہے جس پر انسان کے اندر برائی سے رکنے اور بھلائی پر چلنے کی صفت مضبوطی کے ساتھ قائم ہوتی ہے اور محدود پیمانے پر نہیں بلکہ نہایت وسیع پیمانے پر تمام انسانی معاملات میں اپنا اثر دکھاتی ہے۔

(۲) خدائی ہدایت کی پیروی جو انسان کے شخصی۔ اجتماعی، قومی اور بین الاقوامی رویہ کو اخلاق کے مستقل اصولوں کا پابند کرنے کی ایک ہی صورت ہے۔ جب تک انسان اپنے اخلاقی اصولوں کا خود واضع اور مصنف رہتا ہے اس کے پاس باتیں بنانے کے لئے کچھ اور اصول ہو رہیں اور عمل میں لانے کے لئے کچھ اور کتابوں میں آب زر سے وہ ایک قسم کے اصول لکھتا ہے اور معاملات میں اپنے مطلب کے بالکل دوسری ہی قسم کے اصول برتتا ہے۔ دوسروں سے مطالبہ کرتے وقت اس کے اصول کچھ ہوتے ہیں۔ اور خود معاملہ کرتے وقت کچھ موقع اور مصلحت اور خواہش اور ضروریات کے دباؤ سے اس کے اصول ہر آن بدلتے ہیں۔ وہ اخلاق کا اصل محور "حق" کو نہیں بلکہ "اپنے مفاد" کو بناتا ہے وہ اس بات کو مانتا ہی نہیں کہ اس کے عمل کو حق کے مطابق ڈھلنا چاہیے۔ اس کے بجائے وہ چاہتا ہے کہ حق اس کے مفاد کے مطابق ڈھلے یہی وہ چیز ہے جس کی بدولت افراد سے لے کر قوموں تک سب کا رویہ غلط ہو جاتا ہے اور اسی سے دنیا میں فساد پھیلتا ہے۔ اس کے برعکس جو چیز انسان کو امن۔ خوش حالی اور فلاح و سعادت بخش سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اخلاق کے کچھ ایسے اصول ہوں جو کسی کے مفاد کے لحاظ سے نہیں بلکہ حق کے لحاظ سے بنے ہوئے ہوں اور انھیں اٹل مان کر تمام معاملات میں ان کی پابندی کی جائے خواہ وہ معا

شخصی ہوں یا قومی، خواہ وہ تجارت سے تعلق رکھتے ہوں یا سیاست اور صلح و جنگ سے ظاہر ہے کہ ایسے اصول صرف خدائی ہدایت ہی میں مل سکتے ہیں اور ان پر عمل درآمد کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ انسان ان کے اندر رد و بدل کے اختیار سے دست بردار ہو کر انھیں قطعی واجب الاتباع تسلیم کرے۔

(۳) نظام انسانیت جو شخصی۔ قومی نسلی اور طبقاتی خود غرضیوں کے بجائے تمام انسانوں کے مساوی مرتبے اور مساوی حقوق پر مبنی ہو جس میں بیجا امتیازات نہ ہوں جس میں اونچ نیچ، چھوت چھات اور مصنوعی تعصبات نہ ہوں جس میں بعض کے لئے مخصوص حقوق اور بعض کے لئے بناوٹی پابندیاں اور رکاوٹیں نہ ہوں جس میں سب کو یکساں پھلنے پھولنے کا موقع ملے۔ جس میں انسان کی پستی و بلندی صرف اس کے اوصاف کی بنا پر ہو جس میں اتنی وسعت ہو کہ روئے زمین کے سارے انسان اس میں برابری کے ساتھ شریک ہو سکتے ہوں۔

(۴) عمل صالح یعنی خدا کی دی ہوئی قوتوں اور اس کے بخشے ہوئے ذرائع کو پوری طرح استعمال کرنا اور صحیح استعمال کرنا۔

حضرات! یہ چار چیزیں ہیں جن کے مجموعہ کا نام "بناؤ" اور "صلاح" ہے اور ہم سب کی بہتری اس میں ہے کہ ہمارے اندر نیک انسانوں کی ایک ایسی تنظیم موجود ہو جو بگاڑ کے اسباب کو روکنے اور بناؤ کی ان صورتوں کو عمل میں لانے کے لئے پیہم جدوجہد کرے یہ جدوجہد اگر اس ملک کے باشندوں کو راہ راست پر لانے میں کامیاب ہوگئی تو خدا ایسا بے انصاف نہیں ہے کہ وہ خواہ مخواہ اپنی زمین کا انتظام اس کے اصلی باشندوں سے چھین کر کسی اور کو دیدے۔ لیکن اگر خدانخواستہ یہ ناکام ہوئی تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا آپ کا اور اس ارض ہند کے رہنے والوں کا کیا انجام ہوگا۔ (ترجمان القرآن)

قواعد ایجنسی

(۱) تمام معاملات دیانتداری اور خدا کے سامنے جوابدہی کے تصور سے کئے جائیں (۲) زر امانت یا پیشگی کی ضرورت نہیں ہم ہر انسان کی انسانیت پر اعتماد کرتے ہیں (۳) کم از کم پانچ پرچے منگوانا ہوں گے (۴) کمیشن ہر صورت میں ۲۵ فیصدی دیا جائے گا (۵) پرچے ہمیشہ ذریعہ بک پوسٹ روانہ ہوں گے اور اس کا خرچ دفتر کے ذمہ ہوگا (۶) وی۔ پی یا رجسٹری منگوانے کی صورت میں خرچ ڈاک ایجنسی کے ذمہ ہوگا۔ (۷) ڈاک کی خرابیوں کا دفتر ذمہ دار نہیں (۸) جو پرچے آرڈر کے مطابق روانہ کئے جائیں گے وہ دفتر کو واپس نہ ہو سکیں گے اِلّا یہ کہ کوئی خاص ضرورت ہو۔ (۹) آرڈر سے زیادہ روانہ کئے ہوئے پرچے اگر فروخت نہ ہوں تو دفتر کو واپس کئے جا سکتے ہیں اور ان کا خرچ ڈاک بھی دفتر ہی برداشت کرے گا (۱۰) ایسے ایجنٹ حضرات جن کو تطوعاً بطور تجربہ پرچے روانہ کئے گئے ہوں ان سے دفتر توقع رکھے گا کہ وہ ان کی اشاعت میں حصہ لیں گے ورنہ انھیں واپس قبول کر لیا جائیگا۔

ہندوستان کے تمام شہروں میں ایسے ایجنٹوں کی ضرورت ہے جو انوار میں پیش ہونیوالے خیالات سے ہمدردی رکھتے ہوں

ضرار محمود جبریل

"بالِ جبریل"

آرزو کوچۂ جاناں میں رہے گرمِ سفر
راہ میں روک بھی حائل نہ ہو ایسا تو نہیں

جذبۂ شوق فزوں تر ہے بہت خوب سہی
کوئی اک جذبہ بھی گھائل نہ ہو ایسا تو نہیں

خار و گل سے یہ بھری بزم، او دوست گلچیں
آرزو کانٹوں پہ مائل نہ ہو ایسا تو نہیں

اس کشاکش کی بلانوشی میں رندوں کے ساتھ
مرضیٔ ساقی بھی شامل نہ ہو ایسا تو نہیں

انتظار ان کو ہے بس ایک منا لینے کا
مدعا میرا اور حاصل نہ ہو ایسا تو نہیں

ہم کو معلوم ہیں آدابِ رہ و رسمِ وفا
قلب آمادۂ سائل نہ ہو ایسا تو نہیں

حبذا شوقِ فراواں کی جنوں انگیزی
شوق "پابند سلاسل" نہ ہو ایسا تو نہیں

ملتہب ہیں مری فطرت کے شرارے ہر سو
موجِ مضطر سرِ ساحل نہ ہو ایسا تو نہیں

ہے وفورِ غمِ جذبات کی تصویر لئے
دل عنایات کے قابل نہ ہو ایسا تو نہیں

بالِ جبریل جلے جاتے ہیں سدرہ کے قریں
شوقِ آگاہِ مراحل نہ ہو ایسا تو نہیں

ایک ہمدردانہ مشورہ

جسے حیدرآباد کی مسلم قیادت نے رد کردیا!

سقوط حیدرآباد سے تقریباً ۹ مہینے قبل ڈسمبر ۴۷ء میں ہندوستان و پاکستان کے ایک جلیل القدر مفکر اور عالم دین نے حیدرآباد کے مسلم رہنماؤں کے سامنے یہاں کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے ایک لائحہ عمل رکھا تھا کہ اگر وہ قبول کرلیا جاتا تو کیا تعجب تھا کہ آج حیدرآباد کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا اور حیدرآباد کی مسلمانوں کو اس تباہی اور مصیبت سے نجات مل جاتی جس میں وہ آج گھرے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ اس مفید اور اہم مشورہ کو پرکاہ کے برابر بھی اہمیت نہ دی گئی اور اسے صاف رد کردیا گیا۔ بلاشبہ آج کے بدلے ہوئے حالات میں یہ "مشورہ" بظاہر سود مند نظر نہیں آتا۔ لیکن اس کے مطالعہ سے اتنا اندازہ ضرور ہوگا کہ ماضی میں جو غلطیاں کی گئیں ان کی صحیح نوعیت کیا تھی اور غلط کار سیاست نے اپنی کشتی کو اپنے ہی نتائج کے بھنور میں کس طرح ڈبو دیا۔ پھر اس میں مستقبل کا خاکہ بنانے والوں کے لئے بھی ایک اچھا خاصہ درس عبرت موجود ہے۔ اور یقیناً جب آئندہ زمانہ میں کوئی مورخ اس عہد کی تاریخ لکھے گا تو اس مشورہ اور اس کی تردید کے واقعہ کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہوگی۔ (ادارہ)

حیدرآباد کے مسلمانوں سے دینی اخوت کی بناء پر میرا جو تعلق ہے اگرچہ اس کا بھی یہ تقاضہ ہے کہ میں اس نازک موقع پر ان کو ایک خیرخواہانہ مشورہ دوں لیکن اس کے علاوہ حیدرآباد سے اس بناء پر میرا ایک ذاتی تعلق بھی ہے کہ اورنگ آباد میرا پیدائشی وطن ہے اور میری زندگی کا نصف سے زائد حصہ حیدرآباد دکن ہی میں بسر ہوا ہے اس دوہرے قلبی تعلق کی وجہ سے میں اس تمام تشویش اور فکرمندی میں بُعدِ مقام کے باوجود حیدرآباد کے مسلمانوں کے ساتھ برابر کا شریک ہوں جس میں وہ موجودہ سیاسی صورت حال کی وجہ سے اپنے آپ کو مبتلا پا رہے ہیں۔ یہی چیز مجھ کو مجبور کرتی ہے کہ میں بلا طلب اپنا مشورہ ان حضرات کی خدمت میں پیش کروں جو اس وقت مسلمانان حیدرآباد کی رہنمائی کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ میری ان گزارشات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے۔ اور سرسری طور پر انھیں نظر انداز نہ کردیں گے۔ تاہم اگر وہ ایسا کریں تو میں اپنی اخلاقی ذمہ داری سے بری الذمہ ہوجاؤنگا اور میرا ضمیر مطمئن رہے گا کہ اپنے بھائیوں کا جو حق مجھ پہ عائد ہوتا تھا اسے ادا کرنے کی میں نے کوشش کردی۔

ہندوستانی مسلمانوں کا انجام

ہندوستان کے مسلمانوں نے ابھی ابھی اپنا جو انجام دیکھا ہے اور دیکھ رہے ہیں وہ دراصل خمیازہ ہے ان کوتاہیوں کا جو پچھلی صدیوں میں ہمارے حکمراں ہمارے امراء ہمارے مذہبی پیشواؤں کا اک

...شورہ

...مسلمانوں پر عائد ہوتا

...ہیں کرتے اگر وہ اپنی سیاست

...میں صرف کرتے تو آج دہلی اور مغربی یو۔پی اور مشرقی پنجاب

اور ... سی۔پی بہار اور وسط ہند میں ان کے سر پر اس

...

تہذیب اوران کے علوم وفنون نے ... انسان ... [illegible] ... کو جماعت ... سیاسی اقتدار پر انحصار

اسلام کی دعوت پھیلانے سے تغافل اور انفرادی سیرتوں اور اجتماعی طرز عمل میں اسلام کے اخلاقی اصولوں سے انحراف کا یہ نتیجہ ہوا کہ

اُن علاقوں کی عام آبادی غیر مسلم رہی۔ مسلمان ان کے درمیان آٹے میں نمک کے برابر رہے اور دلوں کو مسخر کرنے کے بجائے معاشی اور سیاسی

دباؤ سے گردنیں اپنے سامنے جھکوانے پر اکتفا کرتے رہے۔ پھر جب سیاسی اقتدار ان سے چھنا اور ایک غیر ملکی قوم ان پر مسلط ہوئی تب بھی

انہوں نے اور ان کے رہنماؤں نے ان اسباب کو سمجھنے کی کوشش نہ کی جن کی بنا پر وہ حاکم سے محکوم بنکر رہ گئے تھے۔ بلکہ انہوں نے غیر ملکی

حکمرانوں کے بل پر جینے کی کوشش کی اور اپنے سیاسی مطالبے اور دعوے ہمسایہ اکثریت کے مقابلہ میں اس تیسری طاقت سے جس کے اقتدار کو

بہرحال عارضی ہی ہونا تھا منواتے رہے۔ اس تمام مدت میں زندگی کی جو مہلت مسلمانوں کو ملی تھی اس میں اپنی اخلاقی اصلاح کرنے اور

اپنے بزرگوں کی غلطیوں کی تلافی کرنے کے بجائے مسلمان محض معاشی اور سیاسی فائدوں کے لئے غیر مسلم اکثریت کے ساتھ کشمکش کر کے بظاہر یہ سمجھتے

رہے کہ وہ اپنے جینے کا سامان کر رہے ہیں لیکن دراصل وہ اپنی قبر کھود رہے تھے۔ اور آخر کار آج ہماری قسمت آنکھوں نے دیکھ لیا کہ بہت

سے تو اس قبر میں دفن ہو گئے ہیں! اور بہت سے زندہ در گور ہیں۔

حیدر آباد کے مسلمانوں کے لئے سبق

یہ جو ہندوستان کے مسلمانوں کو پیش آیا ہے میں چاہتا ہوں کہ حیدر آباد کے مسلمان اس سے سبق لیں اور

جو تھوڑی سی مہلت ان کو سنبھلنے کے لئے ملی ہے اس سے فائدہ اٹھائیں۔ حیدر آباد کے مسلمانوں کی پوزیشن

ہندوستان کے مسلمانوں سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہے یہاں بھی صدیوں کی حکومت کے باوجود باشندوں کی عظیم اکثریت غیر مسلم ہے۔

اور مسلمان پندرہ فیصدی سے زیادہ نہیں ہیں۔ یہاں بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سیاسی اور معاشی کشمکش سے وہی قومی منافرت

پیدا ہو چکی ہے .... جو ہندوستان میں پیدا ہو چکی تھی اور اسی انتہائی تلخی کی حد تک پہنچتی جا رہی ہے جو دہلی اور پنجاب

میں پائی جاتی ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ ہے کہ یہاں مسلمان ریاست قائم ہے۔ اور ریاست کے نظم ونسق پر مسلمان چھائے ہوئے ہیں لیکن

یہ فرق جو اب تک حیدر آباد کے مسلمانوں کے بچے رہنے کا موجب بنا ہوا ہے کچھ زیادہ پائدار ... [illegible] ... حیدر آباد کے مسلمان اس کے

بھروسے پر زیادہ مدت تک جی سکتے ہوں۔ انڈین یونین کی ہندو اکثریت ... [illegible] ... حیدر آباد کے چاروں

[illegible] محیط ہے۔ حیدر آباد اس کے [illegible]

غیر مسلم ہے اور وہ مسلمان ریاست کے اقتد[illegible]

کے ہاتھ میں رہے یا وہ کم از کم آدھے اقتدار [illegible]

اپنے ساتھ ملا کر اکثریت حاصل کر سکیں [illegible]

ان تمام امتیازی حقوق [illegible] اس کے [illegible]

[illegible] محض ریاست کی غیر مسلم [illegible] انڈین یونین کی فوجی طاقت سے ہوگی جس کی پشت پر پورے ہندوستان

[illegible] ہی ہوگی۔ مجھے امید نہیں کہ اس لڑائی میں ریاست کی طاقت حیدرآبادی مسلمانوں کا ساتھ دے۔ رئیس کی فطرت

[illegible] ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے مفاد اور اپنے خانوادہ کے مفاد کو دیکھتا ہے اگر وہ محسوس کرے گا کہ مسلمانوں کا ساتھ دینے سے اس کو

بھی نواب جونا گڑھ کا سا انجام دیکھنا پڑے گا تو بعید نہیں کہ وہ انڈین یونین کے ساتھ اپنا معاملہ طے کرلے اور اپنی قوم کو اس کی قسمت پر چھوڑ دے۔

حیدرآباد کی فوج پولیس اور نظم و نسق پر بھی آپ یہ بھروسہ نہیں کر سکتے کہ وہ اس لڑائی میں کچھ بہت زیادہ آپ کے کام آسکیں گے اس لئے

کہ ان میں سے کوئی بھی خالص مسلمان عناصر پر مشتمل نہیں ہے۔ بلکہ سب ہی میں اچھا خاصہ غیر مسلم عنصر موجود ہے۔ لہٰذا اگر خدانخواستہ لڑائی

پیش آگئی تو شاید حیدرآباد کے مسلمانوں کا انجام اس سے بھی زیادہ دردناک ہوگا جو مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کا ہوا ہے۔ حیدرآباد کے

مسلمانوں پر اگر ایک طرف خود گھر کی اکثریت دوسری طرف گرد و نواح کے علاقوں کے مسلح جتھے، اور تیسری طرف انڈین یونین کی فوجیں ٹوٹ پڑیں

اور خود ریاست کے نظم و نسق نے اس کا ساتھ نہ دیا تو ان کے لئے کوئی جائے پناہ نہ ہوگی نہ کہیں سے وہ مدد پا سکیں گے اور نہ وہ کہیں جا سکیں گے

مخلصانہ مشورہ

اسی بنا پر میرا یہ مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ لوگ اس فرق کو جو سر دست آپ کی حالت اور ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت میں پایا جاتا ہے۔ کوئی بہت بڑا پائدار قابل اعتماد فرق نہ سمجھیں اور ان چند مہینوں کی مہلت کو جو خوش قسمتی سے آپ کو مل گئی ہے ضائع کرنے کے بجائے ایسا لائحہ عمل بنانے میں صرف کریں جس سے مسلمانان حیدرآباد کی نہ صرف یہ کہ جان و مال و آبرو بچ جائے بلکہ ان کو ایک بہتر اور زیادہ شاندار مستقبل تک پہنچنے کا راستہ مل جائے۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں اصل چیز جو مسلمانوں کے لئے ذریعہ تحفظ ہی نہیں بلکہ ذریعہ ترقی اور وسیلہ سربلندی ہو سکتی ہے وہ تو یہی ہے کہ وہ اسلام پر قائم ہوں اس کے صحیح نمایندے بنیں، اس کی دعوت اپنے قول اور عمل سے دنیا کے سامنے پیش کریں اور بحیثیت ایک قوم کے آمر بالمعروف اور ناہی عن المنکر بن کر کھڑے ہوں یہی چیز ان کے لئے زندگی اور عزت کی زندگی کی ضامن ہو سکتی ہے۔ لیکن ان خطوط پر اپنی قوم کو تیار کرنے کے لئے بہر حال کچھ وقت درکار ہے اور یہاں حال یہ ہے کہ طوفان سر پر آچکا ہے اس لئے یہ ناگزیر ہے کہ ہم کوئی ایسی تدبیر سوچیں جس سے [illegible] مل سکے اور ہمیں اتنا وقت مل جائے کہ ہم مسلمانوں کی عام اخلاقی اصلاح کر سکیں اور دعوت اسلامی کے کام کو منظم طریقہ سے آگے چلا سکیں۔ میں اس مسئلہ پر بہت غور کرتا رہا ہوں کہ ایسی تدبیر کیا ہو سکتی ہے اور آخر کار جس نتائج پر پہنچا ہوں انکو

بڑا گروہ اور باستثنا چند ہمارے عام اہل ملت اپنے اس فرض کی ادائیگی میں برتتے رہے ہیں۔ جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتا ہے۔ اگر وہ اسلام کی صحیح نمایندگی کرتے اگر وہ اپنے اخلاق اور معاملات اور اپنی سیرتوں میں اسلام کا صحیح نمونہ پیش کرتے اگر وہ اپنی سیاست اور حکمرانی میں عدل و انصاف پر قائم رہتے اور اپنی طاقتوں کو اسلام کی سچائی پھیلانے میں صرف کرتے تو آج دہلی اور مغربی یو۔پی اور مشرقی پنجاب سے مسلمان اس طرح بیک بینی و دوگوش نکال دئے جاتے جیسے اس وقت نکالے گئے ہیں اور یو۔پی بہار اور وسط ہند میں ان کے سر پر اس طرح تباہی منڈلا رہی نہ ہوتی جیسی آج منڈلا رہی ہے۔ یہ وہ علاقے ہیں جہاں سات آٹھ سو سال تک مسلمانوں کا اقتدار رہا ہے جہاں مسلمانوں کی بڑی بڑی عظیم الشان جاگیریں حیدرآباد کی پائیگاہوں سے کہیں زیادہ بڑی جاگیریں قائم رہی ہیں۔ اور جہاں مسلمانوں کی تہذیب اور ان کے علوم و فنون کے عظیم الشان مرکز موجود رہے ہیں۔ لیکن عیش دنیا میں انہماک فوجی طاقت اور سیاسی اقتدار پر انحصار اسلام کی دعوت پھیلانے سے تغافل اور انفرادی سیرتوں اور اجتماعی طرز عمل میں اسلام کے اخلاقی اصولوں سے انحراف کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان علاقوں کی عام آبادی غیر مسلم رہی۔ مسلمان ان کے درمیان آٹے میں نمک کے برابر رہے اور دلوں کو مسخر کرنے کے بجائے معاشی اور سیاسی داؤ سے گردنیں اپنے سامنے جھکوانے پر اکتفا کرتے رہے۔ پھر جب سیاسی اقتدار ان سے چھنا اور ایک غیر ملکی قوم ان پر مسلط ہوئی تب بھی انہوں نے اور ان کے رہنماؤں نے ان اسباب کو سمجھنے کی کوشش نہ کی جن کی بنا پر وہ حاکم سے محکوم بنکر رہ گئے تھے۔ بلکہ انہوں نے غیر ملکی حکمرانوں کے بل پر جینے کی کوشش کی اور اپنے سیاسی مطالبے اور دعوے ہمسایہ اکثریت کے مقابلہ میں اس تیسری طاقت سے جس کے اقتدار کو بہرحال عارضی ہی ہونا تھا منواتے رہے۔ اس تمام مدت میں زندگی کی جو مہلت مسلمانوں کو ملی تھی اس میں اپنی اخلاقی اصلاح کرنے اور اپنے بزرگوں کی غلطیوں کی تلافی کرنے کے بجائے مسلمان محض معاشی اور سیاسی فائدوں کے لئے غیر مسلم اکثریت کے ساتھ کشمکش کر کے بظاہر یہ سمجھتے رہے کہ وہ اپنے جینے کا سامان کر رہے ہیں لیکن دراصل وہ اپنی قبر کھود رہے تھے۔ اور آخر کار آج ہماری قسمت آنکھوں نے دیکھ لیا کہ بہت سے تو اس قبر میں دفن ہو گئے ہیں! اور بہت سے زندہ درگور ہیں۔

حیدرآبادی مسلمانوں کے لئے سبق

یہ جو ہندوستان کے مسلمانوں کو پیش آیا ہے میں چاہتا ہوں کہ حیدرآباد کے مسلمان اس سے سبق لیں اور جو تھوڑی سی مہلت ان کو سنبھلنے کے لئے ملی ہے اس سے فائدہ اٹھائیں۔ حیدرآباد کے مسلمانوں کی پوزیشن ہندوستان کے مسلمانوں سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہے یہاں بھی صدیوں کی حکومت کے باوجود باشندوں کی عظیم اکثریت غیر مسلم ہے۔ اور مسلمان پندرہ فیصدی سے زیادہ نہیں ہیں۔ یہاں بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سیاسی اور معاشی کشمکش سے وہی قومی منافرت پیدا ہو چکی ہے .... جو ہندوستان میں پیدا ہو چکی تھی اور اسی انتہائی تلخی کی حد تک پہنچتی جا رہی ہے جو دہلی اور پنجاب میں پائی جاتی ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ ہے کہ یہاں مسلمان ریاست قائم ہے۔ اور ریاست کے نظم و نسق پر مسلمان چھائے ہوئے ہیں لیکن یہ فرق جو اب تک حیدرآباد کے مسلمانوں کے بچے رہنے کا موجب بنا ہوا ہے کچھ ایسا زیادہ پائدار اور مستحکم فرق نہیں کہ حیدرآباد کے مسلمان اس کے بھروسے پر زیادہ مدت تک جی سکتے ہوں۔ انڈین یونین کی ہندو اکثریت جو سابق انگریزی طاقت کی وارث ہوئی ہے۔ حیدرآباد کے چاروں

طرف محیط ہے۔ حیدرآباد اس کے محاصرہ میں اس طرح گھرا ہوا ہے کہ کسی طرف سے وہ مدد نہیں پا سکتا۔ ریاست کی ۸۵ فیصدی آبادی غیر مسلم ہے اور وہ مسلمان ریاست کے اقتدار کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ موجودہ جمہوریت کے دور میں ۱۵ فیصدی مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ حکمرانی ان کے ہاتھ میں رہے یا وہ کم ازکم آدھے اقتدار کے شریک ہوں کسی طرح نہیں چل سکتا۔ یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ غیر مسلموں کے کسی معتدبہ عنصر کو مسلمان اپنے ساتھ ملا کر اکثریت حاصل کر سکیں یا کم ازکم پچاس فیصدی رائے حاصل کر سکیں گے اس صورت حال میں اگر مسلمان اپنے اقتدار کو اور ان تمام امتیازی حقوق اور اختیارات اور فوائد اور منافع کو برقرار رکھنا چاہیں جو اب تک حاصل رہے ہیں تو اس کے لئے انہیں لڑنا پڑے گا۔ لڑائی محض ریاست کی غیر مسلم اکثریت سے نہیں ہوگی بلکہ آخر کار انڈین یونین کی فوجی طاقت سے ہوگی جس کی پشت پر پورے ہندوستان کی ہندو قوم کی متفقہ طاقت بھی ہوگی۔ مجھے امید نہیں کہ اس لڑائی میں ریاست کی طاقت حیدرآبادی مسلمانوں کا ساتھ دے۔ رئیس کی فطرت یہ ہوتی ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے مفاد اور اپنے خاندان کے مفاد کو دیکھتا ہے اگر وہ محسوس کرے گا کہ مسلمانوں کا ساتھ دینے سے اس کو بھی نواب جوناگڑھ کا سا انجام دیکھنا پڑے گا تو بعید نہیں کہ وہ انڈین یونین کے ساتھ اپنا معاملہ طے کرے اور اپنی قوم کو اس کی قسمت پر چھوڑ دے حیدرآباد کی فوج پولیس اور نظم و نسق پر بھی آپ یہ بھروسہ نہیں کر سکتے کہ وہ اس لڑائی میں کچھ بہت زیادہ آپ کے کام آسکیں گے اس لئے کہ ان میں سے کوئی بھی خالص مسلمان عناصر پر مشتمل نہیں ہے۔ بلکہ سب ہی میں اچھا خاصہ غیر مسلم عنصر موجود ہے۔ لہٰذا اگر خدانخواستہ لڑائی پیش آگئی تو شاید حیدرآباد کے مسلمانوں کا انجام اس سے بھی زیادہ دردناک ہوگا جو مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کا ہوا ہے۔ حیدرآباد کے مسلمانوں پر اگر ایک طرف خود گھر کی اکثریت دوسری طرف گرد و نواح کے علاقوں کے مسلح جتھے اور تیسری طرف انڈین یونین کی فوجیں ٹوٹ پڑیں اور خود ریاست کے نظم و نسق نے اس کا ساتھ نہ دیا تو ان کے لئے کوئی جائے پناہ نہ ہوگی نہ کہیں سے وہ مدد پا سکیں گے اور نہ وہ کہیں جا سکیں گے

مخلصانہ مشورہ

اسی بنا پر میرا یہ مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ لوگ اس فرق کو جو سردست آپ کی حالت اور ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت میں پایا جاتا ہے۔ کوئی بہت بڑا پائدار قابل اعتماد فرق نہ سمجھیں اور ان چند مہینوں کی مہلت کو جو خوش قسمتی سے آپ کو مل گئی ہے ضائع کرنے کے بجائے ایسا لائحہ عمل بنانے میں صرف کریں جس سے مسلمانان حیدرآباد کی نہ صرف یہ کہ جان و مال و آبرو بچ جائے بلکہ ان کو ایک بہتر اور زیادہ شاندار مستقبل تک پہنچنے کا راستہ مل جائے۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں اصل چیز جو مسلمانوں کے لئے ذریعہ تحفظ ہی نہیں بلکہ ذریعہ ترقی اور وسیلہ سربلندی ہو سکتی ہے وہ تو یہی ہے کہ وہ اسلام پر قائم ہوں اس کے صحیح نمایندے بنیں، اس کی دعوت اپنے قول اور عمل سے دنیا کے سامنے پیش کریں اور بحیثیت ایک قوم کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کر کھڑے ہوں یہی چیز ان کے لئے زندگی اور عزت کی زندگی کی ضامن ہو سکتی ہے۔ لیکن ان خطوط پر اپنی قوم کو تیار کرنے کے لئے بہرحال کچھ وقت درکار ہے اور یہاں حال یہ ہے کہ طوفان سر پر آچکا ہے اس لئے یہ ناگزیر ہے کہ ہم کوئی ایسی تدبیر سوچیں جس سے یہ طوفان ٹل سکے اور ہمیں اتنا وقت مل جائے کہ ہم مسلمانوں کی عام اخلاقی اصلاح کر سکیں اور دعوت اسلامی کے کام کو منظم طریقہ سے آگے چلا سکیں۔ میں اس مسئلہ پر بہت غور کرتا رہا ہوں کہ ایسی تدبیر کیا ہو سکتی ہے اور آخر کار جن نتائج پر پہنچا ہوں انکو

ذیل میں نمبروار بیان کرتا ہوں ۔

۱۔ ہندوستان اور حیدرآباد کی سیاسی صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے یہ کسی طرح ممکن نظر نہیں آتا کہ اب انڈین یونین میں حیدرآباد کے داخلہ اور حیدرآباد میں ذمہ دار حکومت کے قیام کو روک سکیں گے یہ چیز بہرحال ہو کر رہے گی ۔ آگے ہو کے نہ رک سکے گی ۔ اور روکنے کی کوشش کا حاصل اس کے سوائے کچھ نہ ہوگا کہ ریاست اور مسلمان دونوں تباہ ہو جائیں یا صرف مسلمان تباہ ہوں اور ریاست مسلمانوں کی بھینٹ چڑھ کر اپنے آپ کو بچا لے ۔ اس صورتِ حال میں عقلمندی یہ ہے کہ مزاحمت کرنے کے بجائے آپ ایسی بنیادوں پر مفاہمت کرنے کی کوشش کریں جن سے انڈین یونین کی شرکت اور ذمہ دار حکومت کا قیام نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے لئے کم سے کم مضر ہو سکے بلکہ اس کے برعکس مسلمانوں کو ایسے مواقع حاصل ہو جائیں جن سے مذکورہ بالا مقصد کے لئے اپنی ملی تعمیر زیادہ اچھی طرح کر سکیں ۔

مزاحمت اور کشمکش کرنے کے بجائے اگر اس وقت حیدرآبادی مسلمانوں کی قومی تنظیم یعنی انجمن اتحاد المسلمین یہ بات پیش کرے کہ وہ چند شرائط کے ساتھ انڈین یونین کے داخلہ اور مکمل ذمہ دار حکومت کے قیام پر بخوشی راضی ہے تو مجھے امید ہے کہ اس مرحلہ پر آکر کانگریس اور انڈین یونین . . . . دونوں ہماری شرائط ماننے پر راضی ہو سکیں گی :

چند مفید شرائط

۲۔ میرے نزدیک جو شرائط اس غرض کے لئے مفید ہو سکتی ہیں اور جن پر انڈین یونین اور اسٹیٹ کانگریس کو بآسانی راضی کیا جا سکتا ہے وہ حسبِ ذیل ہیں ۔

(الف) ریاست کے آئندہ دستور میں مسلمانوں کو یہ حق دیا جائے کہ ان کے تہذیبی اور مذہبی معاملات کے لئے ان کا اپنا الگ ایک ملی organization ہو جسے مسلمانوں پر زکوٰۃ عاید کرنے اور اس کو وصول اور خرچ کرنے کے لئے اور مذہبی اوقاف کا انتظام کرنے اور ان کی آمدنی کو مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے کاموں پر صرف کرنے کے لئے نیز مسلمانوں کا پرسنل لا۔ ان کے معاملات نکاح طلاق و وراثت وغیرہ پر جاری کرانے کے لئے ضروری قانونی اور عدالتی اختیارات حاصل ہوں ۔ (ایسے ہی اختیارات اگر دوسرے غیر مسلم گروہ بھی حاصل کرنا چاہیں تو مسلمانوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں)

(ب) مسلمانوں کے اس حق کو بھی دستور میں محفوظ کر دیا جائے کہ وہ اپنے خرچ پر ایک مذہبی درس گاہ قائم کر سکیں اور اسی طرح سرکاری تعلیم گاہوں میں مسلمان بچوں کے لئے اپنے خرچ پر لازمی مذہبی تعلیم کا انتظام کر سکیں (یعنی مسلمان بچوں کے لئے سرکاری درسگاہوں میں مذہبی تعلیم Compulsory ہوگی ۔ اور اس کا خرچ مسلمانوں کا مذکورہ بالا organization برداشت کرے گا)

(ج) ریاست کیلئے جو اسمبلی یا پارلیمنٹ بنے اس میں طریق انتخاب ضرور ہو لیکن لازماً کوئی ایسا طریق انتخاب اختیار کیا جائے جس سے آبادی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا گروہ بھی نمائندگی سے محروم نہ رہ سکے مثلاً proportional Representation متناسب نمائندگی کا وہ طریقہ جس میں ہر ملک

کے نشستی حلقہ ہائے انتخاب میں تقسیم نہیں کیا جاتا بلکہ پورا ملک ایک حلقۂ انتخاب ہوتا ہے اور رائیں منفرد نمائندوں کے حق میں نہیں بلکہ پارٹیوں کے حق میں ڈالی جاتی ہیں۔

(د) دستور کی ترمیم پر ایسی پابندی عائد کی جائے جس کی وجہ سے مسلمانوں کے وہ حقوق جو انہیں پہلے دستور میں دئے گئے ہوں بعد کسی ترمیم میں بآسانی سلب کئے جا سکیں۔ مثلاً دستور کی ترمیم کے لئے استصواب رائے عام (Referendum) ضروری قرار دیا جائے اور کم از کم ۸۰ فیصدی یا ۸۵ فیصدی ووٹوں کے بغیر کوئی ترمیم پاس نہ ہو سکے۔

(ھ) اس بات کی ضمانت دی جائے کہ سرکاری محکموں میں اور ان کے کسی شعبے میں بھی مسلمانوں کا تناسب ان کی آبادی کے تناسب سے بہرحال گھٹنے نہ پائے گا اور کسی شعبے میں ان کے خلاف کوئی امتیازی پابندی عائد نہ کی جائے گی۔

(و) از روئے دستور تبدیل مذہب پر کوئی پابندی عاید نہ ہو سکے گی ان شرائط کے ساتھ مسلمانوں کو یہ تسلیم کر لینا چاہیئے کہ ریاست میں مکمل ذمہ دارانہ حکومت قائم ہو اور نظام صرف ایک دستوری فرمانروا کی حیثیت سے رہیں۔ نظام کے لئے دستوری فرمانروا سے بڑھ کر کسی پوزیشن کا مطالبہ کرنے پر مسلمانوں کو اصرار نہ کرنا چاہیئے ورنہ وہ سمجھ لیں کہ یہ چیز ایک خاندان کے مفاد پر ایک پوری قوم کے مفاد کو قربان کرنے کے ہم معنی ہوگی جس کا خمیازہ آگے چل کر مسلمانوں کو بہت برا دیکھنا ہوگا۔

اسلامی اصولوں پر شیرازہ بندی

۴۔ مذکورۂ بالا شرائط کے مطابق مسلمانوں کو اپنا جو قومی (Organisation) قائم کرنے کا حق حاصل ہو اس سے انہیں پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ زکوٰۃ اور اوقاف کی آمدنی اتنی کافی ہوگی کہ اس سے ایک عظیم الشان بیت المال قائم ہو سکے گا۔ مسلمانوں کی تعلیم اخلاقی اصلاح معاشی خوشحالی اور صنعتی ترقی کے لئے بہت سے کام کئے جا سکیں گے۔ ان کو سودی قرض سے نجات دلائی جا سکے گی اور ایسے ادارے قائم کئے جا سکیں گے جو دعوت دین کے لئے مسلمان نوجوانوں کو تیار کریں۔ ملکی زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم اور تفاسیر شائع کریں اور اسلامی لٹریچر کی وسیع پیمانہ پر اشاعت کریں۔ ان ذرائع سے یہ ممکن ہوگا کہ ہم اپنی سوسائٹی کو زیادہ سے زیادہ صالح بنا کر غیر مسلم عناصر کو اپنے اندر جذب کر سکیں۔

۵۔ ان تحفظات کے ساتھ جو ذمہ دار حکومت قائم ہو اس میں مسلمان اپنا اثر اس طرح بڑھا سکتے ہیں کہ ان کی سیاسی پارٹی یعنی انجمن اتحاد المسلمین کوئی ایسا پروگرام پیش کرے جسے لے کر وہ صرف مسلمانوں ہی کے سامنے نہ جائے بلکہ غیر مسلم ووٹروں کے سامنے بھی جا سکے اور ان کی زیادہ سے زیادہ رائیں حاصل کر سکے۔ مثال کے طور پر اس کے پروگرام میں Depressed classes کے لئے کوئی ایسی کشش ہونی چاہیئے کہ ان کے ووٹ مسلم پارٹی کو حاصل ہوں۔ آج اگر آپ سیاسی جوڑ توڑ کر کے پست اقوام کو ہندوؤں سے توڑنے کی کوشش کریں گے تو آپ کچھ فائدہ نہ حاصل کر سکیں گے اور یہ چیز ہندوؤں میں آپ کے خلاف اور زیادہ ضد پیدا کر دے گی۔ لیکن کل نئے دستور کے مطابق اگر انتخابات میں آپ ایسا پروگرام لائے جو پست اقوام کی اکثریت کو آپ کے ساتھ ہم آواز بنا دے تو آپ اسمبلی میں اکثریت حاصل کر سکیں گے اور

یوم آخر

اصغر علی عابدی

میں حسین خیال کے گہوارے میں
شب تاریک کے پردوں میں چھپا بیٹھا تھا
مجھ کو چھیڑا کسی دزدیدہ نگاہ والے نے
مجھ کو چونکا دیا تاروں کے نفس پاروں نے
چاند کی کرنوں میں ڈھلتے ہوئے شہ کار رخ
اور بھیگی ہوئی شبنم سے ترنم زا ہوا
اپنی باہوں کو مرے گرد حمائل کر کے
اپنے ہونٹوں سے میرے ہونٹوں کو سہلاتے ہوئے
اپنی ہر سانس سے میری نفس جان کو گرماتے ہوئے
میرے کندھوں کو دبا کر
میرے بازو کو ہلا کر
میرے ہر بال کو پیشانی پہ پھیلاتے ہوئے
چھیڑا اس رات کو کچھ ایسی کہ اس نے اے دوست
جھرجھری لے کے میں خوابوں سے پرے بھاگ آیا!
اور خیالوں کے چمن زاروں سے میں لوٹ آیا!
میں نے افکار کے جالوں کو جھنجھوڑا، توڑا
میں نے تخئیل کے تاروں کو جھنجھوڑا، کاٹا
میں نے انساں کی حقیقت سے جھپکتی آنکھیں
رات کی شبنم آلودہ ترنم زا، ہواؤں کے مقابل رکھ کر
چاند کی کرنوں کے سانچوں کے مقابل رکھ کر
تاروں کے ننھے اشاروں سے، شرراروں سے،
ایک ایک بات میں ناپی تولیں
ایک ایک بات میں پرکھی سمجھیں
اور پھر مجھ کو یوں محسوس ہوا
خود پرستی کے یہ رنگین ہوائی قلعے
کبھی انسان کو پتھر پہ پٹخ ہی دیں گے
کبھی انساں کو تہہ آب سلا ہی دیں گے
کبھی دنیا کے بھڑکتے ہوئے انگاروں کو
اسلحہ خانوں کو بارود کے انباروں کو
پیٹ کے نام پہ لڑتے ہوئے شیطانوں کو
حق کے نام سے جلتے ہوئے حیوانوں کو
بھک کے ساتھ اُڑا ہی دیں گے
قوت قوت کو ختم کر دے گی
زندگی موت کا روپ بھرے گی
اور وحشت زا بگولوں کے ترنم کی صدا
نغمۂ بلبل شیریں کی جگہ صور کی آوازوں کے بگل
چمن دہر میں ہر سمت کو چھا جائیں گے!
اور پہاڑوں کے یہ بھاری پتھر
روئی کے گالوں کی مانند پھریں گے اُڑتے
نیلے آسماں کی چادر بھی تو پھٹ جائے گی
اور یہ فرش زمیں کا بھی ادھڑ جائے گا
قبریں پکی ہوئی ہنڈی کی طرح تڑخیں گی
لاشیں انسانوں کی بے گور و کفن نکلیں گی
ہاتھ میں نامۂ اعمال لئے
شرم سے سر کو جھکائے
ظلم و عصیاں کا کندھوں پہ اک وبال لئے
وائے! حسرت سے پشیماں، پریشاں انساں،
اونچے ہاتھوں سے، التجاؤں کی آوازوں سے
ذل قدرت کو خدا کو وہ پکارے گا عبث،
ہاتھ خاموشی سے گر جائیں گے
نعرے حلقوم میں کٹ جائیں گے
یوم آخر کی گذارش نہ سنی جائے گی!

از:۔ سید اصغر علی عابدی

افسانہ تحریک اسلامی کے ادب میں

(۲)

محمود فاروقی انہوں نے کئی افسانے لکھے ہیں۔ لیکن میں ان کو زیادہ افسانہ لکھنے کی وجہ سے نہیں بلکہ چند ایک اچھے افسانے لکھنے کی وجہ سے اچھا افسانہ نویس سمجھتا ہوں۔ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ جو شخص زیادہ افسانے لکھے وہی "افسانہ نویس" کہلانے کا مستحق ہے۔ لیکن یہ خیال غلط ہے ایسے لوگوں کے نزدیک کیفیت سے کمیت کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ حالانکہ اکثر سونا تھوڑا ہوتا ہے اور دوسری دھاتیں زیادہ ہیرے جواہر کم ہوتے ہیں اور کنکر پتھر بکثرت۔ لیکن اتنا تسلیم کرنے سے تو میں بھی انکار نہیں کر سکتا کہ کسی شخص کو "افسانہ نویس" کہلانے کے لئے اتنے افسانے تو ضرور لکھنے چاہئیں کہ عام لکھنے والوں سے اس کی جداگانہ حیثیت متعارف ہو جائے لوگ کم سے کم اسے افسانہ نویس کی حیثیت سے جان تو لیں۔ چنانچہ محمود فاروقی نے اتنے افسانے کیا اس سے کچھ زیادہ ہی لکھے ہیں اور لوگ جانتے ہیں کہ وہ افسانہ نویس ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں ابھی ابھی کہہ چکا ہوں میرے نزدیک وہ چند مخصوص افسانوں کی وجہ سے زیادہ قیمتی ہیں۔ ان افسانوں میں "جوانی کا پہلا اور آخری دن" سرفہرست ہے۔ ایک جچا تلا پلاٹ ہے۔ اچھا منظر ہے اچھا مکالمہ ہے۔ اچھی تشبیہیں اور استعارے ہیں۔ بہت اچھی "یادیں" اور بہت عمدہ احساسات او طنز ہیں۔ اور ایک نتیجہ ہے۔ اچھا نتیجہ۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی کرنوں کا الوداعی جلوس اور ان کرنوں سے بننے والے گوندنی کے پیڑ کے ڈھلتے ہوئے طویل سائے اور ان سایوں کے ساتھ ساتھ غیر اسلامی مقصد حیات کے تحت بسر ہو جانے والی ناکام زندگی کا شعور بس۔ ایک عجیب مقصدی ربط ہے۔ ان سب چیزوں میں اور بڑا اثر پڑتا ہے۔ پڑھنے والے پر ان سب کا اسی طرح "لائبریری" کا بڈھا اپنے عجیب وغریب لباس کے ساتھ جو تنقیدی نظر لائبریری میں موٹی موٹی کتابوں کی ورق گردانی کرنے والوں پر ڈالتا ہے وہ بھی مجھے بے حد پسند ہے۔ اور جب وہ بڈھا لائبریری سے باہر آ کر مظاہر قدرت کی طرف اشارہ کرکے بتاتا ہے کہ یہ دیکھو اس کتابوں کی لائبریری کے باہر یہ کتنی بڑی اور اچھی لائبریری ہے جسے تم نے فراموش کر دیا ہے تو اس احساس کی طرح جو قرآن کریم کے ان ارشادات کے وقت پیدا ہوتا ہے جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں پر . . . . . غور و خوض کی دعوت دی گئی ہے۔ بڑی تیزی سے ایک نیا جذبہ سینے کے اندر موجزن ہو جاتا ہے بس یہی تو افسانے کا مقصد ہے اور یہی تو افسانہ نویس کا کمال ہے۔ "ذہنی مجرم" بھی اسی [illegible] لکھنے والے کا شاہکار ہے اس میں پلاٹ کی ترتیب اور کرداروں کے نفسیاتی تجزیہ کے اعتبار سے خامیاں ہو سکتی ہیں لیکن یہ اپنی نوعیت کی خاص چیز ہے اس میں اس احساس کا جائزہ لیا گیا ہے جو انسانی ارادے و شعور سے ماوری اس کے تحت الشعور میں ایک کار فرما قوت کی حیثیت سے کام کرتا رہتا ہے۔ اسلام اس احساس کو بھی مومن بنانا چاہتا ہے۔ اور جب تک یہ احساس بھی مومن نہ ہو جائے اس وقت تک اساس دین کی صحیح تعمیر نہیں ہو سکتی۔ ایمان باللہ کا تعلق

صرف انسان کے ارادے اور شعور ہی سے نہیں بلکہ اس جذبہ کو تحت الشعور میں بھی جڑ پکڑ لینا چاہئیے۔ اور قرآن مجید میں متقین کے بعد محسنین کے حسن
بلند درجہ کا ذکر آیا ہے وہ اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ خدا کی اطاعت اس کے اندر عشق اور محبت کا نتیجہ ہو اور انسان اپنے نہاں خانہ
دل میں بھی کسی غلط تخیل کو در آنے کا موقع نہ دے۔ مرضی الٰہی کی پابندی محض مارے باندھے کا نتیجہ نہ ہو بلکہ وارفتگی اور شیفتگی کا یہ عالم ہو کہ ہر وقت دل
کوچۂ جاناں کی سیر کے لئے بے تاب ہو۔ الغرض ظاہر کی طرح باطن بھی بندۂ بے دام اور غلام نیک نام ہو ——— اس افسانے میں فاروقی نے اسی
امر کو پیش کیا ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ ایک بظاہر نیک آدمی کا ذہن کھوپڑی کی اندرونی دنیا میں کیسے کیسے جرائم کرتا ہے اور کس طرح یہ خواہش پیدا
پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ جرم سر کی ہڈی کو توڑ کر باہر کی دنیا میں چھلانگ لگا دے اس غرض کے لئے انہوں نے ایک عجیب و غریب "سراغ رسانی" طرز کا
پلاٹ بنایا ہے اور ان کا قلم کچھ عجیب طریقے پر ان کے "ذہن" کو لکھتا ہے ——— بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے جیسے مقصد کو پلاٹ سے کوئی خاص ربط
نہیں ہے۔ لیکن جب آدمی افسانہ ختم کر چکتا ہے تو وہ ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے سوچتا ہے کہ جس مقصد کے لئے یہ افسانہ لکھا گیا ہے اس کے
لئے شاید ہی اس سے بہتر کوئی پلاٹ ہو سکے۔

اس تمام تذکرے کے ساتھ ساتھ میں محمود فاروقی سے یہ شکایت بھی کروں گا کہ آخر اب انہوں نے "جوانی کا پہلا اور آخری دن" جیسے افسانے
لکھنا کیوں ترک کر دئے۔ بہتر یہ ہے کہ وہ رومانیت (Romanticism) کی جنت خیالی (Utopia)
سے اتر کر ذرا وقت کی ٹھوس سرزمین پر قدم رکھیں اور حقائق کو حقائق سے ٹکرا کر ایک انقلاب انگیز اور صحیح قسم کا "حقیقت پسندانہ (Realistic)
ادب" تیار کریں جس میں تحریک اسلامی کے افکار کو جدید اسلوب میں پیش کیا گیا ہو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ یہ کام بخوبی کر سکیں گے اور انہوں سے ایک توقع
بھی یہ ہے۔

سعد گیلانی

"اس نے سوچا ——— جب" پھر وہ مختلف خیالات میں گم ہو گیا۔ جیسے اس کی زندگی کی ڈور پتنگ کی ڈور کی طرح الجھ گئی
ہو یا وہ کسی بھیانک غار کی تہہ میں تیزی سے اترتا جا رہا ہو۔ لیکن پھر اس نے سوچا ——— "جب" ——— اور وہ اسی طرح
سوچ سوچ کر ایک خوشگوار نتیجے پر پہنچ گیا۔ ایک عجیب اور دلکش ذہنی عمل ہے جس کا نقشہ اسعد گیلانی نے اپنے افسانے "اس نے سوچا" میں کھینچا
ہے۔ اسعد گیلانی صحافی اور تنقید نگار زیادہ ہیں۔ اور افسانہ نویس کم لیکن جتنے افسانے انہوں نے لکھے ہیں بڑی بے باکی سے لکھے ہیں۔ وہ اپنے
مقاصد کو آرٹ اور فن کا بندۂ بے دام بنا کر اس کے آگے سجدہ نہیں کراتے۔ ان کے خیالات وہاں قلم پا کر گرم تیغے ہیں اور کسی گوریلا اور
دلیر جوان کی طرح ہر کلام پر حریف کے مورچوں کی سمت تیر برساتے ہیں۔ اسعد گیلانی "آرٹ" کے نام سے مطلق نہیں گھبراتے بلکہ وہ آرٹ
بہت بے تکلفی سے اپنے قابو میں کر لیتے ہیں جیسے کسی ہوشیار آدمی نے دو منٹ میں کسی اجنبی سے دوستی گانٹھ لی ہو لیکن تعجب تو اس پر ہے کہ
اگرچہ وہ بہت اچھے آرٹسٹ ہیں۔ "اس نے سوچا" ان کے اس آرٹ کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ لیکن جہاں تک میں نے سوچا ہے اسعد
گیلانی کا قلم کسی حقیقی واقعہ پر زیادہ پرکاری سے چلتا ہے بہ نسبت کسی تصوری خاکے کے یعنی حقیقت کو افسانہ بنانا تو خوب آتا ہے
وہ تصور کو واقعہ بنانے میں اپنی اس پہلی خصوصیت سے ذرا پیچھے ہیں۔ یہ بات کسی کمزوری یا خامی کی دلیل نہیں ہے لکھنے میں ایک بہت

بڑی خوبی ہے جو اکثر کے پاس موجود نہیں ہے اور اس کے لئے وہ اس طرح ترستے رہتے ہیں جیسے کوئی بالک ریوڑیوں کے لئے بلکتا ہو۔ ہمارے ملک میں کتنے افسانہ نویس ایسے ہیں جو واقعہ کو اس کے تمام پہلوؤں سمیت اپنی زبان قلم سے نہیں دہرا سکتے۔ لیکن یہ لوگ اپنے ذہن کے تصوری خاکوں (Imagination کے Realm) کو بڑی عمدگی سے کاغذ کے سفید چہرے پر ...... منتقل کر دیتے ہیں گویا دی النظری میں یہ چیز بہت بڑی خوبی کی نظر آتی ہے۔ لیکن اس میں کمزوری کا بھی ایک خوف ناک پہلو پوشیدہ ہے اور وہ ہے انسان کی جذباتیت۔ تخیل پسندی اور واقعات سے گریز جو بسا اوقات نہ صرف قلمی اور ذہنی گمراہی کا باعث ہوتی ہے بلکہ ناظر کے ذہن پر بھی انتہائی خوشگوار اثر ڈالتی ہے اور اسے عقلمندوں کی "دوزخ" سے نکال کر احمقوں کی جنت (Fools paradise) کا راجہ بنا دیتی ہے۔

اسعد گیلانی قابل مبارکباد ہیں کہ ان کا قلم ایک نظر فریب خوبی میں غوطہ لگانے سے بچکر گمراہی کے ایک راستہ سے بھی ہٹ گیا ہے۔

ابوالعرفان مرحوم

وہ اکثر تازہ کھلے ہوئے پھول کی طرح مسکرایا کرتا تھا۔ اس کی یاد اب بھی میرے دل میں شب کے خوشگوار خواب کی طرح باقی ہے۔ اور تازہ کلیوں کی بھینی بھینی خوشبو کی طرح اس کے کلمات میرے ذہن سے ٹکراتے ہیں۔ میں جب بھی اس کے بارے میں سوچتا ہوں ایک متدین شوخی اور ایک باوقار مذاق کے پیکر میں وہ میرے سامنے آموجود ہوتا ہے۔ اس کے بال گھنگریالے تھے اور اس کے قلم میں بھی نزاکت کے اتنے ہی لوچ تھے۔ اس کی ڈاڑھی گھنی اور سیاہ تھی اور وہ روشنائی بھی بلیو بلیاک ہی استعمال کرتا تھا ——— لیکن ان دونوں کے درمیان اس کا چہرہ بدلی سے نکلنے والے چاند کی طرح چمکتا تھا۔ نورانی خیالات والا نورانی چہرہ۔ اس کے افکار کتنے پرانوار تھے۔ اور پھر اس کے ساتھ ساتھ اس کے قلم میں کتنی جدتیں تھیں۔ کتنی شوخیاں اور کتنی پرسرادتیں کتنی جلن اور کتنا سوز۔ کتنی بے چینی اور کتنا کرب کتنا غصّہ اور کتنی جھنجھلاہٹ ——— ہاں وہ باغی تھا۔ خدا ناشناس افکار کا باغی ۔ طاغوت کا دشمن باطل کا شدید مخالف اس نے جب لکھنا شروع کیا تو اس کا قلم اس زور سے چلتا تھا کہ کاغذ کے سینے پر شگاف پڑ جاتے اور الفاظ کا جگر چھلنی ہو جاتا اور اس کی سریر قلم سے فضا پرشور ہو جاتی ——— وہ بہت جلد ہمارے درمیان سے اٹھا لیا گیا۔ وہ اس بزم میں زیادہ عرصے نہ رہ سکا لیکن جتنی دیر بھی وہ ہم میں رہا اتنی مدت میں وہ ایک کارہائے نمایاں انجام دے گیا۔ ادارہ کوثر کا رکن بننے کے بعد اس نے جو افسانے لکھے۔ وہ ہمارے لئے ایک نیا معیار ادب فراہم کر گئے۔ ان افسانوں میں پلاٹ کی جدت بھی تھی تخیل کی وسعت بھی اور سوسائٹی کی موزوں اور رتنا سب تصویر بھی واقعات پر چبھتے ہوئے طنز اور حقائق کا دلپذیر تجزیہ تو اس کے قلم کی جلو میں چلا کرتے تھے پھر شاید ہی ابوالعرفان سے زیادہ کھلے طور پر کسی نے مقصد کی طرف دعوت دی ہو وہ ایک بالکل بے باک سپاہی تھا۔ اس نے مقصد کو اشارتی اور کنایتی انداز بیان کا پیرایہ کبھی نہیں پہنایا۔ لیکن جس طرح اس نے مقصد کو پیش کیا وہ اس کا خاص حق تھا اور میں سمجھتا ہوں وہ یہ حق ادا کر گیا۔ دوسرے آدمی کو مقصد تک پہنچنے کے لئے سو ڈھنگ اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ دس راستوں سے ادیب کا قلم پڑھنے والے کے ذہن کو دھوکہ دے کر آگے بڑھتا ہے۔ لیکن ابوالعرفان چند قدموں ہی میں منزل تک پہنچ جاتا تھا۔ اور بعض دفعہ تو پہلی ہی رفتار میں اس نے منزل کو جا لیا ہے ——— لیکن جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے صرف یہ اسی کا حق تھا دوسرا تو منزل سے اتنی جلدی قریب ہو سکتا ہے۔ اور نہ اس جلدی اور تندی کے ساتھ ساتھ آرٹ کی نزاکت کو برقرار رکھ سکتا ہے۔

اس کے افسانوں کی تعداد انگلیوں پر گنے جانے سے بھی زیادہ ہے۔ "سلسبیل" میں "پردوں کے پیچھے" اور "بارود کے پیالے" ابھی کچھ مدت پیشتر شائع ہو چکے ہیں ـــــ میرا خیال ہے اور بہت ممکن ہے کہ میرے علاوہ دوسرے رفیقوں کا بھی یہی خیال ہو کہ وہ کچھ دنوں اور ہم میں رہتا تو شاید وہ ہم سب سے آگے ہوتا اور ہم اس کے پیچھے چلتے ـــــ

لیکن اللہ تعالیٰ نے جس وقت اسے ہمارے درمیان سے اٹھا لیا ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ وہی اس کے جانے کا سب سے موزوں وقت تھا۔ اور جہاں تک پیچھے چلنے کا معاملہ ہے تو کون یہ کہہ سکتا ہے کہ زندگی کے اس تیز دھارے میں آج وہ ابوالعرفان کے پیچھے پیچھے اسی منزل کی طرف نہیں چلا جا رہا ہے جہاں پہلے سے پہنچ کر وہ اپنے مسکراتے ہوئے چہرے سے ہمارا انتظار کر رہا ہے ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے ؂ آج وہ کل ہماری باری ہے۔

میرے افسانے | مجھے اپنے افسانوں کا تعارف کچھ اپنی بڑائی کی خاطر نہیں کرانا ہے۔ بلکہ یہ صرف اظہار واقعہ کے طور پر لکھ رہا ہوں اس لئے اس میں "کو" "میں پن" اور "ناچیز" دونوں سے دور ہی رکھئے تو اچھا ہے ہم جس سوسائٹی سے وابستہ ہیں اس کے پاس اخلاق و عادات اور بول چال کا معیار موجودہ جاہلی سوسائٹی اور اس کی غیر فطری قدروں سے بہت مختلف ہے۔ ہم نہ تو بے جا تکلف اور تصنع کے احساس کمتری کے قائل ہیں اور نہ اس شیطانی تخیل کے جسے شاعروں کی زبان میں "تعلّی" کہا جاتا ہے ہمارے سامنے ایک سیدھا اور درمیانی راستہ ہے۔ ایک صراطِ مستقیم اور ایک سواء السبیل ہے جو بہکنے والے قدم کو افراط اور تفریط کے گڑھوں میں گرنے سے روک دیتی ہے۔

ہاں تو میں نے بھی افسانے لکھے ہیں! اور یہ افسانے میں نے "ذہنی زلزلے" کے بعد ہی سے لکھنے شروع کر دئیے تھے! اور خدا کے فضل سے اب تک لکھ رہا ہوں۔ ابتدا میں میں نے نئے انقلابی مقصد کی خاطر "ذہنی زلزلے" سے ایک خاص طرز تو اخذ کیا تھا لیکن ساتھ ہی مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ "ذہنی زلزلے" کی تکنیک، افسانوں کی عام روش سے بہت کچھ ہٹی ہوئی ہے اور یہ دور ابھی زیادہ قابل برداشت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے مجھے عام افسانوں سے زیادہ قریب ہو کر لکھنا چاہیئے پھر چونکہ افسانوں کے ذریعہ ہمیں ایک ایسے طبقے کے ذہن تک پہنچنا ہوتا ہے جو سنجیدہ علمی اور تنقیدی مضامین نہیں پڑھ سکتا بلکہ صرف افسانوں ہی میں غرق رہتا ہے ہر موسم میں اور ہر وقت افسانوں ہی کے شال دوشالے اوڑھتا اور اسی کی دو پلی اور ململ کا باریک کرتا پہنتا ہے اسی طرح میری ایک رائے یہ بھی تھی کہ افسانوں کے ذریعہ ہم اسلامی ادب کے ایک نئے شعبے کا آغاز کر رہے ہیں اور یہ "آغازی اقدام" قطعاً "قصص الانبیاء" سے مختلف ہونا چاہیئے۔ اس میں مقصدیت وعظ اور پند کی شکل میں نہ آنی چاہیئے۔ بلکہ اس کو اسی طرح افسانے میں سمویا ہوا ہونا چاہیئے جس طرح عارض و کاکل سے کھیلنے والے جاہلی ادیب اپنے افسانوں میں عشق و محبت کی چاشنی کو گھلا ملا ہوا رکھتے ہیں۔ پھر پلاٹ کی تشکیل کے بارے میں بھی مجھے اس بات سے سخت اختلاف تھا کہ ریگزار عرب کے کسی ادیب نشین کا تذکرہ افسانوں میں کیا جائے، یا صحابۂ کرام اور تابعین اور تبع تابعین کو ہم اپنے قصوں کا ہیرو بنا کر ان کو اس مقام بلند سے نیچے اتار لائیں جو اسوہ اور سیرت کے متبرک نام سے ہمارے اعمال

دینی پر مبنیاد نہیں۔۔۔ تو قریب قریب بنیادی حیثیت سے اثر انداز ہے ـــــ چنانچہ ان اغراض و مقاصد کو سامنے رکھ کر ہی میں نے کاغذ و قلم کا یہ کھیل کھیلا! اور اپنے نقوش ذہنی کی عکاسی شروع کردی "خطرناک راہیں" اس مشق فن کی پہلی مکمل تصویر تھی۔ جب میرے افسانوں کا یہ مجموعہ ۱۹۴۶ء میں لاہور سے شائع ہوا تو ملک نصر اللہ خان عزیز فاضل مدیر "کوثر" لاہور نے کوثر میں تبصرہ کرتے ہوئے اظہار خیال فرمایا کہ یہ افسانے بظاہر ترقی پسند اسلوب پر لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کا نشانہ ٹھیک "شعوری ادب" پر بیٹھتا ہے ـــــ یہ "شعوری ادب" دراصل اسلامی ادب کا وہی مخصوص تصور ہے جس کا اظہار میں نے اس کتاب کے دیباچہ میں کیا ہے۔

حالات کی تبدیلی اور "نیا ادب"

لیکن "خطرناک راہیں" کے بعد یکایک وہ اس ملک کے انسان ایسی تبدیلیوں اور بربادیوں سے دوچار ہوئے کہ یکایک تمام تحریکات کا رخ پلٹ گیا پھر جہاں زمانے نے انقلاب و تغیر کا یہ منظر دیکھا وہیں تحریک اسلامی نے بھی دوسری منزل میں قدم رکھا اب وہ محض چند مخصوص افراد تک محدود نہ تھی اور اس کی دعوت اور نصب العین سے اس کے ارکان اور ہمدردوں کا حلقہ ہی واقف نہ تھا بلکہ اس کے مقاصد، اس کا نصب العین اس کے مطالبے اور اس کی اصطلاحات زبان زد عام تھیں، وہ اب بے خدا تہذیب کے ستائے ہوئے تمام انسانوں کے دل کی پکار تھی۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں اس نے بڑی تیزی سے ترقی کی اور "مکتب" اور "مدرسہ" سے نکل کر گھر گلی کوچہ اور در و دیوار سے ظاہر ہونے لگی۔ گویا ہماری ادبی تحریک کا وہ حصہ جو کسی وقت حقیقت پسندانہ (Realisme) ادب کے ساتھ ایک تخیل پسندی اور مستقبل پسندی (Futurisme) کی شکل میں آیا کرتا تھا اور اس کی خاطر ہم مجبور ہوجاتے تھے کہ تمدن کے حقیقی ارتقا نے جس قسم کا ادبی اسلوب، انداز نگارش اور اس کی تزئین و آرائش کا ساز و سامان ہمیں فراہم کرکے دیا ہے۔ اس کے استعمال میں ہم تخیل سے کام لیں۔ اب خود حقیقت بنکر ہمارے سامنے آگیا۔ پہلے جہاں سوسائٹی کے اندر اسلامی کرداروں کو پیش کرنے کے لئے محض تصوراتی خاکے گھڑنا پڑتے تھے وہیں اب اس قسم کے جیتے جاگتے کرداروں نے ملک کے خونی واقعات کے دوران میں ایک ہیکو حم ڈل کی شکل میں اپنا پارٹ ادا کرکے نہ صرف ایک دو بلکہ سینکڑوں افسانوں کے لئے لاتعداد کردار فراہم کردیئے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ ایک حق پسند اور واقعیت پسند ادیب کے لئے یہ تمام سہولتیں اس سے پہلے بھی موجود تھیں؟ دراصل تحریک اسلامی کی بڑھتی ہوئی رفتار کار اور اس کی منظم جد و جہد کی مقبولیت نے آج ہمارے قلم کے لئے پہلے سے کہیں زیادہ آسانیاں فراہم کردی ہیں اور ادب تو ہمیشہ سے باقاعدہ فوجوں کے پیچھے گوریلا دستوں کی طرح چلا کرتا ہے۔ ہمارے جو ادیب اپنے "چھاپہ مار دستے" کو نئے اصلی فوج سے بھی بڑے پیمانہ پر منصوبہ بندی کررہے تھے میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کی یہ "چالاکیت سلی" کس حد تک صحیح تھی۔ لیکن اس معاملہ میں خود میں نے جو روش اختیار کی اس کی توضیح مجھے کرنا مقصود ہے۔

اسلامی ادب کا نیا معیار

بہرحال حالات کی تبدیلی نے ہمارے لئے راستہ بالکل صاف اور واضح کردیا اور ہمارے ذہن میں نئے اسلامی ادب کا ایک وسیع اور ہمہ گیر خاکہ خود بخود مرتب ہوگیا۔ اس خاکہ پر اور

اس جدید معیارِ ادب پر محترم دوست نعیم صدیقی نے اپنے پرچے "چراغ راہ" کے متعدد شماروں میں کافی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جس سے بڑی حد تک نئے اسلامی ادب کو سمجھا جا سکتا ہے تاہم اس بارے میں اپنے خیالات کو بھی احباب کے سامنے رکھ دینا چاہتا ہوں۔

۱۔ سب سے پہلا کام جو ہمارے ادیب کو کرنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ وہ اپنے جداگانہ ادبی موقف کا احساس اپنے اندر پیدا کرے۔ اس احساس کے بغیر یہ بہت مشکل ہوگا کہ ہم کوئی نیا تعمیری ادب پیش کر سکیں۔

۲۔ نیا مسلم ادیب محض گوشوں اور خلوت کدوں کی زینت نہ بنا رہے۔ اور اس کا قلم صرف عیش و تنعم کی خوشگوار فضاؤں کا طالب نہ ہو بلکہ وہ ایک جانباز سپاہی کی طرح ہر گام پر جاہلی سوسائٹی سے عملی کشمکش کرے وہ اپنے انقلابی مشن کو لے کر ایک ایک انسان سے ملے انسانوں کے مختلف طبقات اور گروہوں سے تعلق پیدا کرے اور ہر وقت اسی ادھیڑ بن میں لگا رہے کہ حق اور باطل کے درمیان ایک زوردار کشمکش ہو۔ ایک چھیڑ سی چل جائے جو بالآخر حق کی فتح اور باطل کی شکست پر منتج ہو۔ جو ادیب محض تخیل پسند ہوگا اور واقعات کی دنیا میں انقلاب کا شامیانہ تاننے کی کوشش نہ کرے گا۔ وہ کبھی انقلابی ادب تیار نہ کر سکے گا۔ ہمارے اسلامی ادیب کا کردار اس خامی سے پاک ہونا چاہیئے۔

۳۔ وہ اسلامی تحریک کے بنیادی لٹریچر قرآن و حدیث کا گہرا مطالعہ کرے۔ اسوۂ صحابہ اور دیگر انبیا علیہم السلام کے واقعات پر حاوی ہو۔ تاریخ اسلام کا اچھا طالب علم ہو اور پھر ان معلومات کے ساتھ ساتھ جاہلی سوسائٹی اور اس کی خرابیوں پر بھی اس کی نظر نہایت گہری ہو۔ ان تمام چیزوں کے بغیر ہمارے لئے یہ بہت مشکل ہوگا کہ ہم "اسلامی ادب" کی تعمیر جدید کا کام اپنے ہاتھ میں لیں۔ ایک نئی عمارت کا پایہ کھودیں۔ ایک نئے نقشہ پر اس کی دیواریں اٹھائیں اور پھر دیواروں پر پچیکاری اور گلکاری کے ایسے ڈزائن بنائیں جن کو جاہلی فنکاروں کے قلم نے کبھی سوچا تک نہ ہو۔

۴۔ ہمارے افسانہ کی عام تکنیک وقت کی تکنیک سے ضرور مطابقت رکھے تکنیک دراصل زمانے کی زبان ہوتی ہے۔ اگر حصول مدعا کی خاطر تکنیک بدل دی جائے تو نئی زبان کو سمجھے بغیر لوگ ہماری بات کو کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ البتہ ایسی جدتیں ضرور ہونی چاہئیں جو رفتہ رفتہ ادب کو اور خود لوگوں کے ذہنوں کو ایک اونچے مقام پر لے جائیں، گویا نئی تکنیک نئی زبان کی طرح رفتہ رفتہ سکھائی جائے ایک دم پیش نہ کر دی جائے۔

۵۔ افسانے کا مقصد زیادہ تر انقلابی ہو۔ اب ہمارے لئے محض اصلاحی مقصد مفید نہیں ہو سکتا۔ اگر صرف اصلاحی مقاصد کی حد تک ہم اپنی بات محدود رکھیں گے تو دنیا ہمارے مدعا کو نہ سمجھ سکے گی بلکہ ہمارا مدعا دوسروں کے شور و غوغے میں کھو جائے گا۔ مجھے اپنے اکثر رفیقانِ قلم سے شکایت ہے اور یہ شکایت تو خود مجھے اپنے آپ سے بھی تھی کہ اب تک ہم صرف اصلاحی انداز کی چیزیں ہی لکھتے جا رہے ہیں حالانکہ تباہیوں کے الاؤ میں رقص کرنے والی دنیا ایک "انقلابی توڑ پھوڑ" اور ایک جرأت آزما ضرب کلیمی کی طلب گار ہے۔ ہمیں خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ آنے والے زمانے میں اس کے بغیر نہ تو ہم دوسروں تک اپنی بات پہنچا سکیں گے اور نہ خود اپنے جداگانہ حیثیت کو برقرار رکھ سکیں گے۔

الغرض اس تشریح سے مدعا صرف یہ ہے کہ نیا اسلامی افسانہ بلند پایہ افکار کا مرقع ہو۔ پلاٹ اور انداز بیان کے اعتبار سے جدید ترین ہو پلاٹ خود لکھنے والے کی عملی کشمکش اور جد و جہد کا مظہر ہو۔ اس میں اس کے وسیع مشاہدے کو دخل ہو اور اس کی اعلیٰ دینی معلومات کا عکس ہو اور اس کا قلم پوری دلیری اور بے باکی سے مقصد کو افسانے کے پلاٹ سے مربوط کر دے تکلف کم کر دیا جائے۔ بے تکلفی اور اظہار بیان کی سادگی زیادہ

ہو۔ غیر فطری اسلوب۔ تصنع اور خواہ مخواہ کی بناوٹ ہمارے لئے زیادہ مفید نہیں کیونکہ ہم تخیل پسند نہیں۔ حقیقت پسند ہیں اور واقعات کی سرزمین پر قدم رکھ کر چلتے ہیں۔ جس جگہ رہتے ہیں اسی کے مطابق بات سمجھاتے ہیں۔ ہم ہندوستان میں رہ کر امریکہ اور مصر کی بات نہیں کرنا چاہتے۔ اگرچہ ہماری دعوت ساری دنیا کے انسانوں کے لئے عام ہے۔ لیکن ہمارے اولین مخاطب ہمارے ملکی بھائی اور ہماری اڑوس پڑوس کی چیخنے چلانے والی عورتیں اور ان کے لاپرواہ مرد ہیں اس لئے ہم سب سے پہلے انھیں کے متعلق کچھ کہیں گے۔ اس کے بعد ہم قلم کی نوک اونچی کر کے دور دور کی چیزوں کا جائزہ لیں گے۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمارا ادب محدود ادب ہوگا۔ نسل پرستی، قوم پرستی، اور وطن پرستی کی لعنتوں میں جکڑا ہوا ادب ہوگا یہ خیال سراسر غلط ہے ہم ہر حال میں ایک بین الاقوامی ادب بلکہ ایک بین الانسانی اور عالمگیر ادب ہی کی تشکیل کریں گے۔ ہم قرآن کو لے کر اٹھیں گے قصۂ یوسف کو عام کریں گے۔ خدا کا پیغام طاغوت کے اس قیدخانے میں ہر ایک کو سنائیں گے اور بالآخر ہمارا ادب ساری دنیا کے لئے مشعل ہدایت بن جائے گا۔ ہمارا قلم ساری دنیا پر چھا جائے گا۔

متفرق کام ان لکھنے والوں کے علاوہ جن کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے ایک اور بڑا گروہ ہے جو بڑی تیزی سے ابھر رہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ "دوسری پشت" پہلی نسل" سے بھی بازی لے جائے گی۔ کیوں نہ ہو نئے لکھنے والے زیادہ تجربات کے بعد اور زیادہ دنیا دیکھ کر میدان میں آرہے ہیں۔ نجات اللہ صدیقی۔ ابن محمود۔ عبدالعزیز قاضی۔ مرزا فراست بیگ۔ ابوالکلام شہباز ہندی۔ عرفان خارعلی خواجہ صفی اللہ۔ خالد فاروقی۔ عثمان علی خاں۔ محمود رونقی۔ اسمٰعیل ادیب اور چند اور لکھنے والے رفتہ رفتہ ابھر رہے ہیں۔ بلکہ نجات اللہ صدیقی اور ابن محمود تو کافی نمایاں ہو چکے ہیں۔ اور اپنی ابتدائی کوششوں ہی میں انہوں نے کشتی کو پار لگا دیا ہے۔ خدا کرے کہ رفتہ رفتہ تمام صالح ادیب ملکر ایک مضبوط اور طاقتور ادبی جتھا بن جائیں۔ اور پھر اپنے قلم کی مشین گنوں سے روشنائی اور کاغذ کا امیونیشن لے کر خدا ناشناسی افکار کے خلاف ایسی شدید گولہ باری کریں کہ ابتدائی چند باڑوں ہی میں دشمن کے مورچوں میں کھلبلی مچ جائے اور وہ میدان سے بھاگتا نظر آئے۔ مجھے توقع ہے کہ جس دلیری اور پامردی سے اب تک کام ہو رہا ہے اگر اسی طرح کچھ عرصے اور ہوتا رہا تو پھر میدان ہمارے ہاتھ رہے گا۔

پرانے لکھنے والوں کی تبدیلی اس جدید ادبی تحریک سے محض چند منچلے نوجوان ہی نہیں بلکہ بعض کہنہ مشق لکھنے والے بھی متاثر ہوئے ہیں ان میں شوکت تھانوی۔ ماہرالقادری اور قیسی رام پوری کے نام سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ شوکت نے اپنے ناول "بکواس" میں نسلی اسلام پر بہت دلچسپ طنز کیا ہے۔ پھر اشتراکیت اور مادیت پر بھی انہوں نے چند چبھتے ہوئے کچوکے لگائے ہیں۔ لیکن "بکواس" میں ایک بہت بڑی خرابی ہے اور وہ ہے ماحول کا تضاد۔ جو لوگ خود ہی مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اپنے ساتھی مردوں اور عورتوں کے ساتھ بلا تکلف پکنک کو جاتے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر (Opinion) کا کھیل کھیلتے ہیں۔ وہی لوگ جب چائے کے ٹیبل پر آتے ہیں تو ایک دوسرے کے حریف بنکر سخت گرماگرم بحث شروع کر دیتے ہیں۔ ایک مذہب کا حامی ہے اور دوسرا مذہب کا مخالف۔ جیسے کسی فلم کمپنی کے ایکٹرسٹ پر کام کرتے وقت ہیرو اور ویلن بن جاتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں ان کی ایک دوسرے سے بڑی دوستی ہوتی ہے اور وہ سب کردار اور مسلک کی ایک ہی کشتی "فلمی دنیا" کے سوار ہوتے ہیں۔ یہ تضاد معلوم نہیں کیوں شوکت

اس جدید معیار ادب پر محترم دوست نعیم صدیقی نے اپنے پرچے "چراغ راہ" کے متعدد شماروں میں کافی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جس سے بڑی حد تک نئے اسلامی ادب کو سمجھا جا سکتا ہے تاہم اس بارے میں اپنے خیالات کو بھی احباب کے سامنے رکھ دینا چاہتا ہوں۔

۱۔ سب سے پہلا کام جو ہمارے ادیب کو کرنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ وہ اپنے جداگانہ ادبی موقف کا احساس اپنے اندر پیدا کرے۔ اس احساس کے بغیر یہ بہت مشکل ہوگا کہ ہم کوئی نیا تعمیری ادب پیش کر سکیں۔

۲۔ نیا مسلم ادیب محض گوشوں اور خلوت کدوں کی زینت نہ بنا رہے۔ اور اس کا قلم صرف عیش و تنعم کی خوشگوار فضاؤں کا طالب نہ ہو بلکہ وہ ایک جانباز سپاہی کی طرح ہر گام پر جاہلی سوسائٹی سے عملی کشمکش کرے وہ اپنے انقلابی مشن کو لے کر ایک ایک انسان سے ملے انسانوں کے مختلف طبقات اور گروہوں سے تعلق پیدا کرے اور ہر وقت اسی ادھیڑ بن میں لگا رہے کہ حق اور باطل کے درمیان ایک زوردار کشمکش ہو ایک چھیڑ سی چل جائے جو بالآخر حق کی فتح اور باطل کی شکست پر منتج ہو جو ادیب محض تخیل پسند ہوگا اور واقعات کی دنیا میں انقلاب کا شامیانہ تاننے کی کوشش نہ کرے گا۔ وہ کبھی انقلابی ادب تیار نہ کر سکے گا۔ ہمارے اسلامی ادیب کا کردار اس خامی سے پاک ہونا چاہیئے۔

۳۔ وہ اسلامی تحریک کے بنیادی لٹریچر قرآن و حدیث کا گہرا مطالعہ کرے۔ اسوۂ صحابہ اور دیگر انبیا علیہم السلام کے واقعات پر حاوی ہو تاریخ اسلام کا اچھا طالب علم ہو اور پھر ان معلومات کے ساتھ ساتھ جاہلی سوسائٹی اور اس کی خرابیوں پر بھی اس کی نظر نہایت گہری ہو۔ ان تمام چیزوں کے بغیر ہمارے لئے یہ بہت مشکل ہوگا کہ ہم "اسلامی ادب" کی تعمیر جدید کا کام اپنے ہاتھ میں لیں۔ ایک نئی عمارت کا پایہ کھودیں۔ ایک نئے نقشہ پر اس کی دیواریں اٹھائیں اور پھر دیواروں پر پچیکاری اور گلکاری کے ایسے ڈزائن بنائیں جن کو جاہل فنکاروں کے قلم نے کبھی سوچا تک نہ ہو۔

۴۔ ہمارے افسانہ کی عام تکنیک وقت کی تکنیک سے ضرور مطابقت رکھے تکنیک دراصل زمانے کی زبان ہوتی ہے۔ اگر حصول مدعا کی خاطر تکنیک بدل دی جائے تو نئی زبان کو سمجھے بغیر لوگ ہماری بات کو کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ البتہ ایسی جدتیں ضرور ہونی چاہئیں جو رفتہ رفتہ ادب کو اور خود لوگوں کے ذہنوں کو ایک اونچے مقام پر لے جائیں، گویا نئی تکنیک نئی زبان کی طرح رفتہ رفتہ سکھائی جائے ایک دم پیش نہ کر دی جائے۔

۵۔ افسانے کا مقصد زیادہ تر انقلابی ہو۔ اب ہمارے لئے محض اصلاحی مقصد مفید نہیں ہو سکتا۔ اگر صرف اصلاحی مقاصد کی حد تک ہم اپنی بات محدود رکھیں گے تو دنیا ہمارے مدعا کو نہ سمجھ سکے گی بلکہ ہمارا مدعا دوسروں کے شور و غوغے میں کھو جائے گا۔ مجھے اپنے اکثر رفیقان قلم سے شکایت ہے اور یہ شکایت تو خود مجھے اپنے آپ سے بھی تھی کہ اب تک ہم صرف اصلاحی انداز کی چیزیں ہی لکھتے جا رہے ہیں حالانکہ تباہیوں کے الاؤ میں رقص کرنے والی دنیا ایک "انقلابی توڑ پھوڑ" اور ایک جرات آزما ضرب کلیمی کی طلب گار ہے۔ ہمیں خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ آنے والے زمانے میں اس کے بغیر نہ تو ہم دوسروں تک اپنی بات پہنچا سکیں گے اور نہ خود اپنے جداگانہ حیثیت کو برقرار رکھ سکیں گے۔

الغرض اس تشریح سے مدعا صرف یہ ہے کہ نیا اسلامی افسانہ بلند پایہ افکار کا مرقع ہو۔ پلاٹ اور انداز بیان کے اعتبار سے جدید ترین ہو پلاٹ خود لکھنے والے کی عملی کشمکش اور جد و جہد کا مظہر ہو اس میں اس کے وسیع مشاہدے کو دخل ہو اور اس کی اعلیٰ دینی معلومات کا عکس ہو اور اس کا قلم پوری دلیری اور بے باکی سے مقصد کو افسانے کے پلاٹ سے مربوط کر دے تکلف کم کر دیا جائے۔ بے تکلفی اور اظہار بیان کی سادگی زیادہ

ہو۔ غیر فطری اسلوب۔ تصنع اور خواہ مخواہ کی بناوٹ ہمارے لئے زیادہ مفید نہیں کیونکہ ہم تخیل پسند نہیں۔ حقیقت پسند ہیں اور واقعات کی سرزمین پر قدم رکھ کر چلتے ہیں۔ جس جگہ رہتے ہیں اسی کے مطابق بات کہا کرتے ہیں۔ ہم ہندوستان میں رہ کر امریکہ اور مصر کی بات نہیں کرنا چاہتے۔ اگرچہ ہماری دعوت ساری دنیا کے انسانوں کے لئے عام ہے۔ لیکن ہمارے اولین مخاطب ہمارے ملکی بھائی اور ہماری اڑوس پڑوس کی چیخنے چلانے والی عورتیں اور ان کے لاپروا مرد ہیں اس لئے ہم سب سے پہلے انھیں کے متعلق کچھ کہیں گے۔ اس کے بعد ہم قلم کی نوک اونچی کر کے دور دور کی چیزوں کا جائزہ لیں گے" تاہم اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمارا ادب محدود ادب ہوگا۔ نسل پرستی، قوم پرستی، اور وطن پرستی کی لعنتوں میں جکڑا ہوا ادب ہوگا۔ یہ خیال سراسر غلط ہے۔ ہم ہر حال میں ایک بین الاقوامی ادب بلکہ ایک بین الانسانی اور عالمگیر ادب ہی کی تشکیل کریں گے۔ ہم قرآن کو لے کر اٹھیں گے قصۂ یوسف کو عام کریں گے۔ خدا کا پیغام طاغوت کے اس قید خانے میں ہر ایک کو سنائیں گے اور بالآخر ہمارا ادب ساری دنیا کے لئے مشعل ہدایت بن جائے گا۔ ہمارا قلم ساری دنیا پر چھا جائے گا۔

متفرق کام ان لکھنے والوں کے علاوہ جن کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے ایک اور بڑا گروہ ہے جو بڑی تیزی سے ابھر رہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ "دوسری پشت" "پہلی نسل" سے بھی بازی لے جائے گی۔ کیوں نہ ہو نئے لکھنے والے زیادہ تجربات کے بعد اور زیادہ دنیا دیکھ کر میدان میں آرہے ہیں۔ نجات اللہ صدیقی۔ ابن محمود۔ عبدالعزیز قاضی۔ مرزا فراست بیگ۔ ابوالکلام شہباز ہندی۔ عرفان خارعلا خواجہ صفی اللہ۔ خالد فاروقی۔ عثمان علی خاں۔ محمود رونق۔ اسمٰعیل ادیب اور چند اور لکھنے والے رفتہ رفتہ ابھر رہے ہیں۔ بلکہ نجات اللہ صدیقی اور ابن محمود تو کافی نمایاں ہو چکے ہیں۔ اور اپنی ابتدائی کوششوں ہی میں انہوں نے کشتی کو پار لگا دیا ہے۔ خدا کرے کہ رفتہ رفتہ تمام صالح ادیب ملکر ایک مضبوط اور طاقتور ادبی جتھا بن جائیں۔ اور پھر اپنے قلم کی مشین گنوں سے روشنائی اور کاغذ کا امیونیشن لے کر خدا ناشناسی افکار کے خلاف ایسی شدید گولہ باری کریں کہ ابتدائی چند باڑوں ہی میں دشمن کے مورچوں میں کھلبلی مچ جائے اور وہ میدان سے بھاگتا نظر آئے۔ مجھے توقع ہے کہ جس دلیری اور پامردی سے اب تک کام ہو رہا ہے اگر اسی طرح کچھ عرصے اور ہوتا رہا تو پھر میدان ہمارے ہاتھ رہے گا۔

پرانے لکھنے والوں کی تبدیلی اس جدید ادبی تحریک سے محض چند منچلے نوجوان ہی نہیں بلکہ بعض کہنہ مشق لکھنے والے بھی متاثر ہوئے ہیں ان میں شوکت تھانوی۔ ماہر القادری اور قیسی رام پوری کے نام سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔

شوکت نے اپنے ناول "بکواس" میں نسلی اسلام پر بہت دلچسپ طنز کیا ہے۔ پھر اشتراکیت اور مادیت پر بھی انہوں نے چند چبھتے ہوئے کچوکے لگائے ہیں۔ لیکن "بکواس" میں ایک بہت بڑی خرابی ہے اور وہ ہے ماحول کا تضاد۔ جو لوگ خود ہی مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اپنے ساتھی مردوں اور عورتوں کے ساتھ بلا تکلف پکنک کو جاتے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر (Opinion) کا کھیل کھیلتے ہیں۔ وہی لوگ جب چائے کے ٹیبل پر آتے ہیں تو ایک دوسرے کے حریف بنکر سخت گرما گرم بحث شروع کر دیتے ہیں۔ ایک مذہب کا حامی ہے اور دوسرا مذہب کا مخالف۔ جیسے کسی فلم کمپنی کے ایکٹرسٹ پر کام کرتے وقت ہیرو اور ویلن بن جاتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں ان کی ایک دوسرے سے بڑی دوستی ہوتی ہے اور وہ سب کردار اور ممالک کی ایک ہی کشتی "فلمی دنیا" کے سوار ہوتے ہیں۔ یہ تضاد معلوم نہیں کیوں شوکت

میں سوچا ـــــ

البتہ ماہر القادری نے اپنے تپ کو بہت حد تک بدل لیا ہے ـــــ لیکن ماہر کی ایک عجیب و غریب اور نہایت پر مذاق عادت ہے ، وہ مختلف رسالوں کی مناسبت سے مختلف مضمون باندھتے ہیں ـــــ جیسے ادب بھی کوئی لباس ہے ۔ سونے کے کمرے میں تو سلیپنگ سوٹ اور باہر جوانی پاجامہ ـــــ

پھر نسیم حجازی بھی اپنی تمام فلسفیانہ حقیقت طرازیوں اور کہانیوں کے باوجود ہمارے معیار کے کیریکٹر فراہم نہ کر سکے اور کردار نگاری میں انہوں نے اسلام کی خاطر بہت کچھ "غیر اسلامیت" برتی ہے ۔ البتہ لیبل "اسلامی کردار" کا لگا دیا ہے ۔ "پہیلیاں" ان کا عجیب و غریب ناول ہے ۔

لیکن اس تمام "غیر انقلابیت" اور معیاری سوسائٹی سے "جھجک" کے باوجود اتنا تو میں ضرور کہوں گا کہ یہ لوگ اور لوگوں کی طرح دامن موڑ کر دوسرے رخ پر چل دینے کی بجائے بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں ۔ جن میں ماہر القادری میرے خیال میں سب سے پیش پیش ہیں ـــــ بلکہ اب تو ماہر کو ہم اپنا ادیب کہہ سکتے ہیں ۔

دعوت فکر تحریک اسلامی کے ادب میں افسانے کے جداگانہ موقف پر اس مختصر سے تبصرہ کے بعد اب میں وقت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا ۔ بے مقصد لیٹے رہنے والوں اور ضرورت سے زیادہ نیند لینے والوں کو جگاؤں گا اور پھر میں ان سے کہوں گا اٹھو یہ تم دھرے بیٹھے رہنے سے کیا حاصل ہے اگر اس کا بھی کچھ حاصل ہو تو اسے میدان میں لاؤ ـــــ !

دو واضح اور متعین راستے تمہارے سامنے کھلے ہوئے ہیں ۔ ایک راستہ پیٹ ۔ آگ ۔ معدہ اور اعضائے جنسی کا راستہ ہے ـــــ جس میں گر کر انسان اسفل السافلین کے درجے تک پہنچ سکتا ہے ، اور دوسرا راستہ انسانیت کی اعلیٰ اقدار حیات پر تعمیر و تنظیم اور تبدیلی کا راستہ ہے ۔ دونوں راستوں پر چلنے والے تمہیں اپنی اپنی طرف بلا رہے ہیں ـــــ اس لئے کسی طرف چلنے سے پیشتر اچھی طرح سوچ لو کہ کدھر جانا ہے ۔ خدا پرستی ۔ انسان دوستی ۔ عالمگیر اخوت اور فطرت انسانی کی حقیقی راہ تمہیں پسند ہے یا تم نفس کے بندوں ۔ پیٹ کے غلاموں اور جنسیات کے متوالوں کے پیچھے چلنا چاہتے ہو ـــــ جلدی سوچو ۔ جلدی آگے بڑھو ـــــ وقت ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے ۔ گزرا ہوا وقت دوبارہ لوٹ کر نہیں آئے گا کہ تم اپنے غیر آباد مکان کو پھر سے آباد کر سکو ۔ وقت کا جو ریلا زمین کی منزلوں کو روندتا ہوا آگے بڑھ گیا ۔ وہ بڑھ گیا ۔ اگر اس سے قبل تم نے اپنے بے مقصد انداز تحریر کو نہ بدلا تو زمانے کا بے درد ہاتھ تمہارے قلم اور تمہارے ذہن دونوں سے بدلے گا ـــــ اور بہت ممکن ہے یہ ایک بہت ہی سخت بدلہ ہو ـــــ !

(بقیہ صفحہ ۲۰)

رہنمائی آپ کے ہاتھ میں ہوگی ۔ بہرحال اس نقشہ پر کامیابی حاصل کرنے کے لئے ناگزیر ہے کہ مسلمان نئے حالات کے مطابق اپنے اندر سے ایک بہتر اور زیادہ مضبوط سیاسی لیڈر شپ پیدا کریں جو تنگ نظری کے ساتھ مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے مفادات کی حفاظت پر مصر ہو بلکہ بڑے پیمانہ پر عدل و انصاف کے قیام سے اور عامۃ الناس کی حقیقی ترقی اور فلاح کے کاموں سے مسلمانوں کے صحیح مفاد کی خدمت کر سکے ۔

انقلاب اے انقلاب

رضوان ہاشمی

سورج طلوع ہوتا ہے
دنیا ایک انقلاب کے پیغام کو سنتی ہے۔
روز انقلاب کی آواز
روز ایک نئے انقلاب کی آواز
انقلاب آتا ہے
پھر انقلاب آتا ہے۔
انقلاب پر انقلاب
انقلابات پر انقلابات
امن کے نام پر
شانتی کے نام پر
ظلم کو مٹانے کے لئے
استبداد کو کچلنے کے لئے۔
جاگیرداری کو ختم کرنے کے لئے
اجارہ داری کو نابود کرنے کے لئے
شخصیت پرستی کے دفعیہ کے لئے
سرمایہ داری کے استیصال کے لئے
قیام آزادی کے لئے
بولنے کی آزادی
لکھنے کی آزادی
ضمیر کی آزادی
معاش کی آزادی
انقلاب آتا ہے
پھر انقلاب آتا ہے
جاگیرداری ختم ہوتی ہے
اجارہ داری نابود ہوتی ہے
شخصیت پرستی دفع ہوتی ہے
سرمایہ داری کا استیصال ہوتا ہے
آزادی ملتی ہے
بولنے کی آزادی ملتی ہے
لکھنے کی آزادی ملتی ہے
ضمیر کی آزادی ملتی ہے
معاش کی آزادی ملتی ہے
اور اس کے ساتھ
ہر طرح کی آزادی بھی ملتی ہے
لوٹنے کی آزادی
قتل و خون کی آزادی
آزادی یا کھلی آزادی

اور بے در آزادی
نہ ظلم مٹتا ہے
نہ استبداد کچلا جاتا ہے
نہ امن قائم ہوتا ہے
نہ شانتی نصیب ہوتی ہے
لیکن نہیں
ہوتی ہے
اور ضرور نصیب ہوتی ہے۔
گو عارضی ہی سہی
مگر کس کے لئے
اوپر والوں کے لئے
جو کرسی پر ہیں
جو ایوان میں ہیں
جو اونچے رہے ہیں۔
امن بھی تو اونچا ہے
ہائے مگر مظلوم انسانیت
پھر بھی تڑپتی ہی رہی
بیکس بدل گئے
مگر بیکسی نہ گئی
اے دنیا والو
ذرا سوچو تو سہی
کیا بات ہے آخر ـــــ
تم نے انقلاب چاہا
کتنے انقلاب نہ آئے
انقلاب پر انقلاب
مگر کیا حال ہے آج
ایک عیش میں مست ہے
ایک خستہ حال ہے
آؤ اک راز
اِک راز بتاؤں تمہیں
کھلا ہوا راز
روز روشن کی طرح
چمگادڑ نہ بنو
دیکھو
یہ دنیا کس نے بنائی
چاند کس نے چمکایا
سورج کو درخشاں کس نے کیا

پانی کون برساتا ہے
کون کھیتوں کو پکاتا ہے
تمہیں مارتا کون ہے
تمہیں پیدا کس نے کیا
اور سانس میں مٹھاس کس نے رکھی
پھول میں خوشبو کس نے بند کیا
لیں وہی
ہاں بس وہی
مالک ہے کرسی کا
ایوان اسی کا ہے
اونچا وہی ہے
باقی سارے کرسی والے
سب جھوٹے
سارے ایوان والے
سب کھوٹے
سارے اونچے
سب خود ساختہ
اٹھو
اٹھو اے دنیا والو
ان ساری کرسیوں کو توڑ دو۔
ان سارے ایوانوں کو ڈھا دو
ان ساری اونچائیوں کو پست کر دو
یہ جھوٹی کرسیاں
یہ کھوٹے ایوان
یہ خود ساختہ اونچائی کے دعوے
یہی فتنہ کی اصلی جڑ ہیں۔
آ جاؤ
نیچے آ جاؤ
اس ایک کی کرسی کے نیچے
تمہاری جگہ
اوپر نہیں
نیچے ہے نیچے
اوپر
اوپر والے کو دو
تم نے بہت سے انقلاب برپا کئے
لیکن سارے کے سارے خالی گئے
اب تو اس تیر کو آزماؤ

لا الہ الا اللہ، دنیا میں کوئی حاکم مگر اللہ)!

گل ہائے رنگ رنگ

جدید دیدہ زیب عید کارڈ

شیخ محمد قمرالدین پبلشر و بک سیلر۔ گوجرگلی۔ اندرون موچی دروازہ لاہور

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اسلام ایک ہمہ گیر نظام ہے اور زندگی کے تمام شعبہ جات پر حاوی ہے لیکن اس حقیقت پر عمل کرنے والے اور اپنی زندگی کے تمام شعبوں کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھال لینے والے بہت ہی کم ملتے ہیں۔ بلکہ زیادہ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو صرف اسلام کا لیبل لگا کر اپنا کاروبار چمکاتے ہیں درحقیقت اسلام ان کے کام سے کوسوں دور رہتا ہے لیکن مذکورہ بالا ادارہ جس کے جدید دیدہ زیب عید کارڈ اس وقت تبصرے کے لئے ہمارے سامنے ہیں اُن چند اداروں میں سے ہے جنہوں نے حق کی خاطر غیر معمولی نقصان برداشت کر کے اپنے کاروبار کو صحیح اسلامی لائنوں پر ڈھالا ہے۔ شیخ محمد قمرالدین کے نام سے ہند و پاکستان کا بچہ بچہ واقف ہے ان کے عید کارڈ ہر قسم کی تقریب کے موقع پر لوگوں کی نظروں سے گزرتے ہیں اور ان کی مسرتوں کو دوگنا کر دیتے ہیں لیکن جب سے ان کے ادارہ نے صحیح اسلامی اصولوں کے مطابق اپنے کاروبار میں تبدیلیاں کی ہیں۔ اس کے ہر کام میں ایک جدت اور انوکھا پن پیدا ہو گیا ہے عید کارڈوں پر سے جانداروں کی تصاویر نکال دی گئی ہیں۔ لیکن ان کے بجائے جو اصلاحی جملے اور فقرے اور نئے نئے ڈزائین بنائے گئے ہیں وہ ان لغو تصویروں سے کہیں زیادہ دلکش اور نظر فریب ہیں عید بقرعید کے موقعوں پر مسلمان اصحاب و تہواروں کے موقعوں پر غیر مسلم اصحاب اصلاح و اخلاق و ہدایت کا کام ان کارڈوں سے بخوبی لے سکتے ہیں نصیحت اور فہمائش کا یہ ایک نہایت ہی عمدہ پیرایہ ہوگا۔ رنگا رنگ عید کارڈوں (لفافے اور بغیر لفافے والے) کی طویل فہرست ناشر سے براہ راست طلب کی جا سکتی ہے (ر۔ع)

الحسنات ماہانہ کا توحید نمبر

مرتبہ: ابو سلیم محمد عبدالحی

پتہ: دفتر "الحسنات" پنڈرہ روڈ رامپور اسٹیٹ

قیمت: دس آنے۔ سالانہ چندہ عہ

اب تک جتنے جریدے لڑکوں اور لڑکیوں کی اسلامی اصولوں پر تربیت افکار کے لئے شائع ہوتے رہے ہیں ان میں الحسنات پندرہ روزہ نے ایک نیا معیار قائم کیا ہے۔ یہ جریدہ بالکل جدید طریقہ پر اسلام کے انقلاب انگیز پیام کو پڑھنے والوں کے ذہن میں اتارتا ہے اور اس سے نہ صرف کم پڑھے لکھے اور بچے ہی مستفید ہوتے ہیں بلکہ اچھے خاصے صاحب فہم اور تعلیم یافتہ حضرات کے لئے بھی اس کا مطالعہ فائدے سے خالی نہیں۔ ابھی حال میں اس جریدہ کا توحید نمبر شائع ہوا ہے اسلام کی حقیقی دعوت کو اور لا الٰہ الا اللہ کے عالمگیر پیام کو اس خاص نمبر میں جس عمدگی، ندرتِ خیال اور جدتِ بیان کے ساتھ پیش کیا گیا ہے وہ ادارہ الحسنات ہی کا حق ہے۔ ہمارے خیال میں آج کل جب کہ اسلامی نظام کے حیات بخش اصولوں کو خواص کے علاوہ ہندوستان کے مسلم اور غیر مسلم عوام تک پہنچانے کی شدید ضرورت ہے اس نمبر سے بہت مدد لی جا سکتی ہے۔ تبلیغی اور اشاعتی کام کرنے والوں کے لئے یہ ایک بہترین موقع ہے جس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ مضامین کے تنوع اور اظہار خیال کے انوکھے پن کے ساتھ ساتھ اگر کارکنان الحسنات اس کی ظاہری خوشنمائی کے لئے جدید طرز کے ڈزائن اور نمونے پسند کریں تو یہ چیز سونے پر سہاگہ کا کام کرے گی۔ جریدہ کی کتابت اور طباعت معیاری اور مقصد کے شایان شان ہے۔ (ا۔ ع)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خدا پرستی، انصاف اور امن کا پیامی

انوار

ماہنامہ

جلد ۳ شمارہ ۴

ستمبر ۱۹۴۹ء

مدیر: سید اصغر علی عابدی

مسئول: عمر بن عبداللہ ایم۔اے

قیمت سالانہ	فی پرچہ
۵ ؎	۸ ؍

مقام اشاعت: نظام شاہی روڈ۔ حیدرآباد دکن

فہرست

اپنے ساتھیوں سے

اگر آپ ماہنامہ "انوار" کے خریدار ہیں یا "انوار" آپ کی نظر سے گذرتا ہے، تو یقیناً آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہوگی، اور آپ اس بات کے خواہشمند ہوں گے، کہ ادب و نگارش، کتابت و طباعت اور پابندیٔ وقت کے ساتھ اشاعت میں "انوار" کا معیار بلند سے بلند تر ہوتا چلا جائے، لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ ان امور کی تکمیل میں آپ کس طرح ہاتھ بٹا سکتے ہیں؟ (۱) اپنے حلقۂ احباب اور حلقۂ اثر میں "انوار" کا تعارف کرائیے، اس کے ادبی علمی اور دینی مقاصد کی اشاعت میں حصہ لیجئے، اچھے لکھنے والوں اور پڑھے لکھے اصحاب علم کو اس طرف متوجہ کیجئے، تاکہ "انوار" اچھے حلقہ ناظرین میں جاکر اپنی اچھائیوں میں اور اضافہ کر سکے۔ (۲) کوشش کیجئے کہ آپ ہر ماہ "انوار" کو کم سے کم ایک خریدار فراہم کریں، انشاء اللہ مہینے بھر میں یہ کام آپ بآسانی کر سکیں گے صرف ذرا توجہ کی ضرورت ہے۔ (۳) اگر اس جگہ ☐ سرخ پنسل کا نشان ہو تو سمجھئے، کہ آپ کا بدل اشتراک ختم ہو گیا ہے اس لئے بروقت نئے سال کی قیمت روانہ کر دیجئے یا اپنے ارادے سے مطلع کیجئے، ورنہ دوسرا پرچہ بذریعہ وی پی بھیجا جائیگا اور یہ آپکا اخلاقی فرض ہوگا، کہ آپ وی پی وصول فرماکر دفتر کو زحمت سے بچائیں۔ (۴) اگر آپکو "انوار" کے ادارے یا دفتر سے کوئی شکایت ہو تو ہمیں اس سے آگاہ کیجئے، ہم اس تنقید کو خوشی گوارا کریں گے، اور ہر جائز اصلاح کے لئے تیار رہیں گے۔ ان چار نقاط پر اگر باقاعدگی سے عمل ہونے لگے تو انشاء اللہ تم آپکا یہ جریدہ روز بروز ترقی کرے گا اور اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگا۔

منیجر

سرسری نظر میں

از ——— مدیر

اس اشاعت کی سب سے اہم چیز "حلقۂ ادب اسلامی" کی روداد ہے۔ یوں تو اس قسم کی ادبی رودادیں غیر اسلامی ادب کے بارے میں آئے دن شائع ہوتی رہتی ہیں، مگر جہاں تک اسلامی انقلابی ادب کا تعلق ہے، یہ روداد اپنی طوالت، اور جامعیت کے اعتبار سے پہلی ..... ہے، لیکن یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے، کہ یہ صرف ایک حلقہ کی یعنے حیدرآباد کی مقامی کاوشوں کی روداد ہے، ورنہ اسلامی اصولوں پر ادب میں ایک نئے انقلابی اقدام کے لئے جو کچھ ہو رہا ہے، وہ اس سے بہت وسیع اور ہمہ گیر ہے، تاہم اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے، کہ جو کچھ وسیع پیمانہ پر ہندوستان اور پاکستان میں ہو رہا ہے، اور ان ممالک کی مختلف زبانوں ہندی، مرہٹی، تلگو، تامل، ملیالم، سندھی، عربی، اردو اور انگریزی میں ہو رہا ہے، اس کا ایک سرسری سا اندازہ اس روداد کو دیکھنے سے ہو سکتا ہے۔ اس وقت موجودہ زمانہ کا غیر اسلامی ادب یا اسلام کی اصطلاح میں جاہلی ادب اپنی عمر کا ایک حصہ گذار کر دوسرے حصہ میں قدم رکھ رہا ہے، لوگ کہتے ہیں، یہ دوسرا حصہ بھی ایک ارتقائی قدم ہے لیکن ہمارا خیال ہے، کہ جدید جاہلی ادب کا شباب ڈھل چکا ہے، اور اس کی رنگینیاں اور دلچسپیاں اپنا اثر کھوتی جا رہی ہیں، اور اس کا سبب یہ ہے کہ خود وقت کا جاہلی نظام اپنی کمر میں درد محسوس کر رہا ہے، اور اس کی ریڑھ کی ہڈی عنقریب ٹوٹنے والی ہے، چنانچہ جیسے ہی اس نظام کی کمر ٹوٹے گی، یہ منہ کے بل زمین پر آ رہے گا، اور پھر کہنیوں سے گھسٹتا ہوا چلتا رہے گا، زبان سے مٹی کو چاٹے گا، اور پلکوں سے راستہ صاف کرے گا، لیکن اس کا بھاری بے ڈھنگا جسم ایک انچ بھی اپنی جگہ سے نہ ہلے گا، اس وقت جاہلیت کے مناروں پر سے "انقلاب زندہ باد" کے نعرے چاہے وہ سرخ انقلاب کے ہوں یا پیلے انقلاب کے سب زندہ درگور ہو جائیں گے، ان لوگوں کی آوازیں بیٹھ جائیں گی اور حلق بھر جائیں گے، اور ان کی زبانیں سوکھ کر کانٹا بن جائیں گی، اور ڈھانچے سوکھے اور کھوکھلے ڈھانچے نئے طوفانوں میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں گے، جاہلی انقلاب پسندوں کو یہ دور ابھی نظر نہیں آ رہا ہے، لیکن جس سسٹم کے مطابق اس وقت سرمایہ داری اور جاگیرداری کو کچھ عجب نہیں ویسا ہی ایک سسٹم بدل کر موجودہ انقلاب کے پیچھے سے چلا آ رہا ہے، اور وہ بھی اسی طرح اس کو جیسا کہ یہ رکھ دے گا، خود خطروں کی گھنٹیاں ساتھ ساتھ بج رہی ہیں، لیکن بعض خود پسندوں کو اپنی موت کی گھنٹی ابھی ایک سریلا نغمہ معلوم ہو رہی ہے، خیر وقت کے تھپیڑے جب ان کو بھی اڑا لے جانے کی کوشش کریں گے، تو ...... حقیقت خود بخود بے نقاب ہو جائے گی مگر شاید یہ بعد از وقت، کیونکہ اس وقت حق کی طرف لوٹنے پھر آنے کا دروازہ بند ہو چکا ہوگا۔

"حلقۂ ادب اسلامی" کی روداد جیسی کچھ ہے آپ کے سامنے ہے، اس میں کوئی بات تصنع کی خاطر نہ بڑھائی گئی ہے نہ گھٹائی گئی ہے، حیدرآباد میں جتنی اور جیسی صلاحیت کے اسلامی ادبی کارکن ہیں، سب کے سب سامنے ہیں، لیکن ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں، کہ سالانہ اجتماع کے بعد سے اس قسم کے کارکنوں میں معتد بہ اضافہ ہوا ہے، اور ان کا معیار تحریر بھی بلند ہو رہا ہے، مشکل یہ ہے، کہ اس نئے راستہ پر چلنے والے خود بھی نئے ہیں، قدیم قلم کار یا تو افراط کی منزلوں میں حیران و سرگرداں ہیں، یا تفریط کے گوشوں میں پنہاں، یہ اعتدال کا راستہ، وہ صراط مستقیم انہیں پسند ہی کہاں ہے۔ لیکن اتنا اندازہ سبھی کر سکتے ہیں، کہ یہ آج کل کے بچے "کس تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں، کم از کم اتنی تیزی سے جتنی تیزی کا خود آج کل کے پختہ مشق اپنے ابتدائی زمانہ میں تصور بھی نہ کر سکتے تھے، بہرحال رفتار کی رفتار ہی پیمانہ ہے۔

"روداد" میں جب کہ اسے دوبارہ اشاعت کے لئے مرتب کیا جانے لگا، تو کچھ ایسی تبدیلیاں کرنی پڑیں جو اس وقت جلدی میں نہ ہو سکی تھیں، مثلاً معتمد حلقہ کی سالانہ رپورٹ میں ایک معتد بہ اضافہ کیا گیا، جو سہواً چھوٹ گیا تھا، حالانکہ واقعہ کے اعتبار سے وہ رپورٹ کا اہم ترین جز تھا، اسی طرح ناظم حلقہ کی تعارفی تقریر اجتماع کی کارروائی کے دوران میں لکھی نہ جا سکی، بلکہ اسے بعد میں قلمبند کیا گیا، جس کی وجہ جگہ جگہ الفاظ اور جملے بدل گئے ہیں، تاہم کوشش یہی کی گئی ہے، کہ وہی انداز اور وہی طرز برقرار رکھا جائے، جو تقریر کا تھا، اور اگر کوئی فرق ہو بھی تو وہ صرف الفاظ کی ظاہری شکل میں ہو نہ کہ اصلی معنی میں، کیونکہ ع "الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا" ۔

"تجاویز اور تبادلہ" کا معاملہ بھی ایسا ہی رہا، یعنے انہیں بھی بعد کو قلم بند کیا گیا، پھر صدارتی تقریر تو بار بار کی کوششوں کے باوجود جناب صدر سے لکھوائی نہ جا سکی، اس لئے انہی کے انداز بیان اور طرز گفتگو کے مطابق "حافظہ" کے "قلم اور یاد" کی روشنائی سے دوبارہ صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دی گئی، جس کی وجہ سے وہ بہت زیادہ مختصر ہو گئی ہے، معلوم نہیں حضرت ابن ندیم وفا کو اس اختصار سے شکایت ہے، یا وہ "کلام وہی اچھا جو مختصر ہو" والے مقولہ کی بنا پر اتنا ہمیں کو شاباش کہیں گے، بہرحال جو کچھ ہے، حاضر خدمت ہے۔

روداد کے علاوہ دوسرا قابل غور حصہ "لمعات" کا ہے، اس میں اس وقت کے بدلتے ہوئے حالات پر اور آنے والے دور پر اور پھر اس کے بعد آنے والے زمانہ پر ایک سیر حاصل تبصرہ ہے، ہم ملک کے اہل فکر اصحاب کو اس پر غور و خوض کی دعوت دیتے ہیں، اور ان سے پوچھتے ہیں، کہ اگر یہ سب کچھ ٹھیک ہے، تو پھر وہ کیوں نہیں، اپنے غلط طریقوں سے باز آتے، اور کیوں نہیں، اپنے جمود ذہنی

لمعات

آنے والا طوفان!

اس وقت ساری دنیا میں ایک نئے طوفان کی تیاریاں ہو رہی ہیں، گذشتہ زمانہ میں عالمگیر جنگوں اور قحط و وبا کی شکل میں کئی ہیبت ناک طوفان آتے رہے ہیں، اور ان طوفانوں کی زد میں آکر تہذیب انسانی کی کشتی کئی بار ہچکولے کھا چکی ہے، لیکن آنے والے طوفان کی نوعیت ان پچھلے طوفانوں سے بالکل مختلف ہے، اس ہنگامہ میں کوئی عالمگیر جنگ ہو یا نہ ہو، اور قحط و وبا کی مصیبتیں نازل ہوں یا نہ ہوں، ہر صورت میں ایک مہیب تباہی اور خوفناک بربادی کے سیلاب میں انسانیت کو غوطہ لگانا پڑے گا، تہذیب تمدن کے ایوانوں کو زمیں بوس ہونا پڑے گا، اور زندگی کی کشتی کو نہ صرف ہچکولے ہی لگیں گے، بلکہ ہچکولے کھا کھا کر اس کا تہ آب ہو جانا بھی یقینی نظر آرہا ہے۔

یہ طوفان دراصل ایک ہمہ گیر تہذیبی اور تمدنی بحران ہوگا، جس میں موجودہ تہذیب کے وہ تمام عناصر بکھر جائیں گے، جن سے یہ تہذیب مرکب ہے، اس میں موجودہ عہد کے وہ تمام انسانی عقائد جن کے بل بوتے پر آج کے مذہب پرست جی رہے ہیں، خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں گے، انفرادی مذہبیت، جس کے ڈھول خانقاہوں، گرجاؤں، مسجدوں اور مندروں کی چار دیواری کے اندر بڑے زور شور سے پیٹے جاتے ہیں، ایک ایک کر کے پھاڑ دیئے جائیں گے۔ آنے والے زمانہ میں ایسے "خدا" کو ماننے کے لئے کوئی تیار نہ ہوگا، جو صرف مسجد کے اندر خدا ہو، گھر کے اندر خدا ہو، یا پھر چند فردی معاملات و رسومات کی حد تک خدا ہو، لیکن زندگی کے اہم سیاسی، معاشی اور کاروباری مسائل میں خدا کی خدائی کا کوئی دخل نہ ہو، وہ اس کے لئے کوئی ضابطۂ حیات بنا کر نہ دیتا ہو، بلکہ صرف عرش پر بیٹھا دعائیں اور وظیفوں کی لوگوں کو تلقین کرتا ہو آنے والا بحران ان تمام غلط اور جھوٹے عقائد کے ایک ایک نقش کو مٹائے گا، ایک ایک بند کو توڑے گا اور اس کے ایک ایک ابھار کو مسطح اور ہموار کر کے روندتا ہوا، بے نیاز بنائے گا، پھر جس طرح یہ غلط نظریات اور غلط عقائد پامال ہوں گے، اسی طرح وہ مذہبی طبقے، جو مولوی، پنڈت، ملا، گرو جی، لاٹ صاحب، اور پیر صاحب بنے ہوئے اپنی اپنی چار دیواریوں میں بیٹھے بے تاج کی بادشاہت کر رہے ہیں، قابل گردن زدنی قرار دئے جائیں گے۔ اس وقت ان لوگوں کی ایک نہ چلے گی، بلکہ ان کے سامنے پٹائے خالی کر دیئے جائیں گے، ایسے لوگ جو خدا کی آڑ میں اپنا حکم چلایا کرتے تھے، اور خدا کا نام لے کر اپنا کام بنایا کرتے تھے، سب کے سب پیٹ کے بل رینگنے پر مجبور کر دئے جائیں گے، اور ان کو زمانہ کا بے درد ہاتھ ہر طرف سے کھینچ لے گا، یا تو جانوروں سے بھی ان کی اہمیت کم رہ جائے گی، یہ ہر جگہ ذلیل و خوار ہوں گے، ان کو ملک بدر اور شہر بدر کیا جائے گا، تباہی لانے والے غول ان کا پیچھا کر کر کے... ان کے سر تن سے جدا کر دیں گے۔ ان کی "روحانی حکمرانی" کا تخت اس وقت ان کے لئے تختۂ دار ثابت ہوگا، اور ہر لمحہ اس بات کا امکان پیدا ہو جائے گا، کہ اسے تحت الثریٰ تک دھنسا دیا جائے، لوگ ان تمام ذہنی بندھنوں کو توڑ توڑ کر نکلیں گے، جو اخلاق کے نام سے یا مذہب کے نام سے آج ان کی زندگی کے ساتھ چپکے ہوئے ہیں، مگر ان کی رات دن کی مشکلات کے لئے ان کے پاس کوئی اصولی حل موجود نہیں ہے، ایسے بے کار بوجھ کو خواہ مخواہ اٹھائے پھرنے کے بجائے وہ آئندہ اسے زمین پر دے مارنا، اور کچل کچل کر اس کو ملیا میٹ کر دینا ہی پسند کریں گے۔ اور اس کے بعد جس شخص کے دل میں جو آئے گا، وہی کرے گا، اپنے نفس کی پیروی میں جتنا ننگا ہو کر ناچ سکتا ہے، ناچے گا، جتنا بے ہودہ اور غلط کام ممکن ہو، وہ کرے گا، جتنا نیچے اتر سکتا ہے، اترے گا، اور جتنا کمینہ بن سکتا ہے بن جائے گا

جس قدر درندگی، وحشت اور بربریت کو اپنے جسم میں سمو سکتا ہے سمولے گا، گمراہی اور بدراہی کی جتنی مقدار ممکن ہوگی نگل جائے گا، جتنی عورتوں کی عصمت لوٹ سکتا ہے، لوٹے گا، جتنے انسانوں کو قتل کر سکتا ہے، کرے گا، جتنے گھر اجاڑ سکتا ہے اُجاڑیگا جتنی آگ لگائی جاسکتی ہے، لگائے گا، لیکن ـ ـ ـ ـ وہ ہرگز اس "جاہلی مذہب" اور فرسودہ نظام کے عقائد کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوگا جو آج ہر طرف اس کی زندگی کے ساتھ جونک کی طرح چمٹا ہوا ہے، وہ اس جونک کو جھٹک کر ہی رہے گا۔

اسی طرح موجودہ اونچ نیچ والی معاشرت جس میں اعلےٰ خاندانوں کا بُت پُجتا ہے، جس میں شریف صرف مالدار کو سمجھا جاتا ہے، جس میں عزت والا وہ ہوتا ہے جس کے پاس بڑا عہدہ ہو، کرسی ہو، جس میں قدم قدم پر "تہذیب" کے نام پر جھوٹے تکلفات ہیں، "ہمدردی" کے نام پر کھوکھلی رسمیں ہیں، سچائی کے نام پر جھوٹ اور مکر و فریب ہے، اخلاق کے نام پر چاپلوسی اور انتہائی بداخلاقی ہے، جہاں شرافت و نجابت کی چادروں میں فحش، بے حیائی اور بدکاری کی گندگی لپٹی ہوئی ہے، جہاں حسنِ معاملت کی رُوح خود غرضی ہے، جس جگہ ملازمت اور چاکری، بندگی اور عبادت ہے، دوست اور دوست کا رشتہ ایک غرض مندانہ معاہدہ کے سوا اور کچھ نہیں، جہاں عزیز و اقارب سے محبت اور سلوک صرف کام نکالنے کی خاطر رہ گیا ہے، جس میں شادی بیاہ صرف ہوس رانی کا ایک مہذب طریقہ ہے جس کے میاں، بیوی، بہن، بھائی، ماں باپ اور رشتہ دار چند غرضی مجبوریوں کی خاطر ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں، جس کے عوام محض قانون کے ڈر اور حکومت کی سنگین کے خوف سے چوری، ڈاکہ، لوٹ مار، عصمت دری، اور کھلے بندوں عیاشی سے پرہیز کر سکتے ہیں، جس میں عورتیں صرف سماجی پابندیوں سے پاکدامن ہیں، ورنہ وہ رسم و رواج کے بندھنوں کو توڑ کر کھل کھیلنے کے لئے آمادہ ہیں، غرضیکہ وہ معاشرت جس کی نس نس میں دورنگی اور دوغلاپن لبا ہوا ہے، آنے والے دور میں ایک راہ میں پڑی ہوئی ٹھیکری کی طرح کچل دی جائے گی، یا لوگ اسے ٹھوکر مار کر دھکیل دیں گے، اور پھر جو کچھ ہوگا، وہ دوغلے پن، مکر و فریب اور دکھاوے کی لاگ لپیٹ کے بغیر ہوگا، دورنگی کی پردوں اور چار دیواریوں کے باہر علے الاعلان اور ڈنکے کی چوٹ ہوگا، بُرائی، بُرائی کے نام ہی سے کی جائے گی، بے حیائی، بے حیائی کو اچھا سمجھ کر برتی جائے گی، چوری، چوری کا اعلان کرکے کی جائے گی، زنا، زنا کے باقاعدہ مظاہرے کے ساتھ ہوگا، قتل قتل ہی کے نام اور پروپگنڈے کے ساتھ کیا جائے گا، اُس وقت ظالم کا ہاتھ کوئی نہیں پکڑ سکے گا، نہ کوئی جھوٹی تہذیب اور جھوٹے اخلاق کا ضابطہ، اور نہ کوئی دوسرا بڑا ظالم، کیونکہ سب امتیازات ختم کر دیئے جائیں گے، سب ایک ہی کشتی کے سوار ہوں گے، اور سب کا یہ متحدہ فیصلہ ہوگا، کہ کشتی بہرحال ڈوبنا چاہیئے، اس لئے جس کے من میں جدھر آئے گا، چھید کریگا۔

پھر یہی حال سیاسی زندگی کا بھی ہوگا، آج جو پارٹیاں اپنی کثرت تعداد اور اکثریت کی تائید کے بل بوتے پر پھولے نہیں سماتیں، کل ان کی یہی پیاری اکثریت ان کی دھجیاں بکھیر دیگی، ان کے نصب العین اور مقاصد سے عوام کی ہمدردیاں اُٹھ جائیں گی، ان کے لیڈروں کی لیڈری اور رہنماؤں کی سربراہ کاری رد کر دی جائیگی اور عوام کے مشتعل ہجوم نہ صرف ان کی لیڈرشپ کے مخالف ہو جائیں گے، بلکہ ان کی جان تک کے لاگو ہوں گے، یہ لوگ جہاں ملیں گے، ان کو مارنے کی کوشش کیجائیگی جس جگہ چھپیں گے وہاں سے ڈھونڈ کر نکالے جائیں گے، اور سرِ راہ ذلیل و خوار ہو کر "مسولینی" کے انجام سے ہمکنار ہوں گے، خود ان لیڈروں اور سربراہ کاروں کے درمیان بھی زبردست اختلافات ابھر آئیں گے، ان میں نپی اپنی اغراض کی خاطر اپنی اپنی سربلندی کی خاطر شدید دشمنی پیدا ہو جائے گی، اور یہ لوگ ایک دوسرے کی دشمنی میں عوام کو خوب بھڑکائیں گے، خوب مشتعل کریں گے، لیکن ان کی لگائی ہوئی اور بھڑکائی ہوئی اس آگ میں خود انہی کی عزت و بڑائی کے ایوان جل کر خاکستر ہو جائیں گے، پھر یہ تو سیاسی پارٹیوں کا حال ہوا، آج کل کی حکومتوں کا حال تو اس سے بھی بدتر ہوگا۔ عوام کے مشتعل گروہ علے الاعلان قانون توڑیں گے، بہ بانگِ دہل حکومت کے خلاف نعرے لگائیں گے، حکومت کے باوردی سپاہیوں کو پکڑ کر پیٹیں گے، اس کے ججوں کی تذلیل کریں گے، اس کے احکامات اور سمن

پیروں تلے روندے جائیں گے، اور حکومت میں اتنا یارا بھی نہ ہوگا، کہ ان کا بال تک بیکا کر سکے، اس وقت ایک سچا "عوامی راج" قائم ہو جائے گا، ہاں وہی عوامی راج جس کے لئے دنیا برسوں سے کوشاں تھی، جس کے لئے بڑی بڑی سیاسی پارٹیوں نے ایک دوسرے کے خلاف دستوری اور غیر دستوری جنگیں لڑی تھیں، جس کے لئے اقلیتوں کو کچلا اور روندا گیا تھا، اور بالآخر ملکوں کے نظام حکومت پر قابو حاصل کیا گیا تھا لیکن جب یہ عوامی راج پوری طرح قائم ہو جائے گا، تو عوام کے اس نقارخانہ میں حکومت کی کمزور طوطی کی چیخ و پکار کوئی بھی نہیں سنے گا، عوام میں کا ہر فرد راجہ ہوگا، یہ جا تو حکومت ہوگی، وہ حکومت کی کرسیوں پر بیٹھنے والوں کو گھسیٹ کر لائے گا، اور اپنی خواہشات کے مطابق ان سے کام لے گا، اور اگر وہ اس کا کام کرنے سے ذرا بھی ہچکچائیں گے، تو ان کو اپنے سامنے ناک رگڑنے پر مجبور کر دے گا، الغرض یہ ایک انتہائی نراج، لاقانونیت، اور افراتفری کا دور ہوگا، اس خلفشار اور انتشار میں، حکومت، راعی رعایا، پرجا، قانون، دستور، مجلس دستور ساز، ایوانِ بالا، ایوانِ زیریں، پولس، فوج، عدالت، قانونی چارہ جوئی، وکالت اور موکل یہ سب چیزیں دیوانوں کی بڑ اور مجزوبوں کی واویلا سے تعبیر کی جائیں گی، ان کا نام لینے والا پاگل، بے وقوف اور بزدل سمجھا جائے گا، زیادہ تر لوگ اپنے من کے آپ مالک ہوں گے، خود ہی بندے اور خود ہی خدا ہوں گے، ان پر کسی انسان کی حکمرانی نہ چل سکے گی۔

معیشت اور کاروبار کے دائرے میں بھی سارے کھیل کھیلے جائیں گے، چوٹی کے سرمایہ داروں کو خوب دل کھول کر لوٹا جائے گا، ان کی تجوریاں خالی جائیں گی، ان کی بہو بیٹیاں بھی اڑائی جائیں گی، ان کے کارخانوں میں ہڑتال ہوگی، ان کے جہازوں اور بندرگاہوں پر بغاوت ہوگی، اور دھمکیوں کے نوٹس تو عام ہو جائیں گے، بڑے بڑے اجارہ داروں اور مل مالکوں کے خلاف عوام آگ بگولا ہوں گے، اور ہر آن انکو ملیامیٹ کر دینے کے منصوبے باندھتے رہیں گے، اور پھر خوب دھڑلے سے چھینا جھپٹی اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہو جائے گا، زمینداروں کے کوٹھے جلائے جائیں گے، ان کے مکانوں اور تہہ خانوں کو کھود کر پھینک دیا جائے گا، اور ان کی عورتیں کسان کی لاٹھی کے رحم و کرم پر اس کے آگے چوہیا سی بنی بیٹھی رہیں گی، افراط زر کی مشکل یک لخت ختم ہو جائیگی، اس وقت تو "بارٹر سسٹم" چلے گا، ہر شخص جس کے ہاتھ میں لاٹھی ہوگی، تلوار ہوگی، تیزاب کی بوتل ہوگی، بم ہوگا، بڑی آسانی سے جب چاہے گا، جہاں سے چاہے گا، ضرورت کی ایک ایک چیز فراہم کرے گا، جس سے طرح طرح کے معاشی "فائدے" ہونگے بنکوں اور بنیوں کی سود خواری تو اول روز ہی ختم ہو جائے گی، کیونکہ مقروضوں کے غول ان کی تجوریوں سے سود مع اصل کے غائب کر دیں گے، ٹھیکہ دار پیشگی رقم دیکر لیبر فراہم کریں گے، مگر لیبر مع پیشگی اور پیشگی دلانے والے ضمانت دار کے چمپت ہو جائے گا، اس وقت آج کے دولتمندوں اور روپے کے انباروں پر بیٹھ کر انسانوں پر خدائی کرنے والوں کا ایک ایک کھوٹ زمانہ کے بے درد ہاتھوں سے دور کر دیا جائے گا، بلکہ اس کھوٹ کے ساتھ ساتھ خود ان کو بھی کھاٹ پر ڈال دیا جائے گا، اور ان کے دم توڑتے وقت کوئی اشلوک پڑھنے والا اور دعائیں کرنے والا تک موجود نہ ہوگا،

یہ ہے اس طوفان کا مختصر سا نقشہ، جس کے آثار اس وقت پوری دنیا کے افق پر نمودار ہو رہے ہیں، اور بڑی تیزی سے طوفانی بادل آگے بڑھ کر چھاتے چلے جا رہے ہیں، اکثر لوگوں کا خیال یہ ہے، کہ اس طوفان و بحران کی پشت پر کمیونسٹوں کا ہاتھ ہے، اور یہ انھیں کی سرگرمیوں کا نتیجہ ہے، کہ آج ہر جگہ انسانی تہذیب آپ اپنے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو گئی ہے، لیکن یہ خیال سراسر غلط ہے، در اصل طوفان خود بخود اٹھ رہا ہے، اور کمیونسٹ اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ تو صرف ابن الوقتی کا مظاہرہ کر رہے ہیں، اور اس تباہی کو اپنے لئے سازگار بنانے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں، ورنہ جہاں تک اس کے اصلی اور بنیادی اسباب کا تعلق ہے، وہ کمیونسٹوں کی کوششوں سے بہت مختلف ہیں، اس تباہی کی تہہ میں تو در اصل وہی نظریات اور تصورات کام کر رہے ہیں، جن پر اس وقت کی پوری تہذیب اور تمدن کا دار و مدار ہے۔

موجودہ تہذیب کا اوّلین اور بنیادی عقیدہ "لادینیت" ہے، اس سے مراد یہ
ہے کہ یا تو یہ دنیا بے خدا ہے، یا یہ کہ اگر خدا ہے تو اس کا تعلق انسان کی اجتماعی اور تمدنی
زندگی سے کچھ نہیں ہے، وہ صرف ایک نجی معاملہ ہے، اور اسے لوگوں کے عقائد
میں یا گرجوں کے گوشوں میں ایک دلہن کی طرح دبک کر بیٹھ رہنا چاہئے، پھر اس تہذیب کا
دوسرا اصول "انسان کی انسان پر حاکمیت اور خدائی" کا ہے، یعنی انسان خود
ہی بادشاہ، قانون ساز، اور فرماں روا آپ ہی بن سکتا ہے، چاہے وہ بادشاہ
کی شکل میں ہو، ڈکٹیٹر کی شکل میں ہو، یا "عوام کی حکومت عوام کے لئے" کے اصول کے مطابق
ہو، ان تمام صورتوں میں انسان پر انسان کی حکمرانی کا اصول ایک مشترکہ قدر ہے پھر
تیسرا نظریہ "بے مقصد زندگی اور بے نتیجہ پیدائش اور موت" کا ہے، یعنی آج
کی سمجھ اس زندگی کو بے مقصد زندگی سمجھتی ہے، اور موت کو بھی ایک بے نتیجہ
موت سمجھتی ہے، وہ اس تصور سے بالکل خالی ہے، کہ انسانوں کا حیوانوں کے مقاصد
سے بلند بھی کوئی مقصد حیات ہو سکتا ہے، اور اس زندگی کے بعد کوئی ایسی زندگی ہے
جس میں اس کو اپنے اعمالِ نیک کی جزا اور اعمالِ بد کی سزا ملنے والی ہے۔

اب غور سے دیکھا جائے تو یہ بات بہت آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ در
اصل ان اصولوں ہی میں یہ خصوصیت موجود ہے کہ انسان ایک دوسرے کے خلاف
آمادۂ پیکار رہے، اور اس تہذیب کی اینٹ سے اینٹ بجا دے، خدا سے انکار کا رویہ
اور اس کو زندگی کے محض ایک گوشے سے متعلق کر دینے کا اصول دراصل انسانوں
کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ جو چاہے کرتے پھریں، نہ
کوئی دیکھنے والا ہے، نہ کوئی حکم دینے والا ہے، بس اپنی مصلحت کی بنا پر جو برائی اور
جو اچھائی چاہو کر سکتے ہو، چنانچہ یہی تصور ساری برائیوں کی جڑ ہے، اور اسی سے
فتنہ و فساد کا وہ سرچشمہ پھوٹتا ہے، جو اب ایک ہمہ گیر طوفان کی شکل میں چھا جانے والا ہے

اسی طرح انسان پر انسان کی حکمرانی کا اصول بھی ایک بہت بڑا سیاسی اور
تمدنی فتنہ ہے، دراصل کوئی انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے اس نظام کو قبول نہیں
کر سکتا، کہ اسی کے جیسا دوسرا انسان اس پر حکومت کرے، لہٰذا وہ اس اصول کے
خلاف بغاوت کرتا ہے، ابتدا میں یہ بغاوت شاہی کے خلاف ہوتی ہے، اور ایسا معلوم
ہوتا ہے، کہ اب انسانی حکمرانی کا جوا اتر گیا، لیکن پھر آمریت کی شکل میں وہ آموجود
ہوتی ہے، یا جمہوریت کا روپ دھار کر ایک پارٹی کی استبدادیت اور عوام پرستی
کے فتنہ کی صورت میں آدھمکتی ہے، اب انسان پھر اس کے خلاف بغاوت کی تیاریاں
کر رہا ہے، اور یہ بغاوت ایک زبردست تباہی کی شکل میں نمودار ہونے والی ہے۔

اسی طرح آخرت کی نتیجہ خیز زندگی کی عدم موجودگی کے تصور کے باعث انسان اس
غلط خیال میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ جو چاہو کرو، جتنے مزے اڑا سکتے ہو، اڑا لو، نہ تو
کوئی پوچھنے والا ہے، اور نہ مرنے کے بعد کچھ حساب و کتاب ہونے والا ہے، اب تک
اس تصور کے نتائج محض ابتدائی شکل یعنی چند افراد یا گروہوں کی دنیا پرستی کی شکل میں سامنے
آتے رہے ہیں، لیکن اب جبکہ سارا انسانی معاشرہ اس کو مجموعی طور پر قبول کر چکا ہے
اس کے ہمہ گیر نتائج سے بھی اس کو دوچار ہونا پڑے گا۔

بہرحال ان بنیادی اسباب کے ہوتے ہوئے یہ خیال کرنا کہ اس خلفشار کی
تہ میں کمیونسٹ یا ایسی ہی دوسری خفیہ جماعتیں کام کر رہی ہیں، نہایت ہی غلط اور
مہمل بات ہے، ہمارا خیال تو یہ ہے، کہ جس طرح جمہوری ممالک اور سامراجی حکومتوں
کو اس جدید العصر تباہی سے دوچار ہونا پڑے گا، اسی طرح خود کمیونسٹ جماعتیں
اور کمیونسٹ حکومتیں بھی اس کی زد میں آجائیں گی، ابتدا میں بہت ممکن ہے،
کمیونسٹ اس سیلاب بلا کی پشت پر کام کر کے اس کو اپنی اغراض کی خاطر استعمال
کرنے میں کامیاب ہو جائیں، لیکن جونہی خود ان کے سمجھدار طبقہ پر یہ چیز روشن ہو جائے گی
کہ جو طوفان پردہ پر نمودار ہوا ہے اس نے دوسری حکومتوں کی اینٹ سے اینٹ بجائی ہے، دوسروں
کو لوٹا ہے، دوسروں کے خلاف نعرہ ہائے بغاوت بلند کئے ہیں، وہ آستین کے
سانپ اب خود ان کے خلاف بھی اٹھ رہے ہیں، اور بندر کی دوستی رنگ لا رہی ہے،
تو یہ لوگ فوراً اپنی پناہ کے لئے نئے نئے راستوں کے طلبگار ہوں گے، اور اس وقت
ان کی پریشانی ان کے پیش روؤں کی پریشانی سے بھی زیادہ حیران کن ہوگی، بہت ممکن ہے
بعض اصحاب خیال کرتے ہوں کہ ایسے حالات سے فائدہ اٹھا کر اس طوفان کے دوران ہی

۔۔۔ کمیونسٹ اپنی ڈکٹیٹر شپ قائم کرلیں گے، اور ڈکٹیٹر شپ ہی ایسے ہمہ گیر خلفشار کا واحد علاج ہے، لیکن جہاں تک ڈکٹیٹر شپ کا معاملہ ہے، وہ ان حالات میں مفید تو ہوتی ہے، اگر صرف ایک مخصوص ملک اور محدود علاقہ کی حد تک اور وہ بھی کسی خاص شخصیت کی غیر معمولی خصوصیات کی بنا پر، ورنہ آمریت ہر وقت، ہر حالت میں اور ہر زمانہ کے لئے کوئی مستقل علاج نہیں ہے، اور پھر ایسی صورت میں جب کہ تباہی لامحدود ہو، جغرافیائی حد بندیوں اور وقت کی پابندیوں سے آزاد ہو، آخر یہ کس طرح ممکن ہوگا، کہ کوئی ایسی ہمہ گیر ڈکٹیٹر شپ قائم ہوجائے، جس طرح روس میں ہوئی تھی، ہم کمیونسٹ حضرات سے کہیں گے، کہ اگر وہ انقلابی رجحانات رکھتے ہیں، تو شوق سے رکھیں، مگر یہ بھی سوچ لیں کہ کہیں یہ انقلاب کا دھارا خود ان کو بھی نہ بہا لیجائے، انقلاب کے جو اسباب و عوامل اس وقت سامراجی نظام کی تباہی کا سبب بن رہے ہیں، بعینہ وہی اسباب کمیونزم کی تباہی کا موجب بھی ہوسکتے ہیں، وہی لادینیت، وہی انسان پر انسان کی حکمرانی، اور وہی آخرت کی زندگی سے انکار کا عقیدہ جو سرمایہ دارانہ نظام کی جڑ بنیاد ہے کمیونزم کی بھی جڑ بنیاد ہے، بلکہ حقیقت تو یہی ہے، کہ کمیونزم اور سرمایہ داری ایک ہی ماں "مادیت" کی دو اولادیں ہیں، البتہ ایک ذرا پہلے پل کر جوان ہوئی ہے، اور دوسری اب پروان چڑھ رہی ہے، اور پہلی اولاد سے جائیداد چھین کر اس پر خود قابض ہوجانا چاہتی ہے، لہٰذا جس تخریب اور تباہی کی نذر سرمایہ داری ہوگی، اسی کی نذر یہ بھی ہوجائے گی، یہ خیال کہ اس تخریبی طوفان کے بعد کمیونزم چھا جائے گا، اور امن و امان کا ایک نیا دور شروع ہوگا، نہ صرف غلط اور بے سروپا بات ہے، بلکہ اس کی اصلیت دیوانے کے خواب سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔

ہمارے ملک ہندوستان کے سمجھدار لوگوں نے بھی اس طوفان کے آثار کو بڑی اچھی طرح بھانپ لیا ہے، اور وہ اس کے لئے ابھی سے بچاؤ کی تدبیریں کر رہے ہیں لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے، کہ جو تدبیریں اس کے لئے اختیار کی جارہی ہیں، اور نہ صرف انتہائی غلط ہیں، بلکہ اس تباہی کو الٹا خوش آمدید کہنے والی ہیں۔

ذرا غور کیجئے کہ سامنے افق پر طوفانی موجیں تیزی سے ابھر رہی ہوں، اور اس سیلاب بلا میں ہر چیز غرق ہوتی جارہی ہو، ایسی صورت میں اس کو روکنے کا صحیح طریقہ کیا ہوسکتا ہے؟ کیا یہ کہ ہم توپوں، بندوقوں، اور ہتیاروں سے لیس فوجیں لے کر اس کے سامنے کھڑے ہوجائیں؟! اگر واقعی ہم نے یہی کیا، تو وہ دن دور نہیں کہ ہماری ساری فوجیں مع اپنے قیمتی ساز و سامان کے اس طوفان میں غرق ہوجائیں گی، اور ہم دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں گے، یہاں تک کہ طوفان کا پانی خود ہمارے دروازے کی دہلیز سے آلگے گا، آنے والا سیلاب ایک تمدنی اور تہذیبی بحران ہے، اس کو فوجوں اور ہتیاروں سے نہیں روکا جاسکتا۔

اسیطرح کیا اس تباہی کے سیلاب کو روکنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ زمینداری اور جاگیرداری سسٹم کو بدلا جائے، ایک قسم کے لوگوں سے زمینیں لے کر دوسری قسم کے لوگوں کو دے دی جائیں، اور پھر اپنی جگہ یہ اطمینان کرلیا جائے، کہ آنے والی بلا ٹل جائے گی، اگر حقیقت میں ہم یہ غلطی کر رہے ہیں، تو دراصل ہم تنکوں کا سہارا لے رہے ہیں، اور تنکوں سے زبانی محاورے کے طور پر تو سہارا لیا جاسکتا ہے، مگر فی الواقع کوئی تنکا کسی ڈوبنے والے کو بچا تھوڑا ہی سکتا ہے؟ ضرورت ہے، کہ جتنی جلدی ہوسکے ہم ان خام خیالوں اور کوتاہ اندیشیوں کو خیرباد کہدیں، اور اس ہمہ گیر تباہی کا آنکھیں کھول کر جائزہ لیں، اور اس کی مناسبت سے اس کی روک تھام کا کوئی جامع پروگرام بنائیں۔

ہندوستان میں جماعت اسلامی جس غرض کے لئے اٹھی ہے وہ یہی ہے کہ ہم اولاً اپنے ابنائے وطن کو موجودہ تہذیب کے ان نتائج بد سے بچائیں، اور اس کے بعد اس ملک میں ایک مثالی نظام زندگی قائم کرکے پوری دنیا کو امن و سلامتی کا پیغام دیں، ہماری دعوت صاف اور سیدھے الفاظ میں یہ ہے، کہ موجودہ نظام زندگی کی تہہ میں جو اسباب و علل انسانیت کی تباہی اور تخریب کا کام کرتے رہے ہیں، اور اب ہمہ گیر شکل اختیار کرکے ایک خطرناک طوفان کی صورت میں نمودار ہورہے ہیں ان کے مقابلہ کا واحد طریقہ یہ ہے، کہ ہم ان اصولوں کو ترک کردیں، جن پر موجودہ تہذیب قائم ہے، کیونکہ پہلے

بنیاد اور جڑ پر ہی ضرب لگانے کی ضرورت ہے، تاکہ دوسری ذیلی اور فروعی خرابیاں آپ سے آپ مرجھا جائیں، اور برائیوں کا درخت بالآخر سوکھ جائے۔

پھر موجودہ نظریات اور اصولوں کی نفی کے بعد ہم دوسرے صحت مند اصولوں کی طرف جاتے ہیں، ہمارا کہنا ہے، کہ یہ کائنات نہ تو بے خدا ہے، اور نہ اس کا بنانے والا اندھا، بہرا اور گونگا ہے بلکہ اس دنیا اور انسان کو پیدا کر کے ایک بہترین ضابطۂ حیات بھی عطا کیا ہے، جس پر چل کر انسان نہایت ہی خوشگوار اور پر امن زندگی گذار سکے لہٰذا انسانوں کا فرض ہے، کہ وہ اپنے خالق ہی کو اپنا حاکم اور فرمانروا مانیں اور اس کے بھیجے ہوئے منشور (ضابطہ حیات) پر عمل پیرا ہوں، خدا کو محض پوجا پاٹ اور وظیفہ اور اوراد کا "خدا" نہ بنائیں، بلکہ اسے اپنی پوری زندگی پر حکمران سمجھیں اور اس کی ہمہ وقتی اطاعت کریں، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں، کسی کو چاہے، وہ کوئی ہو اس کے مماثل وند نہ دیں، پھر وہ خدا کا نام لے کر اپنے احکام بھی نہ چلائیں، بلکہ صرف اس ضابطہ پر عمل پیرا ہوں جو خدا نے بھیجا ہے، اس کے بعد دوسری بات ہم یہ کہتے ہیں، کہ کسی انسان کو کسی کے اوپر حکمرانی اور فرمانروائی کے حقوق حاصل نہیں ہیں، نہ کسی باہر کی قوم کو ہمارے ملک پر حکمرانی کا حق ہے، اور نہ کسی اندر کے گروہ کو یہ حق ہے، کہ وہ ہمارے ملک کے عوام پر خدا بن کر بیٹھ جائے، اور ان پر حکمرانی اور فرمانروائی کرے، سیدھا اور صاف طریقہ یہ ہے کہ سب انسان انسان ہونے کے اعتبار سے مساوی ہیں، سب ایک ہی نسل آدم سے تعلق رکھتے ہیں، اس لئے سب آپس میں ایک ہی خاندان کے مساوی المرتبہ افراد ہیں، کسی کو کسی پر بڑائی اور فوقیت حاصل نہیں ہے۔ نہ گورے کو کالے پر، نہ عالم کو جاہل پر، نہ اونچی ذات والے کو نیچی ذات والے پر، نہ ہندوستانی کو انگریز پر، نہ انگریز کو ہندوستانی پر، اصلی بڑائی اور اصلی بزرگی تو صرف خدا کا حق ہے، اس لئے اسی کا حق اس کو دیدیا جانا چاہئے، اور انسان اس دنیا میں صرف خدا کا نائب (خلیفہ) بن کر رہے، اگر وہ نیابت کی حدود سے آگے بڑھ کر خدائی کی حدود میں قدم رکھے گا تو غلطی کرے گا، اور اس غلطی کی سزا اس کو بھگتنی پڑے گی۔

پھر تیسری بات یہ ہے، کہ یہ زندگی نہ تو بے مقصد ہے، جیسی جانوروں کی زندگی ہوتی ہے، اور نہ اس زندگی کے اختتام کے بعد ہماری شخصیت فنا ہو جائیگی، بلکہ دنیا میں انسان کا ایک بلند مقصد ہے، اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی اطاعت، اور بندگی، اس کے بتائے ہوئے ضابطہ کے تحت زندگی گذارنا، اور نیکیوں کی اشاعت کرنا، اور برائیوں سے لڑنا، پھر جیسا کہ عقل اور فطرت انسانی کا مطالبہ ہے، کہ مرنے کے بعد ایسا کوئی اخلاقی عالم ہو، جہاں ہر شخص کو اس کے کئے کا پورا پورا اجر مل جائے، کیونکہ دنیا میں کسی کو اس کی برائی اور نیکی کا پورا پورا صلہ نہیں ملتا، اس لئے موت کے بعد میں اس فطری مطالبہ کے مطابق ایک عالم اخلاقی ہے، جہاں ہر شخص کو اس کے کئے کی سزا اور جزا ضرور ملنے والی ہے، اب تھوڑے سے غور و خوض کے بعد اس چیز کو آسانی سمجھا جا سکتا ہے، کہ یہ اصول کس قدر تعمیری، امن پسندانہ، غیر قوم پرستانہ، ہمہ گیر اور بین الانسانی ہیں، ان کی موجودگی میں آخر کیسے وہ مفاسد پروان چڑھ سکتے ہیں جن کو دیکھ کر آج ہم پریشان ہیں اور کوئی تدبیر اصلاح حال کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔

ہم ہندوستان کے تمام باشندوں کو چاہے وہ کسی قوم، کسی ذات، کسی نسل، کسی جماعت اور کسی طبقہ اور گروہ سے تعلق رکھتے ہوں، ان خدا پرستانہ اصولوں کو قبول کر لینے کی دعوت دیتے ہیں، ان اصولوں کی بنیاد پر جو معاشرہ بنے گا، جو سوسائٹی وجود میں آئے گی، جو انقلاب ذہنی برپا ہوگا، وہ یقیناً اس طوفانی دھارے کا رخ پھیر دیگا جس نے اس وقت ہماری راتوں کی نیند اور دن کا چین تک حرام کر دیا ہے، تاریخ گواہ ہے، کہ جب بھی ان اصولوں پر عمل ہوا ہے، اور ان کی بنیاد پر ایک صالح نظام زندگی وجود میں آیا ہے، انسانی سوسائٹی کے وہ مفاسد جو معیشت، سیاست، اخلاق، اور قانون کے مختلف شعبہ جات میں غلط اور باطل اصولوں کی پیروی کی وجہ سے ابھر آئے تھے، بالکل اسی طرح غائب ہو گئے، جس طرح سورج کی روشنی سے فضا کا کہر غائب ہو جاتا ہے، اور اس کی کرنیں شبنم کے ایک ایک قطرہ کو پی جاتی ہیں، آج بھی ہم ایسے ہی ایک خوشگوار تجربہ کی دعوت دیتے ہیں، آنے والے تخریبی انقلاب اور سیلاب بلا کے خلاف یہ ایک تعمیری انقلاب اور مسرتوں کے طوفان کی دعوت ہے، جس پر ہر زبان اور ہر لب کو لبیک کہنا چاہئے!

قرآنی ادب کے جواہر ریزے

گمراہوں کی نفسیات

"___ ہاں! اللہ اس سے ہرگز نہیں شرماتا، کہ مچھر یا اس سے بھی حقیر تر کسی چیز کی تمثیل دے،
جو لوگ حق بات کو قبول کرنے والے ہیں، وہ انہی تمثیلوں کو دیکھ کر جان لیتے ہیں، کہ یہ حق ہے، جو اُن کے رب ہی کی طرف سے آیا ہے۔
اور جو ماننے والے نہیں ہیں، وہ انہیں سن کر کہنے لگتے ہیں، کہ
ایسی تمثیلوں سے اللہ کو کیا سروکار؟
اس طرح اللہ ایک ہی بات سے بہتوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے،
اور بہتوں کو راہِ راست دکھا دیتا ہے۔
اور گمراہی میں وہ انہی کو مبتلا کرتا ہے، جو فاسق ہیں،
جو اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ دیتے ہیں۔
جو ان رابطوں کو کاٹتے ہیں، جنھیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے۔
جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔
اور اس روش سے وہ خود ہی نقصان اٹھانے والے ہیں!
تم اللہ کے ساتھ کفر و بغاوت کا رویہ کیسے اختیار کرتے ہو ___؟!
حالانکہ تم بے جان تھے،
اس نے تم کو زندگی عطا کی!
پھر وہی تمہاری جان سلب کرے گا!
پھر وہی تمہیں دوبارہ زندگی عطا کرے گا!!
پھر اسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے!!! ___

فرقانِ حمید

(بقرہ - ۳)

تفہیم القرآن

(از:-
مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

البقرہ ــــــ رکوع ۲۱ و ۲۲

(اس ترجمانی کا مطالعہ کرتے وقت قرآن مجید کی اصل عبارت کا پڑھنا ضروری ہے)

لوگو! زمین میں جو حلال و پاک چیزیں ہیں، انھیں کھاؤ[1] اور شیطان کے بتائے ہوئے راستوں پر نہ چلو، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے، تمہیں بدی اور فحش کا حکم دیتا ہے، اور یہ سکھاتا ہے، کہ تم اللہ کے نام پر وہ باتیں کہو، جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے، کہ وہ اللہ نے فرمائی ہیں[2]۔

ان سے جب کہو کہ اللہ نے جو احکام نازل کئے ہیں، ان کی پیروی کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقہ کی پیروی کریں گے، جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے[3]۔ اچھا اگر ان کے باپ دادا نے عقل سے کچھ بھی کام نہ لیا ہو، اور راہ راست نہ پائی ہو تو کیا پھر بھی یہ انہی کی پیروی کئے چلے جائیں گے؟ یہ لوگ جنہوں نے خدا کے بتائے ہوئے طریقہ پر چلنے سے انکار کر دیا ہے، ان کی حالت بالکل ایسی ہے، جیسے چرواہا جانوروں کو پکارتا ہے، اور وہ ہانک پکار کی صدا کے سوا کچھ نہیں سنتے[4]۔ یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، ذرا عقل سے کام نہیں لیتے۔

اے ایمان لانے والو! اگر تم حقیقت میں اللہ ہی کی بندگی کرنے والے ہو تو جو پاک چیزیں ہم نے تمہیں بخشی ہیں، انھیں بے تکلف کھاؤ، اور اللہ کا شکر ادا کرو[5]، اللہ کی

---

[1] یعنے کھانے اور پینے کے معاملہ میں جتنی پابندیاں، توہمات اور جاہلانہ رسوم کی بنا پر لگ گئی ہیں، ان سب کو توڑ ڈالو۔

[2] یعنے ان احکام و رسوم اور قیود و حدود کے متعلق یہ کہنا کہ یہ سب مذہبی امور ہیں، جو خدا کی طرف سے تعلیم کئے گئے ہیں، حالانکہ تمہارے پاس کوئی مستند ذریعہ یہ معلوم کرنے کا نہیں ہے کہ وہ واقعی خدا کی طرف سے ہیں، دراصل شیطانی اغوا کا کرشمہ ہے۔

[3] یعنے ان پابندیوں کے لئے کوئی سند اور کوئی حجت اس کے سوا نہیں ہے، کہ باپ دادا سے یونہی چلا آ رہا ہے۔ اور وہ احمق یہ سمجھتے ہیں، کہ کسی طریقہ کی پیروی کے لئے یہ حجت بالکل کافی ہے۔

[4] اس تمثیل کے دو پہلو ہیں، ایک یہ کہ ان لوگوں کی حالت ان بے عقل جانوروں کی سی ہے، جن کے گلّے اپنے چرواہوں کے پیچھے چلے جاتے ہیں، اور بغیر سمجھے بوجھے ان کی صداؤں پر حرکت کرتے ہیں، اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ ان کو دعوت و تبلیغ کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا جانوروں کو پکارا جا رہا ہے، جو فقط آواز سنتے ہیں، مگر کچھ نہیں سمجھتے کہ کہنے والا ان سے کیا کہتا ہے، اللہ تعالیٰ نے الفاظ ایسے جامع استعمال فرمائے ہیں، کہ یہ دونوں پہلو ان کے تحت آ جاتے ہیں۔

[5] یعنے تم اگر اللہ ہی کے فرمان کے پابند ہو چکے ہو تو پھر جاہلیت کے زمانے کی تمام وہ پابندیاں جو پنڈتوں اور پروہتوں نے، ربیوں اور پادریوں نے، جوگیوں اور راہبوں نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

طرف سے کوئی پابندی تم پر ہے، تو وہ یہ ہے، کہ مردار نہ کھاؤ، خون سے اور سور کے گوشت سے پرہیز کرو، اور کوئی ایسی چیز نہ کھاؤ، جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو،[۲] ہاں جو شخص مجبوری کی حالت میں ہو، اور وہ ان میں سے کوئی چیز کھالے، بغیر اس کے کہ وہ قانون شکنی کا ارادہ رکھتا ہو یا ضرورت کی حد سے تجاوز کرے،[۳] تو اس پر کچھ گناہ نہیں، اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

حق یہ ہے، کہ جو لوگ اُن احکام کو چھپاتے ہیں، جو اللہ نے اپنی کتابوں میں نازل کئے ہیں، اور تھوڑے سے دنیوی فائدوں پر انہیں بھینٹ چڑھاتے ہیں، وہ دراصل اپنے پیٹ آگ سے بھر رہے ہیں،[۴] قیامت کے روز اللہ ہرگز ان سے ۔۔۔ بات نہ کرے گا، اور نہ انھیں پاکیزہ ٹھہرائے گا،[۵] بلکہ ان کے لئے تو دردناک سزا مقرر ہے، یہ وہ لوگ ہیں، جنہوں نے ہدایت

(صفحہ ۱۱ کے حاشیہ کا بقیہ) اور تمہارے باپ دادا نے قائم کی تھیں، انھیں توڑ ڈالو، اور جن چیزوں کو اللہ نے حلال کیا ہے، انھیں بغیر کسی کراہت اور رکاوٹ کے کھاؤ پیو، اسی مضمون کی طرف نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیث بھی اشارہ کرتی ہے، جس میں آپ نے فرمایا کہ "مَنْ صَلّٰی صَلٰوتَنَا وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا وَاَكَلَ ذَبِيْحَتَنَا فَذٰلِكَ الْمُسْلِمُ" الخ یعنے جس نے وہی نماز پڑھی جو ہم پڑھتے ہیں، اور اسی قبلہ کی طرف رُخ کیا، جس کی طرف ہم کرتے ہیں، اور ہمارے ذبیحہ کو کھایا وہ مسلمان ہے" اس کا مطلب یہ ہے، کہ نماز پڑھنے اور قبلہ کی طرف رخ کرنے کے باوجود ایک شخص اس وقت تک اسلام میں پوری طرح جذب نہیں ہوتا، جب تک کہ وہ کھانے پینے کے معاملہ میں پچھلی جاہلیت کی پابندیوں کو توڑ نہ دے اور ان توہمات کی بندشوں سے آزاد نہ ہو جائے، جو اہلِ جاہلیت نے قائم کر رکھی تھیں، کیونکہ اس کا ان پابندیوں پر قائم رہنا اس بات کی علامت ہے، کہ ابھی تک اس کی رگ و پے میں جاہلیت کا زہر موجود ہے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۱] اس آیت کا مقصد اُن حرام چیزوں کی فہرست بیان کرنا نہیں ہے، جو شریعتِ الٰہی میں ممنوع ٹھیرائی گئی ہیں، بلکہ جاہلیت کے توہمات کی تردید مقصود ہے، یعنے اُن سے یہ ارشاد ہوتا ہے، کہ تم نے اپنے مذہبی توہمات کی رُو سے جن چیزوں کو ممنوع ٹھیرا رکھا ہے، دراصل وہ ممنوع نہیں ہیں، بلکہ یہ ہیں۔

[۲] اس کا اطلاق اس جانور کے گوشت پر بھی ہوتا ہے، جسے خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، اور اس کھانے پر بھی ہوتا ہے، جو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر بطور نذر کے پکایا جائے، حقیقت یہ ہے، کہ جانور ہو یا غلہ، یا اور کوئی کھانے کی چیز، اس کا مالک دراصل "اللہ" ہے، اور اللہ ہی نے وہ ہم کو عطا کیا ہے، لہٰذا اعترافِ نعمت یا صدقہ یا نذر و نیاز کے طور پر اگر کسی کا نام ان چیزوں پر لیا جاسکتا ہے، تو وہ صرف اللہ ہی کا نام ہے، اس کے سوا کسی دوسرے کا نام لینا یہ معنی رکھتا ہے، کہ ہم خدا کے بجائے یا خدا کے ساتھ اس کی بالاتری بھی تسلیم کر رہے ہیں، اور اس کو بھی منعم سمجھتے ہیں۔

[۳] اس آیت میں حرام چیز کے استعمال کرنے کی اجازت تین شرطوں کے ساتھ دی گئی ہے، ایک یہ کہ واقعی مجبوری کی حالت ہو، مثلاً بھوک یا پیاس سے جان پر بن گئی ہو، یا بیماری کی وجہ سے جان کا خطرہ ہو، اور اس حالت میں حرام چیز کے سوا اور کوئی چیز میسر نہ ہو ۔۔۔ دوسرے یہ کہ خدا کے قانون کو توڑنے کی خواہش دل میں موجود نہ ہو۔ تیسرے یہ کہ ضرورت کی حد سے تجاوز نہ کیا جائے، مثلاً حرام چیز کے چند لقمے یا چند قطرے یا چند گھونٹ اگر جان بچا سکتے ہوں تو ان سے زیادہ اس چیز کا استعمال نہ ہو۔

[۴] مطلب یہ ہے، کہ عام لوگوں میں یہ جتنے غلط توہمات پھیلے ہیں، اور باطل رسموں اور بے جا پابندیوں کی جو نئی نئی شریعتیں بن گئی ہیں، ان سب کی ذمہ داری ان علماء پر ہے، جن کے پاس کتاب الٰہی کا علم تھا، مگر انہوں نے عامۂ خلائق تک اس علم کو نہ پہنچایا، اور جب لوگوں میں غلط طریقے رواج پانے لگے، تو اس وقت بھی وہ ظالم منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہے، بلکہ ان میں سے بہتوں نے خود اپنا فائدہ اسی میں دیکھا، کہ کتاب اللہ کے احکام پر پردہ ہی پڑا رہے۔

(باقی صفحہ ۱۳ پر)

کے بدلے ضلالت خریدی، اور مغفرت کے بدلے عذاب مول لے لیا، کیسا عجیب ہے ان کا حوصلہ، کہ جہنم کا عذاب برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں! یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا کہ اللہ نے تو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق کتاب نازل کی تھی، مگر جن لوگوں نے کتاب میں اختلافات نکالے وہ اپنے جھگڑوں میں حق سے بہت دور نکل گئے۔

نیکی یہ نہیں ہے، کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کرلئے، یا مغرب کی طرف[1]، بلکہ نیکی یہ ہے، کہ آدمی اللہ اور یوم آخر اور ملائکہ اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے، اور اللہ کی محبت میں اپنے دل پسند مال کو رشتہ داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لئے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے، اور زکوٰۃ دے، اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں، تو اُسے وفا کریں، اور تنگی و مصیبت کا وقت آئے، یا حق و باطل کی جنگ ہو، تو اس میں صبر کریں، یہ ہیں راستباز لوگ، اور یہی لوگ متقی ہیں۔

اے ایمان لانے والو! تمہارے لئے قتل کے مقدموں میں قصاص[2] کا حکم لکھ دیا گیا ہے، آزاد آدمی نے قتل کیا ہو، تو اس آزاد ہی سے بدلہ لیا جائے، غلام قاتل ہو تو وہ غلام ہی قتل کیا جائے، اور عورت اس جرم کی مرتکب ہو تو اس عورت ہی سے قصاص لیا جائے[3]، ہاں اگر کسی قاتل کے ساتھ اس کا بھائی کچھ نرمی کرنے کے لئے تیار ہو[4]، تو معروف طریقہ[5]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲) ۵ یہ دراصل ان پیشواؤں کے جھوٹے دعووں کی تردید اور اس غلط فہمی کا رد ہے، جو انہوں نے عام لوگوں میں اپنے متعلق پھیلا رکھی ہے، وہ ہر ممکن طریقہ سے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور لوگ بھی ان کے متعلق ایسا ہی گمان رکھتے ہیں، کہ اُن کی ہستیاں بڑی ہی پاکیزہ اور مقدس ہیں، اور جو ان کا دامن گرفتہ ہو جائے گا اس کی سفارش کرکے وہ اللہ کے ہاں اسے بخشوا لیں گے، جواب میں اللہ فرماتا ہے، کہ ہم انہیں ہرگز منہ نہ لگائیں گے، اور نہ انھیں پاکیزہ قرار دیں گے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱ مشرق اور مغرب کی طرف منہ کرنے کو تو محض بطور تمثیل بیان کیا گیا ہے، ورنہ دراصل مراد یہ ہے، کہ مذہب کی چند ظاہری رسمیں ادا کر دینا، اور صرف ضابطہ کی خانہ پُری کے طور پر چند مقرر مذہبی اعمال انجام دے دینا، اور تقویٰ کی چند معروف شکلوں کا مظاہرہ کر دینا وہ حقیقی نیکی نہیں ہے، جو اللہ کے ہاں وزن اور قدر رکھتی ہے۔

۲ قصاص: بدلہ، یہ کہ آدمی کے ساتھ وہی کیا جائے جو اس نے دوسرے آدمی کے ساتھ کیا، مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے، کہ قاتل نے جس طریقہ سے مقتول کو قتل کیا ہو، اسی طریقہ سے اُسکو قتل کیا جائے، بلکہ مطلب صرف یہ ہے، کہ جان لینے کا فعل جو اس نے مقتول کے ساتھ کیا ہے، وہی اُس کے ساتھ کیا جائے۔

۳ جاہلیت کے زمانہ میں لوگوں کا طریقہ یہ تھا کہ ایک قوم یا قبیلہ کے لوگ اپنے مقتول کے خون کو جتنا قیمتی سمجھتے تھے، اتنی ہی قیمت کا خون اُس خاندان یا قبیلے یا قوم سے لینا چاہتے تھے، جس کے آدمی نے اُسے مارا ہو، محض مقتول کے بدلہ میں قاتل کی جان لے لینے سے ان کا دل ٹھنڈا نہ ہوتا تھا، وہ اپنے ایک آدمی کا بدلہ بیسیوں اور سینکڑوں سے لینا چاہتے تھے، ان کا اگر کوئی معزز آدمی اگر دوسرے گروہ کے ادنیٰ درجہ کے آدمی نے مار دیا ہو، تو وہ اس قاتل کے قتل کو کافی نہیں سمجھتے تھے، بلکہ ان کی خواہش یہ ہوتی تھی، کہ اس گروہ کا بھی کوئی ویسا ہی معزز آدمی مارا جائے، یا اس کے کئی آدمی ان کے مقتول پر سے صدقہ کئے جائیں، برعکس اس کے اگر مقتول ان کی نگاہ میں کوئی ادنیٰ درجہ کا شخص اور قاتل کوئی زیادہ قدر و عزت رکھنے والا شخص ہوتا، تو وہ اس بات کو گوارا نہ کرتے تھے، کہ مقتول کے بدلہ میں قاتل کی جان لی جائے، اور یہ حالت کچھ قدیم جاہلیت ہی میں نہ تھی، موجودہ زمانہ میں جن قوموں کو انتہائی مہذب سمجھا جاتا ہے، ان کے باقاعدہ سرکاری اعلانات تک میں بسا اوقات یہ بات بغیر کسی شرم کے دنیا کو سنائی جاتی ہے، کہ ہمارا ایک آدمی مارا جائے گا تو ہم قاتل کی قوم کے پچاس آدمیوں کی جان لیں گے، اکثر یہ خبر ہمارے کان سنتے ہیں، کہ ایک شخص کے قتل پر مغلوب قوم کے اتنے یرغمال گولی سے اڑائے گئے، اور ایک مہذب قوم نے تو اپنے ایک فرد (سر لی اسٹیک) کے قتل کا بدلہ پوری مصری قوم سے لے کر چھوڑا۔

(باقی صفحہ ۱۴ پر)

کے مطابق خونبہا کا تصفیہ ہونا چاہئے، اور قاتل کو لازم ہے، کہ راستی کے ساتھ خونبہا ادا کرے، یہ تمہارے رب کی طرف سے تخفیف و رحمت ہے اس پر بھی جو زیادتی کرے[۱] اس کے لئے دردناک سزا ہے، عقل و خرد رکھنے والو! تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے[۲]، امید ہے، کہ تم اس قانون کی خلاف ورزی سے پرہیز کرو گے۔

تم پر فرض کیا گیا ہے، کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آئے، اور وہ مال چھوڑ رہا ہو، تو والدین اور رشتہ داروں کے لئے معروف طریقہ سے وصیت کرے، یہ حق ہے متقی لوگوں پر[۳]۔ پھر جنہوں نے وصیت سنی، اور بعد میں اسے بدل ڈالا، تو اس کا گناہ ان بدلنے والوں پر ہوگا، اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے، البتہ جس کو یہ اندیشہ ہو کہ وصیت کرنے والے نے نادانستہ یا قصداً حق تلفی کی ہے، و پھر معاملہ سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان وہ اصلاح کرے، تو اس پر کچھ گناہ نہیں ہے، اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۴۳) دوسری طرف ان نام نہاد مہذب قوموں کی باضابطہ عدالتوں تک کا یہ طرز عمل رہا ہے، کہ حاکم قوم کا فرد اگر قاتل، اور محکوم قوم کا فرد مقتول ہو، تو وہ قصاص کا فیصلہ کرنے سے گریز کرتی ہیں، یہی خرابیاں ہیں جن کے سدباب کا حکم اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دیا ہے، وہ فرماتا ہے کہ مقتول کے بدلے میں قاتل اور صرف قاتل ہی کی جان لی جائے قطع نظر اس سے کہ قاتل کون ہے اور مقتول کون۔

سلہ "بھائی" کا لفظ فرما کر نہایت لطیف طریقہ سے نرمی کی سفارش بھی کر دی، اگرچہ تمہارے اور دوسرے شخص کے درمیان باپ مارے کا بیر ہی سہی، مگر ہے تو وہ تمہارا انسانی بھائی، لہذا اپنے ایک خطا کار بھائی کے مقابلہ میں انتقام کے غصہ کو پی جاؤ تو یہ تمہاری انسانیت کے زیادہ شایانِ شان ہے ۔۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو گیا، کہ اسلامی قانونِ تعزیرات میں قتل تک کا معاملہ قابلِ راضی نامہ ہے، مقتول کے وارثوں کو یہ حق پہنچتا ہے، کہ قاتل کو معاف کر دیں، اور اس صورت میں عدالت کے لئے جائز نہیں کہ قاتل کی جان ہی لینے پر اصرار کرے، البتہ جیسا کہ بعد کی آیت میں ارشاد ہوا، معافی کی صورت میں قاتل کو خونبہا ادا کرنا ہوگا۔

سٹہ "معروف" کا لفظ قرآن میں بکثرت استعمال ہوا ہے، اور اس سے مراد وہ صحیح طریق کار ہے، جس سے بالعموم انسان واقف ہوتے ہیں، اور جس کے متعلق ہر اس شخص کا دل جس کا کوئی ذاتی مفاد کسی خاص پہلو سے وابستہ نہ ہو یہ گواہی دیتا ہے، کہ یہی حق اور انصاف ہے، اور یہی مناسب طریق عمل ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) سلہ یعنی مقتول کا وارث خونبہا وصول کر لینے کے بعد پھر انتقام لینے کی کوشش کرے، یا قاتل خونبہا ادا کرنے میں ٹال مٹول کرے، اور مقتول کے وارث نے جو احسان اس کے ساتھ کیا ہے، اس کا بدلہ احسان فراموشی سے دے۔

سٹہ یہ ایک دوسری جاہلیت کی تردید ہے، جو پہلے بھی بہت سے دماغوں میں موجود تھی اور آج بھی بکثرت پائی جاتی ہے، جس طرح اہل جاہلیت کا ایک گروہ انتقام کے پہلو میں افراط کی طرف چلا گیا، اسی طرح ایک دوسرا گروہ عفو کے پہلو میں تفریط کی طرف گیا ہے، اور اس نے سزائے موت کے خلاف اتنی تبلیغ کی ہے، کہ بہت سے لوگ اس سزا کو نفرت انگیز چیز سمجھنے لگے ہیں اور دنیا کے متعدد ملکوں نے اسے بالکل منسوخ کر دیا ہے، قرآن اسی پر اہل عقل کو مخاطب کر کے تنبیہ کرتا ہے، کہ قصاص میں سوسائٹی کی زندگی ہے، جو سوسائٹی انسانی جان کا احترام کرنا [illegible] سے پناہ دیتی ہے تم ایک قاتل کی جان بچا کر بے گناہ انسانوں کی جانیں خطرہ میں ڈالتے ہو۔

[illegible] کہ اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رکھا جا سکتا ہو، تو [illegible]

(باقی صفحہ ۱۵ پر)

(صفحہ ۱۲ کے حاشیہ کا بقیہ) اس کو چاہیے، کہ ان کے حق میں وصیت کر جائے، اور اپنے وارثوں کو ہدایت کر جائے، کہ فلاں فلاں مستحقین کے ساتھ یہ حسنِ سلوک کیا جائے، مگر یہ وصیت "معروف" طریقہ سے ہونی چاہیے، یعنی ایسے طریقہ سے جس میں کسی کے ساتھ بے انصافی اور کسی کی حق تلفی نہ ہو، جسے دیکھ کر ہر بہ غرض معقول انسان کہدے، کہ یہ ایک مناسب وصیت ہے، جب تک وراثت کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے، اس وقت تک اپنے پس ماندوں میں وراثت کی تقسیم کے متعلق وصیت کرنا بھی مرنے والے ہی کا کام تھا، مگر جب وارثوں کے حقوق اللہ نے مقرر فرما دیئے، تو کسی شخص کو یہ حق باقی نہ رہا، کہ وارثوں کے درمیان حصوں کی تقسیم کے بارے میں کوئی وصیت کر سکے، البتہ وہ اپنے والدین، یا دوسرے عزیزوں کے لئے حسنِ سلوک کی وصیت کر سکتا ہے یا کسی رفاہ عام کے کام میں کچھ صرف کرنے کی ہدایت کر سکتا ہے، حدیث نبوی کی رو سے یہ وصیت زیادہ سے زیادہ ایک تہائی حصہ میں نافذ ہوگی، اس سے زیادہ کی وصیت نافذ نہیں ہوگی۔

"ادبیات نمبر" کے متوقع مضامین!

تنقید

- "ایک خط" ماہر القادری
- "اپنے ادیبوں سے" پرویز ہلالی
- "روما کی ریشہ دوانیاں" عبدالحمید بی اے
- "فانی حقیقت کی تلاش میں سرگرداں" وحیدالدین خان
- "جدید دینی ادب" اصغر علی عابدی

افسانے

- "فیصلہ کن" انور اعظمی
- "کروٹیں" ابن محمود
- "وہ ایک ادیب تھا" کوثر عثمانی
- "یہ کیسے اللہ کے بندے ہیں" رفعت زہرہ

- "یہ اچھے لچھن نہیں" عبدالمنان ہلالی
- "عہد فاروقی کی سنہری یادگار" ابو محمد نوری
- "تگ و تاز" محمود رونق گلشن آبادی
- "نمرود" اصغر عابدی
- "میں ایک افسانہ نگار ہوں" محمود فاروقی
- "غدار کلاس" عبدالفتاح
- "مزدور" شمس الہدیٰ
- "اعادۂ حیات" صادق احمد موسوی

ڈرامے

- "ابراہیم" ابن مختار

- "فساد یا جنگ" حمایت المقیت

منظومات

- "گفت و شنید" عروج قادری
- "بہار" ابو البیان حماد
- "ساقی" حافظ امام الدین رام نگری
- "غزل" انور اعظمی
- "رخِ پسیرا" اصغر عابدی
- "توبہ" [illegible]
- "زندگی ناتمام" حمایت المقیت
- "ساقی نامہ" ابن ندیم وفا

- "نیا سویرا" جمال محمد امین آبادی
- "رفیقۂ حیات سے" تاج العرفان عثمانی
- "یثرب کا باسی" پرویز ہلالی
- "ساز حیات" ضرار محمود ندوی

ادب پارے

- "[illegible]" [illegible] صدیقی
- "[illegible]" سلیم عادل آبادی
- "ہندوستانی ساقی نامہ" ابوالکلام
- "ماضی اور مستقبل" منظور احمد
- "وہ ایک ظالم تھا" حمایت المقیت
- "زندگی" ضرار ندوی

ہندوستان کے خدا پرست ادیبوں کو مژدہ ہو، کہ ان کی قوتِ تحریر کو منظم شکل میں پیش کرنے کے لئے "انوار" کا "ادبیات نمبر" جلد منصۂ شہود پر آرہا ہے، جن فن کاروں کے نام اوپر کی فہرست میں نہیں ہیں وہ جلد از جلد اپنی تخلیقات روانہ کر دیں!

ہم تخریب پسند اور مخرب اخلاق ادب کے خلاف ایک طاقتور محاذ بنانا چاہتے ہیں! ہندوستان کے حق پسند ادیبو متحد ہو جاؤ!

محسوسات

ابوالبیان حماد

اک سرور و انبساط و کیف سا پاتا ہوں میں ! 　　 بارگاہ کبریا میں بار جب پاتا ہوں میں !

بے محابا وسعت کونین پر چھاتا ہوں میں، 　　 جلوہ گاہِ دوست میں آتا ہوں میں جاتا ہوں میں

بزم افسردہ کو پھر اک بار گرماتا ہوں میں 　　 جذبہ ہائے شوقِ بے پروا کو برماتا ہوں میں

عہدِ رفتہ کا حسیں افسانہ دہراتا ہوں میں 　　 مردہ شریانوں میں خون زیست دوڑاتا ہوں میں

اٹھ کر اے ساقی تری محفل سے اب جاتا ہوں میں 　　 پھر یہاں واپس نہ آنے کی قسم کھاتا ہوں میں

میری بربادی پہ کوئی کس لئے آنسو بہائے ؟ 　　 یہ تو خود جرم محبت کی سزا پاتا ہوں میں !

یوں گذرتی ہیں شب غم کی کٹھن تنہائیاں 　　 مجھ کو سمجھاتا ہے دل اور دل کو سمجھاتا ہوں میں

ہو گیا ہے اس قدر مانوس دل آلام سے ! 　　 شدتِ غم میں بھی کیف و سرخوشی پاتا ہوں میں

مجھ کو جانے دے کہیں دنیا کے ہنگاموں سے دور 　　 شورشِ ہستی سے اب اے دوست گھبراتا ہوں میں

چھوٹ جاتی ہے مزاجِ گردشِ دوراں کی نبض، 　　 ایک مرکز پر پہنچ کر جب ٹھہر جاتا ہوں میں

قلبِ مضطر بھی نہیں ہے طفلکِ ناداں سے کم 　　 وہ بہلتا ہی نہیں، گو لاکھ بہلاتا ہوں میں

دیکھنا جذبِ محبت کا کرشمہ دیکھنا ! 　　 خود تڑپتا ہی نہیں ان کو بھی تڑپاتا ہوں میں

ہے زمانہ سے جدا میری متاع خورد و نوش 　　 خونِ دل پیتا ہوں اور لختِ جگر کھاتا ہوں میں

یہ نہیں پروا کہ کیا انجام ہوگا رونما ! 　　 بے خطر باطل کے طوفانوں سے ٹکراتا ہوں میں

دینے والے ! مانگنے والے کی کچھ تو لاج رکھ ! 　　 اب بہت مجبور ہو کر ہاتھ پھیلاتا ہوں میں

میرا دل کش مشغلہ حمد و ثنا شکر و سپاس
ان سے نسبت ہے مجھے حماد کہلاتا ہوں میں

ایجنٹ حضرات ! اپنے ذمہ کی رقوم جلد از جلد روانہ فرما کر دفتر کی مشکلات کو کم کریں، اگر ایجنسی جاری رکھنے کے لئے تیار نہیں، تو فوراً ایک خط کے ذریعہ مطلع کریں !

ادبی تحریکات!

روئیداد حلقۂ ادبِ اسلامی حیدرآباد دکن

(منعقدہ ۸ اپریل ۱۹۴۹ء م ۸ رجمادی الثانی ۱۳۶۸ھ)

پروگرام

۱ - رپورٹ سالانہ		از :- محمود فاروقی (معتمدِ حلقہ)
۲ - تعارفی تقریر		از :- اصغر علی عابدی (ناظم حلقہ)
۳ - "امنِ عالم کا راز"	(نظم)	از :- عبدالباسط مقصد
۴ - "پریمی"	(افسانہ)	از :- محمود فاروقی
۵ - قلبِ مومن خدا کے حضور میں	(ادب پارہ)	از :- خواجہ صفی اللہ
۶ - لوگ کہتے ہیں!	(آزاد نظم)	از :- اصغر علی عابدی
۷ - تجاویز و تبادلۂ خیال		از :- حاضرین
۸ - صدارتی تقریر		از :- ابن ندیم وفا

مقامِ اجتماع : ہائی اسکول انوار العلوم (نام پلی) ——— وقت : بعد نمازِ عشاء (۸½ ساعت شب)

۸ اپریل ۱۹۴۹ء کو عشاء کی نماز کے بعد جب کہ رات بھیگنی شروع ہوگئی تھی، اجتماع کی کارروائی کا آغاز ہوا، اجتماع کی نگرانی حضرت ابن ندیم وفا نے کی، جو اس حلقہ کی نمایاں شخصیت تھے، شرکت کرنے والوں کی تعداد ہماری توقع کے بالکل خلاف کوئی دو سو کے لگ بھگ تھی، آج کل کے زمانہ میں جب کہ ہر طرف خدا ناشناس اور جاہلی ادب کا دور دورہ ہے، خدا پرستانہ ادبی کوششوں کے اس ابتدائی مرحلہ پر اتنے لوگوں کا اس طرف متوجہ ہونا یقیناً ہمارے لئے بہت زیادہ ہمت افزا تھا، اور پھر آنے والے شہر کے تعلیم یافتہ اور سنجیدہ اصحاب تھے، ان میں کالج کے پروفیسر، طلبا، ڈاکٹر، علماء اور دوسرے ادبی اور علمی ذوق رکھنے والے سب ہی شریک تھے،

پروگرام کے مطابق معتمد حلقہ "محمود فاروقی" نے حلقہ ادب اسلامی (حیدرآباد) کی سالانہ رپورٹ سنائی۔ جو درج ذیل ہے :-

رپورٹ حلقۂ ادبِ اسلامی | حمد و ثنا کے بعد ——— دنیا میں اب تک جتنے نظریے اور اصول اپنے وقت کی زندہ تحریک بن کر حیاتِ انسانی پر اثر انداز ہوئے ہیں، ان کی کامیابی میں جہاں ٹھوس علمی کارناموں اور جاندار عملی اسکیموں اور باتدبیر رہنماؤں کا حصہ ہے، وہاں نئے اصولوں کو ہموار کرنے اور زندگی کے قدیم خاکوں کو منہدم کرنے میں تعمیر پسند ادیبوں اور انقلابی قلم کاروں کی خالص ادبی کاوشوں کا بھی بڑا حصہ ہے۔

موجودہ نظامِ زندگی کے خلاف انقلابی جدوجہد میں ادیب کو بعینہٖ وہی کام کرنا پڑتا ہے، جو کسی فوج کا چھاپہ مار دستہ سرانجام دیتا ہے۔۔۔ ادیب آنے والے انقلاب کے لئے فرسودہ اصولوں کی رکاوٹ کو صاف کر کے زمین ہموار کرتا ہے، اور ابھی انقلابی فوجوں کا ہراول زندگی کے دروازہ پر دستک ہی دیتا رہتا ہے، کہ ادیب ذہن کے چور راستوں سے داخل ہو کر دشمن کے علمی اور فکری مورچوں میں کچھ اس طرح ہراسانی اور بے دلی پیدا کر دیتا ہے، کہ دشمن کے سپاہی اصل معرکہ سے پہلے ہی ہتھیار ڈال دیتے ہیں، اور اس انقلابی فتح کے بعد انقلاب کے استقبال میں شاہ دروازے خود بخود کھل جاتے ہیں، اور زندگی پر نئے اصولوں کا پھریرا لہرانے لگتا ہے۔

بہرحال حیاتِ انسانی کے لئے مفید یا غیر مفید جو بھی مقصد اور طریق کار متعین کیا جائے، اُس کو مقبول اور کامیاب بنانے کے لئے ادیب اور قلم کار کی سخت ترین ضرورت پڑتی ہے۔

ہماری دعوت ادیب کی اس اہم ترین ذمہ داری کو سامنے رکھتے ہوئے اس بات کے سمجھنے میں کوئی دقت پیدا نہیں ہوتی کہ اگر ادیب اور قلم کار ایسے مقاصد اور اصولوں کے لئے اپنے سرمایۂ فکر کو وقف کر دیں، جن سے دنیا میں بسنے والے انسانوں کو بجائے فائدہ کے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو ظاہر ہے کہ انسانی معاشرہ میں اتنی خرابیاں رونما ہونگی۔ جس قدر ان غلط مقاصد اور اصولوں میں مضمر ہیں، لیکن انتہائی افسوس کا مقام ہے، کہ اس اہم ترین ذمہ داری کے باوجود ہمارے ملک کے اکثر ادیب اور قلم کار جس طرح آرٹ اور فن کے اعتبار سے دوسرے ممالک سے پیچھے نہیں ہیں، اسی طرح وہ ایسے اصولوں کو پھیلانے میں بھی کسی سے کم نہیں ہیں، جن کو اختیار کر کے ساری انسانیت پے بہ پے غلطیوں میں مبتلا ہو گئی ہے، اور ان کے غلط نتائج کا خمیازہ مسلسل بھگت رہی ہے،

دراصل ہمارے فن کاروں اور ادیبوں نے یورپ کے مادّی نظریات سے متاثر ہو کر زندگی کو سمجھنے اور انسان کی حیثیت کو متعین کرنے میں فاش غلطی کی ہے ———— انہوں نے انسان کے متعلق جو کچھ سمجھا ہے، اس کا تجزیہ کیا جائے، تو حسب ذیل امور واضح ہوتے ہیں:۔

۱۔ انسان کسی مستقل بالذّات شخصیت کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ دوسرے عام جانداروں کی ایک طبعی اور ارتقائی شکل ہے ———— بنا بریں وہ بھی محض ایک حیوان ہے، جس کا مقصدِ زندگی صرف جسمانی ضروریات کی تکمیل تک ہی محدود ہے۔

۲۔ انسان چونکہ خود بخود طبعی عوامل سے وجود میں آگیا ہے، اس لئے اس کی شخصیت کو بنانے میں کسی ایسی ہستی کا ہاتھ نہیں جو کائنات سے ماوراء تخلیق اور تولید پر قدرت رکھنے والی ہو۔

۳۔ موجودہ زندگی کے ختم ہونے کے بعد انسان کی معنویت یکسر ختم ہو جاتی ہے، اور اس کو بعد زندگی کے کسی اور تجربہ سے دوچار ہونا نہیں پڑتا، چنانچہ ان اصولوں کو اپنانے کے بعد ہمارے ادیبوں نے اپنی تحریروں، کہانیوں اور نظموں میں انسان کو جس طرح پیش کیا ہے، اس کے نفسیاتی نتائج یہی مرتب ہوتے ہیں، کہ ہمارے قلم کاروں کا "انسان" اپنے آپکو ایک حیوان سے زیادہ بلند نہیں سمجھ سکتا، اور وہ اپنی خواہشات کو پورا کرنے اور اپنی احتیاجات کی تکمیل کے لئے خود غرضی، نفس پرستی اور مفاد پرستی کا اسی طرح مظاہرہ کرتا ہے، جو جانوروں کے لئے تو ان کی حیوانی جبلت کا لحاظ کرتے ہوئے "حق" تسلیم کیا جا سکتا ہے، لیکن اس خلاصۂ کائنات کے لئے کسی صورت میں "حق" نہیں کہلایا جا سکتا جس کا نام "انسان" ہے۔

پھر انسان یہ محسوس کرنے لگتا ہے، کہ اس کو پیدا کرنے والا کوئی با اختیار خالق نہیں ہے، اس لئے وہ اپنے آپکو خود مختار جان کر اپنی خواہشات کو پورا کرنے اور اپنی مرضی کو چلانے میں مخصوص اصولوں اور متعینہ ذمہ داریوں کا پابند نہیں رہنا چاہتا، اور نہ وہ کسی ایسے حاکم کا تصور کر سکتا ہے، جو انسان کے نظم طبعی کی طرح اس کی اختیاری زندگی پر بھی نگران ہو،

چونکہ وہ موجودہ زندگی کے بعد کسی اور زندگی اور تجربہ کا قائل نہیں، اس لئے یہ ناممکن ہے، کہ وہ اپنے معاملات کو انجام دیتے ہوئے کسی اور زندگی کے فائدوں اور نقصانات کی توقع اور اندیشہ کو پیش نظر رکھے۔

ظاہر ہے، کہ آج دنیا میں معاشی، سیاسی، معاشرتی اور جنسی پریشانیاں مذکرۂ بالا غیر فطری اور مصنوعی قدروں کو قبول کر لینے کی وجہ ہی سے مسلط ہو گئی ہیں اس لئے ان کے انسداد کی صحیح صورت یہی ہو سکتی ہے، کہ "انسان" کے متعلق ان جاہلی تصورات کے خلاف انسانی فطرت سے سازگار حق پسند اور تعمیر پسند اصولوں کو

بہانے کی منظم کوشش کی جائے۔

چنانچہ انسانوں کو نفس پرست، شکم پیدر، اور خود غرض جانور کی بجائے حقیقت پسند اور سمجھ بوجھ والے وجود میں تبدیل کرنے کے لئے ان ادبی کاوشوں کا آغاز عمل میں آیا جن کی اساس قدیم اور جدید جاہلیت کے اصولوں کے علی الرغم خدا پرستانہ اخلاقی قدروں پر ہے ——— لیکن یہ ایک نہایت دشوار کام تھا کہ ملک کے پختہ مشق اور با اثر ادیبوں کی کاوشوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا جائے۔ چنانچہ تحریک اسلامی کا یہ ادبی شعبہ ابھی تک وقت کے مقتدر ادبی نظریوں پر خاطر خواہ اثر نہیں ڈال سکا ہے، تاہم جس قدر اس کا حلقۂ کار تھا، اس میں ادب کی ان نئی قدروں کو روشناس کرانے کے لئے کافی مؤثر کام شروع ہو گیا ہے، اور خدا پر بھروسہ کر کے نئے نئے لکھنے والے میدان میں اتر رہے ہیں، اس وقت اس جدوجہد میں ہندوستان کے مختلف قلم کار اصحاب کا بڑا حصہ ہے، لیکن چونکہ ہمارے پیش نظر صرف حلقۂ حیدرآباد کی حد تک اپنے کام کو پیش کرنا ہے، اس لئے بیرون حیدرآباد سے قطع نظر صرف یہاں کے کام کا ہی جائزہ لیا جائے گا ۔

حلقۂ ادب اسلامی کا قیام! آج سے تقریباً ۹ سال قبل جب ہندوستان میں تحریک اسلامی کا آغاز ہوا، اور ملک کے مختلف گوشوں سے اس صدائے حق کو لبیک کہنے والوں نے اپنے اپنے مقام پر جماعت اسلامی کی نیو رکھی، تو حیدرآباد میں بھی اس کا قیام عمل میں آیا۔ چنانچہ اس وقت سے اب تک یہ کام خدا کے فضل سے روز افزوں ترقی کے ساتھ جاری ہے۔ لیکن تحریک اسلامی کے عمومی کام کے علاوہ یہ بھی ضروری تھا کہ اس کی وسعت اور ہمہ گیری کے پیش نظر مخصوص شعبہ جات میں بھی کام کا آغاز کر دیا جائے، اسی غرض کے لئے خالص اسلامی بنیادوں پر ایک جدید ادبی کام کی ابتدا کی گئی، جو کہ عمومی کام کی تائید کے لئے نہایت اہم ضروری شعبہ کا تھا۔ اس مطلوبہ جدوجہد کو منظم طور پر شروع کرنے کے لئے مولوی محمد یونس صاحب قیم جماعت اسلامی (حیدرآباد) کی تحریک پر حیدرآباد کے چند ادبی ذوق رکھنے والے کارکنوں نے "حلقۂ ادب اسلامی" کے نام سے ۱۱؍ شہریور ۵۵ف (۱۲؍ جولائی ۴۶ء) کو ایک ادبی ادارہ قائم کیا، جس کے ناظم مولوی اصغر علی صاحب عابدی مدیر ماہنامہ "النواۃ" اور معتمد طٰہٰ صدیقی صاحب منتخب کئے گئے، لیکن طٰہٰ صدیقی صاحب کے حیدرآباد سے چلے جانے کے بعد یہ کام راقم الحروف (محمود فاروقی) کے ذمہ ہو گیا، چونکہ اس ادارہ کو پختہ مشق لکھنے والوں کا تعاون حاصل نہیں ہو سکا، اس لئے اس کا کام بڑی حد تک ایسے ادیبوں کو تیار کرنے اور ان کی صلاحیتوں کو تہذیب دینے تک محدود رہا، جو اصلاحی انقلاب کے حامی ہوں، تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو بھی کام اس بے بضاعتی اور کم مائیگی کے ساتھ کیا گیا وہ اپنے مقاصد کے اعتبار سے کافی مفید ثابت ہوا، اور اس کام کی مختصر روداد آپ کے سامنے ہے، جو گذشتہ دس ماہ کی قلیل مدت میں انجام پایا ہے۔

ہمارا طریق کار! اجتماع اول میں ناظم حلقہ و معتمد کے انتخاب کے بعد ہی طریقہ کار اور پروگرام کے بارے میں طے کیا گیا کہ:۔

۱۔ اس حلقہ کے اجتماعات ماہ میں دو بار ہوا کریں گے، اور اس کے لئے مختلف تاریخوں کے بجائے مخصوص دن یعنی جمعہ مقرر کیا گیا۔

۲۔ حلقہ کے لئے ایک ادبی "لائبریری" کی اسکیم بھی زیر غور رہی۔ جس کے قیام کے لئے رفقاء حلقہ کو اعزازی طور پر اپنی ایسی کتابیں جمع کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی۔ جو ادب کی اصلاح و ترقی کے لئے مفید ہوں، نیز یہ بھی طے ہوا کہ جو اصحاب رقمی امداد کرنا چاہیں وہ کر سکتے ہیں۔

۳۔ حلقے میں شمولیت کے لئے ضروری قرار دیا گیا.... کہ "کارکن" کی علمی قابلیت میٹرکولیشن یا اس کے مماثل ہو، اور وہ اسلامی ذوق رکھتا ہو۔

۴۔ یہ بھی طے پایا کہ کبھی کبھی بہترین ادبی کاوشوں کو زیر مطالعہ لایا جائے گا، تاکہ ارکان حلقہ کو غذا حاصل ہو، اور وہ اپنے کام کو دوسروں کے مقابلے میں رکھ کر اس کا جائزہ لے سکیں۔

۵۔ اس حلقہ کی دعوت کو دوسرے ادیبوں تک پہنچایا جائے گا، اور انہیں اس جدید اسلامی ادب کی طرف متوجہ کیا جائے گا۔

۲- ایسے ادبی نوشتے اور قلمی کاوشیں جو قابلِ اشاعت ہونگی، انہیں تحریکِ اسلامی کے مختلف جرائد اور دوسرے جرائد میں بغرضِ اشاعت روانہ کیا جائے گا۔

ان تحریکات کے علاوہ اس کام کے لئے عام تیاری کے بارے میں ناظمِ حلقہ نے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا، اور رفقاء کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:-

"ہمارے سامنے اس وقت جو کام ہے، اس کو ہم چار شعبوں میں تقسیم کریں گے :- (۱) تنقید و تبصرہ (۲) علمی و دعوتی مضمون (۳) افسانہ و طنز (۴) نظم۔ آئندہ ہمارا کام انہی چار شعبوں سے متعلق ہوگا۔ لکھنے والوں کے لئے اگرچہ یہ ضروری نہیں ہے، کہ کوئی ایک ہی چیز اختیار کی جائے۔ لیکن اصولی حیثیت سے یہ زیادہ بہتر ہے، کہ ہر لکھنے والا اپنے متعلق یہ فیصلہ کرلے کہ وہ کس صنفِ ادب کو اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے اپنے لئے موزوں سمجھتا ہے، اور پھر اس پر خاص توجہ صرف کرے، اس میں شک نہیں کہ دوسری اصناف پر بھی لکھا جا سکتا ہے لیکن کسی ایک صنف کی طرف متوجہ رہنے سے ہوتا یہ ہے، کہ آدمی اس میں ماہرِ خصوصی (Master) بن جاتا ہے۔ اور ادبی دنیا میں اپنا ایک مقام پیدا کر سکتا ہے"۔

گفتگو جاری رکھتے ہوئے ناظمِ حلقہ نے فرمایا کہ:-

"ہمارا ہر کام ایک مقصدِ خاص کے لئے ہے، محض ذہنی یا قلمی عیاشی مقصود نہیں ہے، اور مقصد کو وہی شخص اچھی طرح سمجھ سکتا ہے، جو اس کے مقتضیات پر خود بھی اچھی طرح کاربند ہو، لہٰذا ہمارے رفقاء کو عام ادیبوں کی طرح "ادبی سستی" سے کام نہیں لینا چاہئے، بلکہ اس کے برخلاف انہیں باعمل اور Active ہونا چاہیے"۔

"اسی طرح ہمیں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے، کہ ہمارا ماخذِ اصلی قرآن و حدیث ہے۔ اور وہیں سے ہم زندگی کے تمام معاملات میں ہدایت حاصل کرتے ہیں، اس لئے ادبی میدان میں بھی ہم اپنے رہبرِ اصلی کی ہدایات سے قطع نظر کر کے آگے نہیں بڑھ سکتے، ضرورت ہے کہ ہم ان کا خاص طور پر مطالعہ کریں، اور ان کی روشنی میں تمام کام انجام دیں"۔

اس گفتگو اور تمہیدی کام کے بعد اجتماعِ اول برخاست ہوا۔ اور بقیہ کام کو آنے والے اجتماع کے لئے اٹھا رکھا گیا۔ چنانچہ دوسرے اجتماع میں جو ۲۴ شہریور ۱۳۳۰ ف م ۲۴ جولائی ۱۹۵۱ء کو منعقد ہوا پچھلے کام کی تکمیل کی گئی، اس دفعہ سب سے اہم بات یہ ہوئی، کہ اجتماعِ اول میں جن چار شعبہ جات کا ذکر کیا گیا تھا، ان کے مختلف پہلوؤں پر رفقاء نے خوب کھل کر مذاکرہ کیا، جس سے ایک واضح نصب العین متعین کرنے میں بڑی مدد ملی۔

عمر بن عبداللہ صاحب ایم، اے نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے "طنز" کے متعلق فرمایا، کہ "یہ ایک نہایت لطیف صنفِ ادب ہے، اور ہمارے مقصد کے لئے بہت مفید، مزاح اور طنز کے فرق کو واضح کرتے ہوئے آپ نے اس سلسلہ میں لٹریچر کے مطالعہ کی ضرورت بتلائی، اور واضح کیا کہ انگریزی ادیبوں نے مختصر طنزیہ مضامین لکھنے میں کمال پیدا کیا ہے اور بہت اچھا طرزِ بیان اختیار کیا ہے، اردو زبان میں اس کا کچھ عکس رشید احمد صدیقی کے مضامین میں ملتا ہے۔ "صدق" کی سچی باتوں کے متعلق آپ نے فرمایا کہ وہ بہت اچھا طرز ہے"۔

اس کے بعد اس موضوع پر صادق احمد صاحب دہلوی بی، اے، ایل ایل بی، اور حسن الدین صاحب اور دیگر رفقاء نے بھی گفتگو میں حصہ لیا، آخر میں ناظمِ حلقہ نے تمام اصناف پر تفصیلی روشنی ڈالی،

تنقید کے متعلق ناظمِ حلقہ نے فرمایا، کہ "ایک چیز تو فنی تجزیہ ہے، جس میں تنقید نگار کسی ادبی کاوش کو فن کی کسوٹی پر کس کر اس کا کھرا اور کھوٹا الگ کرتا ہے، اس کے علاوہ مضمون کے مواد، اسلوبِ نگارش اور اظہارِ خیال کے پیرایوں پر بھی ناقد کو کچھ لکھنا ہے، لیکن اس علمی اور فنی تنقید کے علاوہ آج کل تنقید کا ایک اور طریقہ بھی ہے، جو لکھنے والے کی شخصیت سے تعلق رکھتا ہے، جس میں اس کی "سوانح" اور اس کے پیش کردہ خیالات کی "تحلیلِ نفسی" کو بڑا دخل ہے۔ یہ فن اسلامی فنِ حدیث کے اسماء الرجال سے ملتا جلتا ہے، اور یہ ہمارے مقصد کے لئے بے حد مفید ہے"۔

"علمی اور تحقیقی مضامین کے لئے وسعت مطالعہ کی شدید ضرورت ہے، اس میں دو چیزیں ہوتی ہیں ایک لکھنے والے کے ذاتی خیالات، دوسرے مختلف کتابوں سے اخذ کردہ معلومات اور نتائج تحقیق، لیکن اکثر اوقات یہ دونوں باتیں پہلو بہ پہلو چلتی ہیں۔ چنانچہ مولانا مودودی کی اکثر کتابیں اس اعتبار سے نہایت جامع کہی جا سکتی ہیں، جن میں نہ صرف معلومات کا بیش بہا ذخیرہ ہے، بلکہ اس کے علاوہ لکھنے والا اپنی بہترین رائے کا بھی اظہار کرتا جاتا ہے، جس سے ناظر بآسانی ایک نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے"۔

"دعوتی مضامین کی حیثیت اس سے کچھ مختلف ہوتی ہے، یہ مختصر موضوع پر لکھے جاتے ہیں، اس میں زیادہ پھیلاؤ نہیں ہوتا، یہ رفتہ رفتہ ابھرتے ہیں، اور آخر میں بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے، ان میں تقریر کی سی روانی ہوتی ہے۔ اور جذبات کو اپیل کرنے والے ہوتے ہیں، بنیادی طور پر دعوتی مضامین تحقیقی اور علمی انداز کے مضامین سے مختلف نہیں ہوتے، کیونکہ ٹھیک اسی قسم کی معلومات پر ان کا مدار بھی رکھا جاتا ہے لیکن اظہار بیان کے اعتبار سے دونوں میں کافی فرق ہوتا ہے، دعوتی مضمون لکھنے والا اکثر اپنے ماخذ اور حوالوں کا اندراج نہیں کرتا، وہ دوسروں کے اقتباسات بھی کم پیش کرتا ہے، اس کا زیادہ تر کام یہ ہوتا ہے، کہ واقعات کو اپنی زبان میں پیش کرے اور ان سے نتائج نکال نکال کر قاری کے ذہن کو ایک خاص نتیجہ پر بڑی تیزی کے ساتھ لیجا کر چھوڑ دے، اردو زبان میں مولانا مودودیؒ کی کتابیں "خطبات" اور "سیاسی کشمکش" (اول) اس انداز بیان کے اعتبار سے شاہکار کہی جا سکتی ہیں"۔

"آج کل افسانہ کا مفہوم بہت وسیع ہو گیا ہے، کسی شخص یا گروہ کی پوری زندگی، یا زندگی کا محض ایک ادنیٰ سا واقعہ، دونوں بیک وقت افسانہ ہیں، پھر اکثر افسانے محض تخیلی ہوتے ہیں، یا اشیائے کائنات سے تعلق رکھتے ہیں، سماجی زندگی کے واقعات اور سوسائٹی کی عکاسی ان میں کہیں نہیں پائی جاتی، مگر وہ بھی افسانہ ہی ہیں، گو یا مختصر طور پر کسی شخص کا تخیلی خاکہ یا کسی کی زندگی کا کوئی واقعہ قدرت کی پیدا کردہ اشیاء کا کوئی بیان سب افسانہ کی تعریف میں آتے ہیں، تاہم افسانہ میں چند چیزوں کو سب ہی تسلیم کرتے ہیں، مثلاً افسانہ میں وقت اور زمان و مکان کی ایک ادنیٰ سی جھلک ضرور ہوتی ہے، افسانہ کا کوئی نہ کوئی مقصد اور خاص نتیجہ ہوتا ہے، پڑھنے والے کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے، افسانہ میں ذہنی یا واقعاتی کوئی نہ کوئی پلاٹ ہوتا ہے، جس کے ساتھ مختلف کردار بھی ہوتے ہیں، افسانہ میں قصہ اور کہانی کا سا ربط ہوتا ہے آج کل افسانہ کو تبلیغ اور ہر قسم کے انقلابی اور اصلاحی مقاصد کی اشاعت کا بہترین ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔

ہمارے لکھنے والوں کو کوشش کرنی چاہئے کہ ہمارے افسانے وقت کے جدید ترین معیار کے مطابق ہوں اور ٹھیک مقصدی بھی ہوں، یعنے ہم اپنے اصولوں کی دعوت کو بڑی عمدگی سے افسانہ میں سمو دیں، اس کے لئے ضروری ہے، کہ ہم موجودہ سوسائٹی کا گہری نظر سے مطالعہ کریں، مختلف لکھنے والوں کی ادبی کاوشوں کو خوب پڑھیں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ کہ اپنے مشن کو لیکر خوب کام کریں، کیونکہ اسی صورت میں ہمیں اپنے مقصد کے لحاظ سے بہترین افسانوں کے پلاٹ مل سکتے ہیں جب تک کوئی شخص کام نہ کرے اور واقعات پر غور نہ کرے اس وقت تک اس کو پلاٹ نہیں ملتے، لیکن جونہی وہ کام شروع کر دیتا ہے، پلاٹ خود بخود اس کے قدموں میں آکر لوٹنے لگتے ہیں، اسی طرح افسانہ کو ایک بلند معیار پر پہنچانے کے لئے ہمیں قرآنی ادب کا خاص طور پر مطالعہ کرنا چاہئے، قرآن میں حضرت یوسفؑ کا قصہ جدید ترین معیار کے اعتبار سے بھی موجودہ وقت کا بہترین "افسانہ" ہے، جس میں افسانے کے سب ہی شعبے موجود ہیں"۔

"نظم کی بھی مختلف قسمیں ہیں، جس میں غزل اور فن عروض کی پابندی کرنے والی نظم بھی شامل ہے۔ اور آج کل کی آزاد اور معرّا نظم بھی۔ ہم ہر قسم کی نظم پر کام کا آغاز کریں گے، ہمیں قدیم اور جدید کسی طرز سے کوئی بغض نہ ہونا چاہئے، جتنے طرز ادا (ٹیکنیک) اور تکنک اب تک وجود میں آئے ہیں، سب خدا کی دین ہیں، اور انسانی تمدن کا ورثہ اس لئے ان سب کو ہم خوشی استعمال کریں گے، البتہ ان کے تمام غیر صالح اور غیر اسلامی عناصر کو ہم نکال پھینکیں گے۔ اور نیز جس قاعدہ کے مطابق ہم نظم لکھیں قدیم یا جدید، ہمیں اس کی پابندی کرنی ہوگی، کیونکہ اگر ہم سرے سے ضابطہ ہی کو نظر انداز کر دیں، تو پھر ادب میں بے راہ روی پیدا ہو جائے گی، اور کوئی ایک مقررہ معیار ایسا

بے بالائے طاق رکھدئے گئے، اور رات کی تاریکیوں کو پھاڑ کر جدّتِ طبع اور جودتِ فکر کا جو سورج طلوع ہوا، تو اس نے اپنی ایک ایک کرن سے زمین کے چہرے پر یہ بات لکھدی کہ
قدیم کی خشک ضابطہ بندی کو توڑ دو، اور عہد جدید کی رنگینیوں اور حسن پرستیوں میں کھو جاؤ، عقل، تدبر، قانون، منطق، فلسفہ اور اخلاقیات کے پیچھے چلنے کے بجائے اس رنگا رنگ کائنات
کے پھولوں کی رنگینی چھین لو، ان کی خوشبو سمیٹ لو، پھلوں کی مٹھاس چوس لو، اور ان کا رس نچوڑ لو، جذبات کے پیچھے چلو، اور احساسات کی پیروی کرو "۔

چنانچہ اس رومانیت پسندی کے دو اہم اجزاء تھے، (۱) انسان کے جذبات ہمیشہ صحیح سمت کو رہنمائی کرتے ہیں، (۲) انسان کو زیادہ سے زیادہ حسن پرست یا جمالیاتی ہونا چاہئے،
[illegible] کی گئی، اور عیش و مستی، شراب و ساغر اور نغمہ و صوت کا ایک نیا سیلاب بہا دیا گیا، ایک نیا طوفان برپا ہوا، اور
[illegible] سا بعد ہی یہ جدّتِ فکر اور جودتِ طبع بھی سرد پڑ گئی، پرانی ہو گئی، "جذبات پرست" اور "حسن پسند" قلم کار لس
[illegible] لذت و ملی بستگی یا تعمیر و ترمیم کے لئے نئے ساز اور نئے گر تلاش کر لئے، چنانچہ "رومانیت" کا نقاب الٹ کر ادب کی ترقی پذیر
[illegible]) کا غازہ اپنے منہ پر مل لیا، اس نے پچھلی جذباتیت، تخیل پسندی اور واقعات سے گریز کرنے والی زندگی پر طنز کیا، اور اُسے
[illegible] "حقیقت پسندی" کے علمبرداروں نے کہا ہم کو جذبات کی رہنمائی میں چل کر اور حُسن کی پرستش کر کے دماغی عیاشی کا سامان فراہم کرنے
[illegible] کرنی چاہیے، ہمیں زندگی کے مختلف گوشوں اور شعبوں کو ان کی اصلی ہیئت میں اُجاگر کر کے لوگوں کے سامنے رکھ دینا چاہیے، اس میں اپنے جذبات کو
[illegible] آمیزی کرنا، اور حسن و جمال کا نام لے کر غلط قسم کی اقدار حیات پر انسان کو ڈال دینا ایک نہایت ہی گھناؤنا فعل ہے، اس لئے ہمیں جس قدر ممکن ہو سکے،
[illegible] بچنا چاہئے،

[illegible] یہ حقیقت پسندی بھی زیادہ عرصہ تک ایک مقام پر نہ رہ سکی، اور بہت جلد ہی اس میں تغیر ہو گیا، ادب میں "مقصدیت"، "مستقبل پسندی" اور "افادیت پرستی" نے راہ پالی
[illegible] اجزاء کے ساتھ ساتھ "سادگی" اور "ترقی پسندی" بھی اس میں شامل ہو گئی، اور اس طرح ادب کا قافلۂ فکر ایک اور نئے راستہ کی طرف چل پڑا، چنانچہ آج ہم جس نئے دور
سے گذر رہے ہیں، وہ یہی دور ہے، اس دور میں کوئی شخص بھی "ادب برائے ادب" کے نظریہ کا قائل نہیں ہے، بلکہ آج ہر شخص "ادب برائے زندگی" کے اصول کا قائل ہو چکا ہے
"ادب برائے ادب" کا نظریہ پوری طرح دفن کر دیا گیا ہے، اور اب صرف "مقصدی ادب"، "زندگی کو بنانے والا ادب"، اور "تعمیر، اصلاح اور انقلاب کے نعرے لگانے والا ادب" ہی
چل سکتا ہے، آج کا نیا ادب محض ادیب اور قلم کار ہی نہیں ہے، بلکہ وہ زندگی کو سنوارنے یا بگاڑنے کے کچھ خاکے اور پروگرام بھی رکھتا ہے، وہ ادب کو محض پہاڑی پر بیٹھ کر تپسیا
کرنے والے کے اشلوک نہیں سمجھتا، بلکہ وہ ادب کی کشتی کو لے کر حیاتِ انسانی کی عین منجدھار میں اسے کھیتا ہے، بہر حال آج پھر ایک نیا ادب تشکیل ہو رہا ہے، جس میں "مقصدیت"
"افادیت" اور "مستقبل پسندی" (Futurism) کو اولین اہمیت حاصل ہے، اور اس کے بغیر موجودہ ادبی نقطۂ نظر سے کسی کی ذرہ برابر وقعت اور قیمت نہیں
ہو سکتی ہے، عام اصطلاح میں اس طرزِ فکر کو "جدیدیت" (Modernism) کہتے ہیں، اور یہ ذیلی حیثیت میں اس کے مختلف نام ہیں۔
اس تعارف اور تجزیہ کے بعد اب مجھے آپ کے سامنے یہ چیز واضح کرنی ہے، کہ ادب میں یہ سارا ارتقاء یا تبدیلی محض ادب کے دائرہ میں الگ سے کوئی ارتقاء نہیں ہے،
بلکہ یہ ارتقاء اور یہ تبدیلی ہمیشہ سے وقت کے اجتماعی نظام کی پابند اور پیرو ہے، اجتماعی نظام میں تغیر کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی تبدیلی ہوئی ہے، اور اسی ادب کی سرزمین
نئے نئے سوتے اور چشمے پھوٹے ہیں،

کلاسکیت | چنانچہ جس وقت کلاسکیت (Classicalism) کا دور دورہ تھا، اس وقت "جاہلی مذہب" کی فرسودہ اقدار (Values) زندگی

نہ رہے گا جس پر ہم اپنے ادب کو ناپ سکیں، اور اپنی فنی ترقی یا زوال کی پیمائش کر سکیں، ادب میں ضابطہ کی مثال ایسی ہے، جیسے سوسائٹی میں اخلاق کی، کہ اس کے بغیر حیاداری ہمیں تمام اصناف ادب میں ضابطہ کی پابندی کرنی چاہئیے۔ "آزاد نظم" اکثر نثر سے مشابہ سمجھی جاتی ہے، لیکن یہ خیال غلط ہے، یہ انگریزی کی (blank verse) کی پیروی میں رائج ہوئی ہے، اور اس کا ایک وزن اور لے ہوتی ہے، ہر شخص آزاد نظم نہیں کہہ سکتا، اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہر قسم کے مقاصد کو نہایت آسانی سے پیش کیا جا سکتا ہے اس لئے ہمارے مقاصد کے لئے اس کو بہت خوبی سے اپنایا جا سکتا ہے، اور ہم کو یہ کام ضرور کرنا چاہئیے، اسی کے بعد اسی نقطہ نظر سے فیچر (ریڈیائی ڈرامہ)، ڈرامہ اور رپورتاژ کی تشریح ہوگی

الغرض یہ تھا، وہ ابتدائی خاکہ یا راستہ جس پر ہم نے چلنا شروع کیا۔ اور خدا کا شکر ہے، کہ گذشتہ دس ماہ سے ہم مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس دوران میں کئی نئی باتیں ہماری سمجھ میں کام کا آغاز کر دینے کے بعد خود بخود آگئیں حالانکہ اول اول ہمیں ان کا وہم و گمان بھی نہیں تھا۔

تعداد ارکان ہمارے حلقہ کے ارکان کی تعداد اب تک دس رہی ہے، اور ہم نے اب تک ۲۰ بیس اجتماعات منعقد کئے ہیں، جن میں ۲۳ مقالے، ۳۱ نظمیں، ۱۲ افسانے پڑھے جا چکے ہیں، جو مضامین اس حلقہ کے تحت مرتب کر کے اشاعت کے لئے دیئے گئے، ان کی تعداد تقریباً ۱۵ ہے۔ علاوہ ازیں بعض ارکان نے اپنی اُن کاوشوں کو بھی مختلف رسائل و اخبارات میں شائع کرتے رہے، جنھیں حلقہ کے اجتماعات میں پیش نہیں کیا گیا۔

بہرحال اس مختصر سے عرصہ میں کئی نفسیاتی، واقعاتی، تنقیدی، اور طنزیہ مضامین، نوشتے، افسانے اور نظمیں تیار کی گئیں، اور ایک ایسا ماحول پیدا ہو گیا، جس کے بارے میں پہلے ہمارے قیاس و گمان کے گھوڑے بہت سست رفتار تھے۔ سب سے بڑا کام جو سر انجام پایا وہ یہ تھا، کہ ہم نے چند ایسے قلم کاروں کی تربیت کر لی ہے، جن سے توقع ہے کہ وہ آئندہ مروجہ تخریب پسندانہ ادبی قدروں کے خلاف حقیقت پسندانہ تعمیری ادب کو ادبی حلقوں میں ابھرتی ہوئی اور ناقابلِ مقابلہ تحریک بنا سکیں گے۔ اور ہندوستان اور پاکستان کے تعمیری ادیبوں اور مصنفوں کے شانہ بشانہ چل سکیں گے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے، حلقۂ ادب اسلامی کے اجتماعات پندرہ دن میں ایک مرتبہ یعنی ہر دوسرے جمعہ کو منعقد ہوتے ہیں، ان میں نے والے اپنی مساعی پیش کرتے ہیں، اور ان پر دوسرے شرکا کھلی تنقید کر کے نقائص اور خوبیوں کو واضح کرتے ہیں، اور اس تنقید میں سب سے زیادہ اہمیت ہم اپنے مقصد کو دیتے ہیں۔ اور اس کے بعد دوسرے اُمور زیر غور آتے ہیں۔

بغیر کسی مبالغہ اور بے جا انکسار کے ہم نے اپنے کام کی کیفیت کو آپ کے سامنے رکھ دیا ہے، ممکن ہے اکثر اصحاب کی نظروں میں یہ کوششیں کوئی قیمت نہ پا سکیں، لیکن ہم خدا پر بھروسہ رکھتے ہوئے متوقع ہیں، کہ آنے والے دنوں میں یہ نئی ادبی تحریک اپنی پوری خصوصیات کے ساتھ اجاگر ہو جائے گی۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

رپورٹ کے بعد ناظم حلقۂ ادب اسلامی السید اصغر علی عابدی نے تعارفی تقریر کی جو ذیل میں درج کی جا رہی ہے!

ناظم حلقۂ ادب اسلامی کی تعارفی تقریر

بوقفتاً "ایک زمانہ وہ تھا، جب ادب کا ایک قدیم اور ضابطہ بند طریقہ رائج تھا، جسے (Classicalism) کہتے ہیں، لیکن جلد ہی یہ دور رخصت ہو گیا، اس طرز میں زیادہ ادب کے خاص خاص ضابطوں اور اصولوں کو حاصل تھی، اس اہمیت کو قبول کئے بغیر کوئی ادیب ادیب کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا تھا، اس ادب میں وہی بات چلتی تھی، جو الگے وقتوں سے ہوتی آئی تھی، اور خاص خاص اصولوں اور ضابطوں سے بندھی ہوئی تھی، لیکن جلد ہی اس ادب کا زمانہ بیت گیا، اور گھڑی کی سوئی کی طرح حرکت کر کے وقت نے ایک نئی کی نشاندہی کی، ایک نئی راہ کا پتہ بتایا، اور ایک نئی سمت کو قافلہ انسانی کو لے چلا، یہ دوسرا دور رومانیت (Romanticism) کا دور تھا، اس کی رُو سے یہ

اور ضابطے بالائے طاق رکھدیئے گئے، اور رات کی تاریکیوں کو پھاڑ کر جدتِ طبع اور جودتِ فکر کا جو سورج طلوع ہوا، تو اس نے اپنی ایک ایک کرن سے زمین کے چہرے پر یہ بات لکھدی کہ "عہدِ قدیم کی خشک ضابطہ بندی کو توڑ دو، اور عہدِ جدید کی رنگینیوں اور حسن پرستیوں میں کھو جاؤ، عقل، تدبر، قانون، منطق، فلسفہ اور اخلاقیات کے پیچھے چلنے کے بجائے اس رنگا رنگ کائنات سے اس کے پھولوں کی رنگینی چھین لو، ان کی خوشبو سمیٹ لو، پھلوں کی مٹھاس چوس لو، اور ان کا رس نچوڑ لو، جذبات کے پیچھے چلو، اور احساسات کی پیروی کرو"۔

چنانچہ اس رومانیت پسندی کے دو اہم اجزاء تھے، (۱) انسان کے جذبات ہمیشہ صحیح سمت کو رہنمائی کرتے ہیں، (۲) انسان کو زیادہ سے زیادہ حسن پرست یا جمالیاتی ہونا چاہئے، رومانیت کی یہی دو بنیادیں تھیں جن پر ایک نئے ادب کی عمارت تعمیر کی گئی، اور عیش و مستی، شراب و ساغر اور نغمہ و صوت کا ایک نیا سیلاب بہا یا گیا، ایک نیا طوفان برپا ہوا، اور پرانے بند کی ایک ایک اینٹ اس طوفان کی رو میں بہا دی گئی، لیکن جلد ہی یہ جدتِ فکر اور جودتِ طبع بھی سرد پڑ گئی، پرانی ہو گئی "جذبات پرست" اور "حسن پسند" قلم کاروں کے ہاتھ ٹھٹھر کر رہ گئے، اور ہوش و گوش نے لذت، دل بستگی یا تعمیر و ترمیم کے لئے نئے ساز اور نئے نغمے تلاش کر لئے، چنانچہ "رومانیت" کا نقاب الٹ کر ادب کی ترقی پذیر قدروں نے "حقیقت پسندی" (Realism) کا غازہ اپنے منہ پر مل لیا، اس نے پچھلی جذباتیت، تخیل پسندی اور واقعات سے گریز کرنے والی زندگی پر طنز کیا، اور اسے اٹھا کر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر دے مارا، "حقیقت پسندی" کے علمبرداروں نے کہا ہم کو جذبات کی رہنمائی میں چل کر اور حسن کی پرستش کر کے دماغی عیاشی کا سامان فراہم کرنے کے بجائے زندگی کی حقیقی تصویر کشی کرنی چاہئے، ہمیں زندگی کے مختلف گوشوں اور شعبوں کو ان کی اصلی ہیئت میں اجاگر کر کے لوگوں کے سامنے رکھدینا چاہئے، اس میں اپنے جذبات کو دخل دینا، اپنے تخیل سے رنگ آمیزی کرنا، اور حسن و جمال کا نام لے کر غلط قسم کی اقدارِ حیات پر انسان کو ڈالدینا ایک نہایت ہی گھناؤنا فعل ہے، اس لئے ہمیں جس قدر ممکن ہو سکے، اس بانڈے طریقہ سے بچنا چاہئے،

لیکن "حقیقت پسندی" بھی زیادہ عرصہ تک ایک مقام پر نہ رہ سکی، اور بہت جلد ہی اس میں تغیر ہو گیا، ادب میں "مقصدیت"، "مستقبل پسندی" اور "افادیت پرستی" نے راہ پالی اور پھر ان اجزاء کے ساتھ ساتھ "سادگی" اور "ترقی پسندی" بھی اس میں شامل ہو گئی، اور اس طرح ادب کا قافلۂ فکر ایک اور نئے راستہ کی طرف چل پڑا، چنانچہ آج ہم جس نئے دور سے گذر رہے ہیں، وہ یہی دور ہے، اس دور میں کوئی شخص بھی "ادب برائے ادب" کے نظریہ کا قائل نہیں ہے، بلکہ آج ہر شخص "ادب برائے زندگی" کے اصول کا قائل ہو چکا ہے "ادب برائے ادب" کا نظریہ پوری طرح دفن کر دیا گیا ہے، اور اب صرف "مقصدی ادب" "زندگی کو بنانے والا ادب"، اور تعمیر، اصلاح اور انقلاب کے نعرے لگانے والا ادب ہی چل سکتا ہے، آج کا نیا ادیب محض ادیب اور قلم کار ہی نہیں ہے، بلکہ وہ زندگی کو سنوارنے یا بگاڑنے کے کچھ خاکے اور پروگرام بھی رکھتا ہے، وہ ادب کو محض پہاڑی پر بیٹھ کر تپسیا کرنے والے کے اشلوک نہیں سمجھتا، بلکہ وہ ادب کی کشتی کو لے کر حیاتِ انسانی کی عین منجدھار میں اسے کھیتا ہے، بہرحال آج پھر ایک نیا ادب تشکیل ہو رہا ہے، جس میں "مقصدیت" "افادیت" اور "مستقبل پسندی" (Futurism) کو اولین اہمیت حاصل ہے، اور اس کے بغیر موجودہ ادبی نقطۂ نظر سے کسی کی ذرہ برابر وقعت اور قیمت نہیں ہو سکتی ہے، عام اصطلاح میں اس طرزِ فکر کو "جدیدیت" (Modernism) کہتے ہیں، اور یہ ادبی حیثیت میں اس کے مختلف نام ہیں۔

اس تعارف اور تجزیہ کے بعد اب مجھے آپ کے سامنے یہ چیز واضح کرنی ہے، کہ ادب میں یہ سارا ارتقاء یا تبدیلی محض ادب کے دائرہ میں الگ سے کوئی ارتقاء نہیں ہے بلکہ یہ ارتقاء اور یہ تبدیلی ہمیشہ سے وقت کے اجتماعی نظام کی پابند اور پیرو ہے، اجتماعی نظام میں تغیر کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی تبدیلی ہوئی ہے، اور ادب کی سرزمین سے نئے نئے سوتے اور چشمے پھوٹے ہیں،

کلاسکیت | چنانچہ جس وقت کلاسکیت (Classicalism) کا دور دورہ تھا، اس وقت "جاہلی مذہب" کی فرسودہ اقدار (Values) زندگی

نہ رہے گا جس پر ہم اپنے ادب کو ناپ سکیں، اور اپنی فنی ترقی یا زوال کی پیمائش کر سکیں، ادب میں ضابطہ کی مثال ایسی ہے، جیسے سوسائٹی میں اخلاق کی، کہ اس کے بغیر بنیاد ہی نہیں ہمیں تمام اصناف ادب میں ضابطہ کی پابندی کرنی چاہئیے۔ "آزاد نظم" اکثر نثر سے مشابہ سمجھی جاتی ہے، لیکن یہ خیال غلط ہے، یہ انگریزی کی (free verse) کی پیروی میں وجود میں آئی ہے، اور اس کا ایک وزن اور لے ہوتی ہے، ہر شخص آزاد نظم نہیں کہہ سکتا، اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہر قسم کے مقاصد کو نہایت آسانی سے پیش کیا جا سکتا ہے اس لئے ہمارے مقاصد کے لئے اس کو بہت خوبی سے اپنایا جا سکتا ہے، اور ہم کو یہ کام ضرور کرنا چاہئیے، اسی کے بعد اسی نقطۂ نظر سے فیچر (ریڈیائی ڈرامہ)، ڈرامہ اور رپورتاژ کی تشریح ہو گی۔

الغرض یہ تھا، وہ ابتدائی خاکہ یا راستہ جس پر ہم نے چلنا شروع کیا۔ اور خدا کا شکر ہے، کہ گذشتہ دس ماہ سے ہم مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس دوران میں کئی نئی باتیں ہماری سمجھ میں کام کا آغاز کر دینے کے بعد خود بخود آ گئیں، حالانکہ اول اول ہمیں ان کا وہم و گمان بھی نہیں تھا۔

تعداد ارکان ہمارے حلقے کے ارکان کی تعداد اب تک دس رہی ہے، اور ہم نے اب تک ۲۰ بیس اجتماعات منعقد کئے ہیں، جن میں ۱۳ مقالے، ۲۱ نظمیں، ۱۲ افسانے پڑھے گئے ہیں، جو مضامین اس حلقہ کے تحت مرتب کر کے اشاعت کے لئے دئیے گئے، ان کی تعداد تقریباً ۵۱ ہے۔ علاوہ ازیں بعض ارکان نے اپنی اُن کاوشوں کو بھی مختلف رسائل میں شائع کرتے رہے، جنھیں حلقہ کے اجتماعات میں پیش نہیں کیا گیا۔

بہرحال اس مختصر سے عرصہ میں کئی نفسیاتی، واقعاتی، تنقیدی، اور طنزیہ مضامین، نوشتے، افسانے اور نظمیں تیار کی گئیں، اور ایک ایسا ماحول پیدا ہو گیا، جس کے بارے میں ہمارے قیاس و گمان کے گھوڑے بہت سست رفتار تھے۔ سب سے بڑا کام جو سر انجام پایا وہ یہ تھا، کہ ہم نے چند ایسے قلم کاروں کی تربیت کر لی ہے، جن سے توقع ہے کہ مروجہ تخریب پسندانہ ادبی قدروں کے خلاف حقیقت پسندانہ تعمیری ادب کو ادبی حلقوں میں ابھرتی ہوئی اور ناقابلِ مقابلہ تحریک بنا سکیں گے۔ اور ہندوستان اور پاکستان کے ادیبوں اور مصنفوں کے شانہ بشانہ چل سکیں گے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے، حلقۂ ادبِ اسلامی کے اجتماعات پندرہ دن میں ایک مرتبہ یعنی ہر دوسرے جمعہ کو منعقد ہوتے ہیں، اور والے اپنی مساعی پیش کرتے ہیں، اور ان پر دوسرے شرکا کھلی تنقید کر کے نقائص اور خوبیوں کو واضح کرتے ہیں، اور اس تنقید میں سب سے زیادہ اہمیت ہم اپنے مقاصد کو دیتے ہیں۔ اور اس کے بعد دوسرے اُمور زیرِ غور آتے ہیں۔

بغیر کسی مبالغہ اور بے جا انکسار کے ہم نے اپنے کام کی کیفیت کو آپ کے سامنے رکھ دیا ہے، ممکن ہے اکثر اصحاب کی نظروں میں یہ کوششیں کوئی قیمت نہ پا سکیں، لیکن ہم بھروسہ رکھتے ہوئے متوقع ہیں، کہ آنے والے دنوں میں یہ نئی ادبی تحریک، اپنی پوری خصوصیات کے ساتھ اجاگر ہو جائے گی۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

رپورٹ کے بعد ناظم "حلقۂ ادبِ اسلامی" سید اصغر علی عابدی نے تعارفی تقریر کی جو ذیل میں درج کی جا رہی ہے!

ناظمِ حلقۂ ادبِ اسلامی کی تعارفی تقریر

بعض "ایک زمانہ وہ تھا، جب ادب کا ایک قدیم اور ضابطہ بند طریقہ رائج تھا، جسے (classicalism) کہتے ہیں، لیکن جلد ہی یہ دور رخصت ہو گیا، اس طرز میں ادب کے خاص خاص ضابطوں اور اصولوں کو دخل تھا، اس اہمیت کو قبول کئے بغیر کوئی ادیب ادیب کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا تھا، اس ادب میں وہی بات چلتی تھی، جو اگلوں سے ہوتی آئی تھی، اور خاص خاص اصولوں اور ضابطوں سے بندھی ہوئی تھی، لیکن جلد ہی اس ادب کا زمانہ بیت گیا، اور گھڑی کی سوئی کی طرح حرکت کر کے وقت نے ایک نئی نشاندہی کی، ایک نئی راہ کا پتہ بتایا، اور ایک نئی سمت کو قافلہ انسانی کو لے چلا، یہ دوسرا دور رومانیت (Romanticism) کا دور تھا، اس کی رُو سے

اور ضابطے بالائے طاق رکھدیئے گئے ، اور رات کی تاریکیوں کو پھاڑ کر جدتِ طبع اور جودتِ فکر کا جو سورج طلوع ہوا، تو اس نے اپنی ایک ایک کرن سے زمین کے چہرے پر یہ بات لکھدی کہ "عہدِ قدیم کی خشک ضابطہ بندی کو توڑ دو، اور عہدِ جدید کی رنگینیوں اور حسن پرستیوں میں کھو جاؤ، عقل، تدبر، قانون، منطق، فلسفہ اور اخلاقیات کے پیچھے چلنے کے بجائے اس رنگا رنگ کائنات سے اس کے پھولوں کی رنگینی چھین لو، ان کی خوشبو سمیٹ لو، پھلوں کی مٹھاس چوس لو، اور ان کا رس نچوڑ لو، جذبات کے پیچھے چلو، اور احساسات کی پیروی کرو" ۔

چنانچہ اس رومانیت پسندی کے دو اہم اجزاء تھے، (۱) انسان کے جذبات ہمیشہ صحیح سمت کو رہنمائی کرتے ہیں، (۲) انسان کو زیادہ سے زیادہ حسن پرست یا جمالیاتی ہونا چاہئے، رومانیت کی یہی وہ بنیادیں تھیں جن پر ایک نئے ادب کی عمارت تعمیر کی گئی، اور عیش و مستی، شراب و ساغر اور نغمہ و صوت کا ایک نیا سیلاب بہا یا گیا، ایک نیا طوفان برپا ہوا، اور پرانے بند کی ایک ایک اینٹ اس طوفان کی رَو میں بہادی گئی، لیکن جلد ہی یہ جدتِ فکر اور جودتِ طبع بھی سرد پڑ گئی، پرانی ہو گئی، "جذبات پرست" اور "حسن پسند" قلم کاروں کے ہاتھ ٹھٹھر کر رہ گئے، اور ہوش و گوش نے لذت و دلبستگی یا تعمیر و ترمیم کے لئے نئے ساز اور نئے نغمے تلاش کر لئے، چنانچہ "رومانیت" کا نقاب الٹ کر ادب کی ترقی پذیر قدروں نے "حقیقت پسندی" (Realism) کا غازہ اپنے منہ پر مل لیا، اس نے پچھلی جذباتیت، تخیل پسندی اور واقعات سے گریز کرنے والی زندگی پر طنز کیا، اور اسے اٹھا کر کوڑے، کرکٹ کے ڈھیر پر دے مارا، "حقیقت پسندی" کے علمبرداروں نے کہا ہم کو جذبات کی رہنمائی میں چل کر اور حسن کی پرستش کر کے دماغی عیاشی کا سامان فراہم کرنے کے بجائے زندگی کی حقیقی تصویر کشی کرنی چاہئے، ہمیں زندگی کے مختلف گوشوں اور شعبوں کو ان کی اصلی ہیئت میں اُجاگر کر کے لوگوں کے سامنے رکھدینا چاہئے، اس میں اپنے جذبات کو دخل دینا، اپنے تخیل سے رنگ آمیزی کرنا، اور حسن و جمال کا نام لے کر غلط قسم کی اقدارِ حیات پر انسان کو ڈالدینا ایک نہایت ہی گھناؤنا فعل ہے، اس لئے ہمیں جس قدر ممکن ہو سکے، اس بیانیہ طریقہ سے بچنا چاہئے۔

لیکن یہ "حقیقت پسندی" بھی زیادہ عرصہ تک ایک مقام پر نہ رہ سکی، اور بہت جلد ہی اس میں تغیر ہو گیا، ادب میں "مقصدیت" "مستقبل پسندی" اور "افادیت پرستی" نے راہ پائی اور پھر ان اجزاء کے ساتھ ساتھ "سادگی" اور "ترقی پسندی" بھی اس میں شامل ہو گئی، اور اس طرح ادب کا قافلۂ فکر ایک اور نئے راستہ کی طرف چل پڑا، چنانچہ آج ہم جس دور سے گذر رہے ہیں، وہ بھی دورِ فکر ہے، اس دور میں کوئی شخص بھی "ادب برائے ادب" کے نظریہ کا قائل نہیں ہے، بلکہ آج ہر شخص "ادب برائے زندگی" کے اصول کا قائل ہو چکا ہے "ادب برائے ادب" کا نظریہ پوری طرح دفن کر دیا گیا ہے، اور اب صرف "مقصدی ادب" "زندگی کو بنانے والا" ادب، اور تغیر، اصلاح اور انقلاب کے نعرے لگانے والا ادب ہی چل سکتا ہے، آج کا نیا ادیب محض ادیب اور قلم کار ہی نہیں ہے، بلکہ وہ زندگی کو سنوارنے یا بگاڑنے کے کچھ خاکے اور پروگرام بھی رکھتا ہے، وہ ادب کو محض پہاڑی پر بیٹھ کر تسبیح کرنے والے کے اشلوک نہیں سمجھتا، بلکہ وہ ادب کی کشتی کو لے کر حیاتِ انسانی کی عین منجدھار میں اسے کھیتا ہے، بہرحال آج پھر ایک نیا ادب تشکیل ہو رہا ہے، جس میں "مقصدیت" "افادیت" اور "مستقبل پسندی" (Futurism) کو اولین اہمیت حاصل ہے، اور اس کے بغیر موجودہ ادبی نقطۂ نظر سے کسی کی ذرہ برابر وقعت اور قیمت نہیں ہو سکتی ہے، عام اصطلاح میں اس طرزِ فکر کو "جدیدیت" (Modernism) کہتے ہیں، اور یہ ادبی حیثیت میں اس کے مختلف نام ہیں ۔

اس تعارف اور تجزیہ کے بعد اب مجھے آپ کے سامنے یہ چیز واضح کرنی ہے، کہ ادب میں یہ سارا ارتقاء یا تبدیلی محض ادب کے دائرہ میں الگ سے کوئی ارتقاء نہیں بلکہ یہ ارتقاء اور یہ تبدیلی ہمیشہ سے وقت کے اجتماعی نظام کی پابند اور پیرو رہے، اجتماعی نظام میں تغیر کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی تبدیلی ہوئی ہے، اور ادب کی سرزمین پر نئے نئے سوتے اور چشمے پھوٹے ہیں،

کلاسکیت | چنانچہ جس وقت کلاسکیت (Classicalism) کا دور دورہ تھا، اس وقت "جاہلی مذہب" کی فرسودہ اقدار (Values) زندگی

پر چھائی ہوئی تھیں، پوری زندگی انہی کے بندھنوں میں بندھی اور کسی ہوئی تھی، کسی شخص کے لئے اس دائرہ سے ہٹ کر سوچنا، پکار کرنا وقت کے نظام تہذیب پر تیشہ چلانے کے مترادف تھا، "ہمہ گیر خدا پرستی" "عالم گیر انسانی برادری" اور "انقلاب انگیز تصور آخرت"......... جو خالق ارض و سما کے بہترین تحائف تھے، اور اس کے پیغمبروں کی لائی ہوئی دائمی نعمتیں تھیں، وہ غرض پرست انسانوں "اونچے طبقوں اور مذہبی پیشواؤں" کے ذریعہ بری طرح پامال ہو رہی تھیں، اور ستم بالائے ستم یہ تھا، کہ یہ سب کچھ "مذہب" کے لیبل اور "خدا" کے اونچے نام کے ساتھ ہی ہو رہا تھا، یورپ، ایشیا اور دوسرے براعظموں میں اگر ہم اس کلاسیکل دور (Classical Period) پر ایک نظر ڈالیں، تو ہمیں معلوم ہوگا، کہ سب جگہ اسی جھوٹے مذہب کی جکڑبندیوں اور اس کے نام نہاد علمبرداروں کی قید و بند کے سوا اور کچھ نہیں تھا، یورپ میں پاپائیت اور پادریت (Priesthood) پوری زندگی پر چھائی ہوئی تھی، اور اس کے ساتھ ہی بادشاہت (King's Ship) بھی پورے زور پر تھی اور یہ "دونوں جھوٹے خدا" بلکہ زیادہ صاف لفظوں میں خدا اور مذہب کے "ہوشیار باغی" متحد ہو کر اپنی جہانبانی اور حکمرانی کے لئے افراد معاشرہ کے ایک ایک گوشہ پر چھائے ہوئے تھے، ان لوگوں کے نقطۂ نظر سے ہر وہ چیز غلط تھی، جو ان کے مفاد کو نقصان پہنچانے والی ہو، جو ان کے قائم کردہ نظام زندگی کو توڑنے والی ہو، جو ان کی عمارتوں کو گھن کی طرح کھا جانے والی اور ان کی تعمیروں کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے والی ہو، چنانچہ ان لوگوں نے زندگی کے اور معاملات کی طرح "ادب" کو بھی خاص خاص حدود کا پابند بنا رکھا تھا، اور ادب کے دائرہ کو اس قدر تنگ اور محدود کر دیا تھا، کہ اس میں زیادہ سے زیادہ بادشاہوں کی مدح و قصیدہ خوانی کے اور کوئی کام کی بات نہ ہوتی تھی۔ پھر یورپ کی طرح ہندوستان کا حال بھی یہی تھا، یہاں پر اس دور میں (Brahmanism) برہمنیت نعروں پر تھی، اور برہمن نچلے طبقات کے پڑھنے لکھنے تک کا قائل نہ تھا، بلکہ اگر کوئی کسی کو پڑھتا ہوا سن لے تو اس کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈال دیا جاتا۔ پھر اس برہمنی دور میں یورپ والوں کی "پاپائی اور شاہی" "سازش" کی طرح یہاں بھی برہمن اور چھتری سازش چلتی تھی، اور چھتریوں کو اونچا درجہ حاصل تھا، وہ گدی اور تخت حکومت کے مالک تھے، اور برہمن ان کا روحانی پیشوا تھا، اس طرح گویا زندگی کی گاڑی اس مکروہ گٹھ جوڑ کے ذریعہ چلتی تھی، اس لئے اس دور کا جتنا ادبی سرمایہ ہے، وہ سب برہمنوں یا ان کے اشارہ چشم و ابرو کے پیروؤں کا تیار کردہ ہے۔ اس میں عوام کے جذبات و احساسات کی صحیح عکاسی اور ایک عام آدمی کے رجحانات کا کہیں پتہ نہیں چلتا، یہ ادب بھی یورپین ادب کی طرح خاص خاص ضابطوں میں جکڑا ہوا تھا، جس کے دائروں کو توڑ کر کوئی بھی باہر نہیں آ سکتا تھا۔

پھر ہندوستان کی طرح دوسرے ممالک چین، جاپان، ایران اور عرب جاہلیت کا بھی یہی حال تھا، وہاں بھی برسر اقتدار طبقات جو سراسر مذہب کی جاہلی اقدار طوطمیت (Totemism) شرک اور ایسی ہی دوسری اوہام و خرافات کے پیرو تھے، زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح قلم اور زبان پر بھی حکمرانی کرتے تھے، بہرحال یہ کلاسیکل دور ایک خاص قسم کے "مذہب" اور اصل خدا پرستی سے ہٹے ہوئے جاہلی افکار کی پابندی اور غلامی میں تیار ہوا تھا، اس لئے اس میں جگہ جگہ وہی روح کارفرما نظر آتی ہے، جو جاہلانہ مذہب کی روح رواں تھی۔

رومانیت لیکن جب مذہب کے اس جاہلی تصور کے خلاف ایک ردعمل شروع ہوا، اور ایک دوسرا "دعویٰ" (Thesis) میدان میں آیا اور مادیت سے اس جھوٹے مذہب کی کشمکش اور تصادم شروع ہوا تو ہم دیکھتے ہیں، کہ اس بحرانی اور جذباتی دور میں انسان کی ہیجان خیزیوں نے ایک نیا طرز فکر ایجاد کیا، اور وہ طرز فکر "رومانیت" (Romanticism) تھا، رومانیت ایسے حالات میں آئی، جب کہ انسانی زندگی پر کوئی خاص نظام چھایا ہوا نہیں تھا، نہ تو جاہلانہ مذہب اور نہ خالص مادیت بلکہ اس وقت ایک غلط مذہب اور اس کے انتہا پسندانہ اور افراط پسندانہ ردعمل یا ایک نئے دعوے میں شدید قسم کا ٹکراؤ ہو رہا تھا، سخت قسم کا تصادم برپا تھا۔ اور حیات انسانی کی کشتی اس طوفان بلا خیزی میں اپنی منزل حقیقی سے دور سمندر کی بے رحم موجوں پر ہچکولے کھا رہی تھی، یہ زمانہ فطری طور پر جذباتی اور ہیجانی زمانہ تھا، اس زمانہ میں انسان نارا

مذہب کی قیود و بند سے نکل کر ایک تفریط پسند نظام کی گرہوں کو ڈھیلا کر کے، دوسری انتہا کی طرف سرپٹ دوڑا چلا جا رہا تھا، چنانچہ زندگی کے ہر شعبہ میں اس کا یہی مدعیہ تھا، اس لئے ادب میں بھی اس نے بے راہ روی، جذباتیت، اور جمالِ آشنائی کو پسند کیا، انگلستان کے مشہور معروف ادیب، مورخ مکالے نے اپنی کتاب (History of England chapter) میں انگلستان کے خوشگوار انقلاب (Glorious Revolution) کے بعد کے رومان انگیز تغیرات کو نہایت دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ مکالے نے صاف طور پر اس امر کی نشاندہی کی ہے، کہ کس طرح زندگی کی مرکزی قدروں کے بدلتے ہی اس کے مختلف شعبہ جات میں تغیر رونما ہوا، حتیٰ کہ ادب بھی متبدل اور متغیر ہو کر رہ گیا۔

پھر انگلستان اور یورپی ممالک کی طرح رومانیت ہندوستان میں بھی اسی وقت پھلی پھولی، جب یہاں کی اجتماعی زندگی میں لوزح اور ڈھیلا پن پیدا ہو گیا، اور زندگی کی باگیں کسی ایک ضابطۂ حیات کے ہاتھ میں رہنے کے بجائے ڈھیلی ہو کر اس کے ہاتھ سے چھوٹنے لگی تھیں، اور نئے نئے تصورات انسانی جہاز کو اپنے تھپیڑوں سے نئی نئی منزلوں کی طرف بہا لیجانے کی آرزو کر رہے تھے، چنانچہ ہندو دور میں کالیداس کی "شکنتلا" برہمن دورِ عروج کی نہیں بلکہ برہمن دورِ زوال کی پیداوار ہے، اور "شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر" کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ پھر مسلمانوں کے رنگیلے حکمرانوں کے زمانہ میں جس شعر و شاعری اور افسانہ نویسی کا دورہ پڑا تھا وہ بھی تاریخ میں من و عن محفوظ ہے، اور اس کو ہر شخص جانتا ہے۔ اسی طرح دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی رومانی اقدار اسی وقت برسرِ کار آئی ہیں، جب وہاں پر زندگی کی استوار سطح میں ہل چل مچی ہے، اور کوئی گڑبڑ رونما ہوئی ہے، ورنہ جب تک زندگی مستقبل کے قاعدوں میں کسی رہی، ایک ہی قسم کا غیر متنوع اور ضابطہ بند ادب رائج رہا۔

حقیقت پسندی | پھر جب عرصہ تاریخ میں دو متضاد نظریات کی کشمکش ختم ہو گئی اور ایک "دعویٰ" (Thesis) دوسرے جوابِ دعویٰ (Anti-Thesis) سے شکست کھا گیا، اور موجودہ تاریخ دانوں کی زبان میں ایک نیا مرکب (Synthesis) برسرِ اقتدار آ گیا، یعنے مذہب کے جاہلی تصور کے مقابلہ میں مادیت کا میاب ہو گئی، عیسائیت نیچے چلی گئی، اور الحاد اوپر آ گیا، تو پھر زندگی میں ایک طرح کا ٹھیراؤ اور سکون پیدا ہو گیا، سمندر کی تہ و بالا موجیں باہم گلے مل کر مجلس آرائی کے لئے فرش پر بیٹھ گئیں، اور اس سکون و اطمینان کی فضا میں جب کہ مادہ پرستانہ نقطۂ نظر پوری طرح چھا گیا تھا، "حقیقت پسندی" (Realism) کا نیا ادبی تصور وجود میں آیا، اگر ہم مادی تصورِ حیات کی مختلف اقدار کا تجزیہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا، کہ "حقیقت پسندی" اس کا ایک لازمی اور منطقی نتیجہ تھا، مادیت کی رُو سے اُمور مابعد الطبعیت کا انسانی زندگی سے کوئی تعلق نہیں تھا، اس کے ماننے والے صرف مشاہدے (Observation) اور تجربے (Pragmatism) کی بنیاد پر ایک ایک چیز کو پرکھ کر دیکھتے تھے، اور پھر اسے قبول کرتے تھے، حتیٰ کہ اس انتہا پسندی نے خیال، ادب اور کاوشِ قلم کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا، اور یہ طے پایا کہ ادب بھی زندگی کی حقیقی تصویر کشی، ٹھوس اور دکھائی دینے والی چیزوں پر تبصرے سے آگے نہیں بڑھ سکتا، چنانچہ انہوں نے اپنے اس رجحان کے اظہار کے لئے "حقیقت پسندی" یعنے Realism کا لفظ اختیار کیا، پھر مغربی دنیا کی طرح اس کرۂ ارض کے دوسرے مقامات پر بھی جہاں کہیں مادیت نے غلبہ پایا وہاں اس کے ساتھ ساتھ ادب میں "حقیقت پسندی" بادشاہوں کے اردلی یا مصاحبوں کی طرح پیچھے پیچھے گئی اور ہر جگہ اس نے تغیر و انقلاب برپا کر دیا۔

جدیدیت | لیکن اب زمانہ ایک قدم اور آگے بڑھ رہا ہے، یا یوں کہنا چاہیئے، کہ مادہ پرستانہ نظامِ حیات کے اندر بھی اب ایک تخریبی ہل چل شروع ہو گئی ہے، ایک نئی تباہی کے آثار افقِ تمدن پر ہویدا ہیں، اور ایک نیا انقلاب جس کے نقوش ابھی مستقبل کے دھندلکے میں پوشیدہ ہیں، اپنے سراغ رساں جنجوں اور "نقضہ کالمسٹوں" کے ذریعہ مادیت کی زمین کو اندر سے کھوکھلا کرتا جا رہا ہے، اور اس پر کھڑے ہوئے محلات اور شاہی ایوانوں کو خود مادہ پرستوں کے ہاتھوں ہی گرا رہا ہے، اور حالت یہ ہے، کہ آج مادی

نظامِ زندگی کے مختلف اجزا ایک ایک کرکے پامال ہو رہے ہیں۔ اور ہر سمت سے ایک ہمہ گیر طوفان کے لئے تیاریاں ہونے لگی ہیں، اور آنے والے تغیر کی گھنٹیاں دن بدن تیز سے تیز تر سنائی دے رہی ہیں، چنانچہ اس تغیرِ احوال سے متأثر ہو کر، پچھلے قاعدہ کے مطابق ادب نے بھی ایک باغیانہ زقند لگائی ہے، اور اب وہ کچھ ایسے اصول پیش کر رہا ہے جو "حقیقت پسندی" کی بنیادوں کو ہلا رہے ہیں اور یا تو اسے بھی جذباتیت کی طرف لے جا رہے ہیں، اور یا پھر وہ جدید العصر دو ٹوک اور علامات کے ساتھ میدان میں آ رہا ہے۔ یہ انقلابی ادب بھی مادیت کو بھی سراہتا ہے، اور خود کو ایک انقلابی بھی کہتا ہے، گویا اس انقلاب کو خود اپنی اصلیت اور حقیقت کا شعور نہیں ہے، بہرحال اس نئے مذہب کے چند مختلف اجزاء ہیں، جن کو اصطلاح میں "مقصدیت" "مستقبل پسندی" اور "ترقی پسندی" کہتے ہیں، موجودہ عہد کا ہر سمجھدار ادیب اسی راستہ کی طرف بڑھ رہا ہے، اور بڑی تیزی سے وہ اپنے قلم و کاغذ کو ہی کی خاطر کام میں لا رہا ہے۔

مجموعی اثرات | بہرحال یہ ہے ان مختلف ادبی تصورات کا تاریخی تجزیہ اب اس کے بعد ان کے مجموعی اثرات پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے، اور اس امر سے بھی واقف ہونے کی کوشش کیجئے، کہ ان تغیرات نے انسانی زندگی کو کس حد تک اور کس طرح متأثر کیا ہے، ادب کے ان مختلف مکاتیبِ فکر (Schools of Thought) میں اگرچہ ظاہری اور اوپری سطح کے اعتبار سے بہت کچھ فرق نظر آتا ہے، لیکن فی الواقع یہ تغیر اپنے اثرات و نتائج کے اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا، جس طرح ان مختلف مکاتیب کی پشت پر کام کرنے والے نظامِ زندگی میں فی الواقع کوئی بڑا تغیر نہیں ہوا یا اگر ہوا بھی تو وہ صرف ظاہر بین نگاہوں کے نزدیک ایک انقلاب انگیز تغیر کہا جا سکتا ہے، مگر ذرا گہرائی میں اتر کر جائزہ لیا جائے، تو ہم بآسانی سمجھ سکتے ہیں، کہ جاہلانہ مذہبی تصورات کی حکمرانی کے دور سے لے کر آج کے سخت مادہ پرست دور تک فی الحقیقت کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے، جاہلی مذہب کے زمانہ میں خدا پرستی کا کوئی ہمہ گیر تصور نہیں تھا، بلکہ وہ زندگی میں خدا کے تصور کو چند مخصوص گوشوں میں بند رکھنے کا قائل تھا، باقی تمام معاملات و مسائل میں وہاں خدا سے باغی عناصر ہی کام کرتے تھے، مذہب کے نام سے مذہبی پیشوا اپنی ذاتی اغراض کی تکمیل کرتے تھے، چنانچہ آج بھی یہی ہوتا ہے کہ مادیت برسرِ اقتدار ہے، اور "خدا پرستی" محکوم اور محدود ہے، اور ایک غیر انقلابی تصور کی طرح سکڑ سمٹ کر رہ گئی ہوئی بیٹھی ہے۔ اور آج کل کے اغراض پرست طبقات پروپگنڈے کے لامحدود ذرائع استعمال کر کے اپنا کام نکالتے ہیں، بہرحال زمانہ کے اتنے بُعد، وقت اور مدت کے اتنے بڑے فرق، تاریخ نویسوں کی لاتعداد موشگافیوں اور ارتقاء پرستوں کی ان گنت خوش فہمیوں کے باوجود ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے، کہ دنیا ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکی، وہ عرصہ سے ایک ہی مقام پر کھڑی ہوئی ہے، اور جو کچھ تبدیلی ہوئی ہے، وہ محض سطحی ہے آخر کون یہ دعویٰ کر سکتا ہے، کہ اس وقت بھی انسانی تمدن میں وہی سب خرابیاں موجود نہیں ہیں، جو آج سے ڈیڑھ دو سو برس قبل انسانی سوسائٹی میں پائی جاتی تھیں۔ بہرحال انسانی تہذیب اور نظامِ زندگی کی طرح ادب میں بھی یہ مختلف نظریات سطحی تبدیلیوں سے زیادہ اور کوئی بڑا مظاہرہ نہیں ہیں، خدا پرستی کے ہمہ گیر تصور سے بے خبری جس طرح کلاسیکل ادب میں پائی جاتی ہے، وہی رومانیت، حقیقت پسندی اور موجودہ ترقی پسندی میں بھی پائی جاتی ہے، انسانی خواہش اور نفس کی اندھا دھند پیروی کا جو خاکہ کلاسیکل ادب میں نظر آتا ہے، وہی رومانیت، حقیقت پسندی اور انقلاب پسندی کی جان ہے، اسی طرح اور دوسری اقدارِ حیات مثلاً انسان پر انسان کی حکمرانی، انسانی قانون کی اطاعت، دنیا پرستی (Secularism) اور آخرت کے انقلاب آفریں تصور سے بے خبری، قدیم جاہلی زمانہ کے ادب سے لے کر آج کے جدید ترین زمانہ کے ادب تک میں یکساں موجود ہیں، اور اس اعتبار سے "گل بکاولی"، اور "الف لیلیٰ" کے قصہ ہائے پارینہ سے لے کر "انطون چیخوف" "گورکی" "برنارڈ شا" اور "ویلز" جیسے حقیقت پسند اور انقلاب پسندوں کی تصنیفات میں سرِ مو فرق نہیں ہے، زندگی کی جو کشمکش، حیاتِ انسانی کی جو تصویر ہم کو قدیم ادب میں نظر آتی ہے، وہی تصویر آج کے ادب میں بھی موجود ہے، فرق جو کچھ ہوا ہے، وہ لباس وضع قطع، بول چال، اور تکنیک میں ہوا ہے، ورنہ موجودہ ادب کے کردار قدیم ادبی کرداروں سے اپنی خواہشات، تصورات، اور مقصدِ زندگی کے اعتبار سے ذرہ برابر بھی مختلف

نہیں، چنانچہ اس یکسانی اور ہم آہنگی کا نتیجہ یہ نکلا کہ قدیم جاہلی تمدن اور ادب جس طرح انسانی دکھوں کا کوئی صحیح علاج نہ کر سکے، انسانی بیماریوں کے لئے کوئی مفید نسخہ ثابت نہ ہو سکے، اسی طرح آج کا ادب بھی غیر تعمیری اور غیر انقلابی ادب ہی ہے، بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں، کہ اس دور کا ادب اصلاحی ہے، انقلاب انگیز ہے، اور تعمیری ہے، لیکن جب یہ ادب بھی انہیں اقدار حیات پر چل رہا ہے، جو آج سے پانسو برس پیشتر رائج تھیں، تو آخر اس ادب سے وہ نتائج کیسے برآمد ہو سکتے ہیں، جو اُس دور کے جاہلی نظام فکر سے برآمد نہ ہو سکے، اسی طرح جب یہ چیز بھی روز روشن کی طرح ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہے، اور جس کے وجود سے صرف مادر زاد اندھا ہی انکار کر سکتا ہے، کہ موجودہ مادی تہذیب اور آج کے انقلابی تصورات چاہے وہ کمیونزم کے ہوں، یا سرمایہ داری کے، آمریت کے ہوں، یا جمہوریت کے، انسانی بیماریوں کا علاج کرنے میں سراسر ناکام رہے ہیں، اور ان کی ناکامی اور بدحالی دن بدن بڑی تیزی سے کھلتی جا رہی ہے، تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے، کہ ان اصولوں پر چلنے والا ادب تعمیری ہے، یہاں تو پوری تہذیب، پورا نظام زندگی ہی غیر تعمیری، غیر انقلابی اور تباہ کن ہے، اس میں کسی جزء کو لے کر آپ یہ تعمیر، اصلاح اور ترقی پسندی کا لیبل کیوں چپکا رہے ہیں؟ ظاہر بات ہے کہ جو اس جہاز میں بیٹھا ہے، وہ اسی طرف جا رہا ہے، جس سمت کو جہاز حرکت کر رہا ہے، اب اگر کوئی بے وقوف آدمی جہاز کے اندر بیٹھے بیٹھے اپنا رخ پھیر لے اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے، کہ نہیں وہ تو جہاز کی مخالف سمت کو حرکت کر رہا ہے، تو ایسے بے وقوف پر ہنسے بغیر نہیں رہا جا سکتا

سچا انقلابی ادب آج کے زمانہ میں سچا انقلابی ادب تو وہ ہو سکتا ہے، جو وقت کے حکمران تصورات اور کارفرما نظریات سے ہٹا ہوا ہو۔ اور ان کے برعکس بالکل مخالف سمت پر گامزن ہو، اس وقت بے خدا تہذیب کا چلن ہے، انقلابی ادب کو خدا پرست ہونا چاہیئے، اس وقت انسانی خواہش کی پرستش کی جاتی ہے، اور انسان انسان کی اطاعت کرتا ہے، نئے ادب کو اللہ تعالیٰ کی مرضی اور قانون فطرت کی پیروی کرنی ہوگی، اس وقت دنیا پرستی پائی جاتی ہے، جدید تعمیری ادب دنیا کو آخرت کے حصول کی خاطر سنوارنے کا جذبہ لے کر اٹھے گا، آج جنسی بے راہ روی اور صنفی آوارگی (Sexual Anarchy) کا دور دورہ ہے، نیا اصلاحی ادب صنفی اتحاد کے نظم اصولوں اور جنسی تربیت کے با اخلاق ضابطوں کا علمبردار ہوگا، اس دور میں ہر طرف قوم پرستی، گروہ پرستی اور شکم پرستی کا چلن ہے، اور طبقہ واریت اور انسانی خود غرضی نے ہر جگہ پنجے گاڑ دیے ہیں، لیکن زمانہ کو بدلنے والا ادب ان تمام اقدار سے ہٹ کر سوچے گا، اور وہ انسانی مساوات، عالمگیر انسانی برادری، اخوت، اور تمام انسانوں کے لئے بغیر کسی امتیاز کے یکساں حقوق اور مراعات کا علم لے کر اٹھے گا، چنانچہ آج ہم جس غرض کے لئے جمع ہوئے ہیں، وہ اسی قسم کے ادب کو آپ حضرات کے سامنے پیش کرنا ہے، اور اسی کے لئے تعمیر و ترمیم، تغیر و اصلاح اور ترقی و کامرانی کے لئے قدم اٹھانا ہے، آج سے آٹھ نو سال قبل جب اس دیس میں خالص اسلامی اصولوں پر ایک سچی انقلابی اور اصلاحی تحریک اٹھی، یعنے اسلامی تحریک کا آغاز ہوا، تو اس تحریک کے روز اول ہی سے یہ خیال پیدا ہو گیا، کہ اس نئے انقلابی مقصد کے حصول کے لئے جہاں علمی، تنقیدی، تحقیقی اور اجتہادی مضامین کی ضرورت ہے وہیں ادب لطیف میں بھی ایک بڑے تغیر و اصلاح کی ضرورت ہے، چنانچہ اسی غرض کے لئے اس کام کا آغاز عمل میں آیا، اور اب یہ ہندوستان اور پاکستان میں روز افزوں ترقی کے ساتھ جاری ہے، ابتدا میں اس راستہ میں بہت کچھ مشکلات پیش آئیں، لیکن اب یہ مشکلات رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی ہیں، اور راستہ دن بدن آسان اور ہموار ہوتا جا رہا ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے، کہ ہم نے جو کچھ کیا ہے، وہ اس فن کی کوئی ترقی یافتہ منزل ہے، بلکہ ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں، کہ ابھی تو بہت کچھ کرنا باقی ہے، یہ تو صرف "ابتدائے عشق" ہے، ابھی ہمیں اپنے نئے انداز فکر کے اعتبار سے بہت سی جدید فنی تخلیقات کو وجود بخشنا ہے، اور اس اعتبار سے ہمارا کام بالکل ابتدائی منزل میں ہے، لیکن اتنا تو ہم ہر وقت کہہ سکتے ہیں، کہ جو کچھ ہم کرنا چاہتے ہیں، یا جس کی داغ بیل ہم نے ڈالی ہے، وہ موجودہ راہوں سے الگ ایک سچی تعمیری اور اصلاحی راہ ہے، جس پر ہمیں خدا کی مدد کے ساتھ آگے بڑھنا ہے۔۔۔

ہمارے مقاصد ہمارے سامنے جہاں پر چند اہم مقاصد ہیں کہ :-

(۱) خدا پرستی کے ہمہ گیر تصور کی طرف دعوت دی جائے ——— (۲) انسان پر انسان کی حکمرانی کو مٹا کر خدا کی حکمرانی قائم کرنے کی جدوجہد کی جائے ———

(۳) خواہش پرستی، نفس پرستی اور بھوک کے بجائے اعلیٰ اخلاق کی ترویج و اشاعت ہو، اور انسان کی اصول فطرت کے مطابق رہنمائی عمل میں آئے ———

(۴) طبقاتی نزاع، قومی کشمکش اور نسلی تفوق کے اصولوں پر تنقید کر کے طبقاتی ہم آہنگی، بین الاقوامی امن و اتحاد اور ایک ہی عالمگیر انسانی برادری کے نظریات کی اشاعت کے لئے کوشش کی جائے ——— (۵) اور دنیا پرستی کے بجائے آخرت پسندی کے انقلاب آفریں تصور کی اہمیت اور افادیت کو پیش کر کے دنیا کو آخرت کی کھیتی کی شکل میں استعمال کرنے کی ترغیب دی جائے، وہیں ہم .... اس امر پر بھی غور کر رہے ہیں، کہ ایسا حسین و جمیل ادب پیش کیا جائے، جس میں ایک طرف کلاسکیت کی تمام خوبیاں ہوں، تو دوسری طرف رومانیت حقیقت پسندی اور جدیدیت کے ہر ایک صالح عنصر کو جذب کر لیا جائے، اور ان نئے مقاصد سے اس نئی تکنیک کو ہم آہنگ کر کے موجودہ ادب سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ادب پیش کیا جائے، ہمارے سامنے محض آگے بڑھنا کوئی معنی نہیں رکھتا ہم آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ حق کو لے کر آگے بڑھنا چاہتے ہیں - ہمارا دعویٰ ہے، کہ جو اصول ہمارے سامنے ہیں، ان اصولوں پر جب بھی ایک نظام زندگی وجود میں آیا ہے، اس کے نتائج تاریخ کے سینے پر نہایت ہی خوشگوار نکلے ہیں، اور ان اصولوں کے ماتحت ہر دور میں ایک سچا، اصلاحی اور تعمیری ادب ہی وجود میں آیا ہے، اس لئے اگر آج بھی جب کہ موجودہ مادہ پرستانہ نظام زندگی گھٹنے ٹیک رہا ہے، اور منہ کے بل گر رہا ہے، ان اصولوں کو اپنا لیا جائے، اور ایک طرف ان کی بنیادوں پر صالح نظام حیات برپا کرنے والی انقلابی پارٹی اٹھ کھڑی ہو اور دوسری طرف ادبی "چھاپہ مار دستے" اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں، تو کوئی تعجب نہیں، کہ ہم جلد ہی موجودہ غلط اور تباہ کن نظام کو شکست دیدیں اور انسانیت کو موت کے پنجے سے چھڑانے میں کامیاب ہو جائیں،

آج کے اجتماع میں آپ کے سامنے وہ چند ادبی تخلیقات بھی پیش کی جائیں گی، جو ان نئے اصولوں پر ہمارے نئے اہل قلم تیار کر رہے ہیں، بہت ممکن ہے ان میں کی بعض چیزیں آپ کو پسند نہ آئیں، اور کچھ ہماری فنی نیم پختگی کے باعث اور کچھ اس ادب کے اجنبی پن کے باعث آپ کو اس میں دلچسپی نہ ہو، یا فنی اعتبار سے آپ کے نزدیک وہ محض مضحکہ خیز ہوں، لیکن جن طاقتور ادبی مقاصد کو لے کر ہم اٹھے ہیں، ان شاء اللہ تعالیٰ ان کی بنیاد پر ہم بہت جلد موجودہ دور کے ترقی یافتہ ادب سے کہیں بڑھ چڑھ کر انقلابی اور جاندار ادب دنیا کے سامنے رکھ سکیں گے ___

تبصرہ و تنقید ایک بات اور بھی میں آپ کے گوش گذار کر دوں، ہمارا طریقہ حلقہ ادب اسلامی کے اجتماعات میں یہ رہا ہے کہ پہلے ہم اپنے لکھنے والے سے ایک چیز سنتے ہیں، اور اس پر تنقید اور تبصرہ کے لئے اشارات لکھتے جاتے ہیں، پھر جب اس کا مطالعہ ختم ہو جاتا ہے، تو باری باری سے تبصرہ کرنے والے افراد تبصرہ کرتے ہیں، اس میں سب سے زیادہ اہمیت ہم اپنے مقصد کو دیتے ہیں، اس کے بعد زبان، ادب، تلفظ اور فن کے اعتبار سے رائے زنی ہوتی ہے، اور سب کے آخر میں یہ فیصلہ کیا جاتا ہے، کہ آیا وہ تحریر اشاعت کے لائق ہے یا نہیں، اس سلسلہ میں خود لکھنے والے کو بھی جوابی توضیح کا موقعہ دیا جاتا ہے - چنانچہ اس موقعہ پر بھی ہم اسی طریقہ کار پر عمل پیرا ہوں گے، پہلے پروگرام کے مطابق آپ کے سامنے کچھ نوشتے پیش کئے جائیں گے، اس کے بعد آپ میں سے جو صاحب چاہیں ان پر رائے زنی کر سکتے ہیں، اور ان کی فنی ادبی اور مقصدی خامیوں پر روشنی ڈال سکتے ہیں"

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

اس کے بعد حسب نظام العمل عبدالباسط صاحب مقصد نے اپنی نظم "امن عالم کا راز" سنائی، اسے سن کر ناظم جلسہ کی سنجیدہ اور علمی تقریر کے بعد لوگوں کو یوں محسوس ہوا، جیسے انہوں نے ٹھنڈے شربت کا کوئی گلاس پی لیا ہے - سب نے تحسین و آفرین کہا، یہ نظم خود مقصد کو بھی اپنی دوسری نظموں سے زیادہ پسند ہے (اسے صفحہ ۲۰ پر ملاحظہ فرمائیے)

اس کے بعد پروگرام کی شمع محمود فاروقی کے سامنے آئی، کاغذوں کے بھاری پلندے کو تولتے ہوئے وہ آگے بڑھے اور "کرسی نشین" ہو کر افسانہ سنانا شروع کر دیا، "بریں" افسانے کا عنوان تھا۔ (اسے صفحہ ۲۳ پر دیکھئے) کثیر مجمع ساکت و صامت بیٹھا افسانہ سنتا رہا، اور جب فاروقی نے افسانہ ختم کیا تو مجمع نے پہلو بدلا، اب خواجہ صفی اللہ کی باری تھی، "قلب مومن خدا کے حضور میں" انہوں نے اپنا ایک ادب پارہ سنایا، جو پسند کیا گیا۔ (اسے صفحہ ۲۹ پر دیکھئے)

اس کے بعد اصغر علی عابدی نے "لوگ کہتے ہیں!" ایک "آزاد نظم" سنائی جو موجودہ آزاد نظموں کی تکنیک پر ہی لکھی گئی تھی، مگر اس کا مقصد شکم پرستی اور نفس پرستی کے نظریات پر سخت تنقید تھا، اسے بھی سننے والوں نے سراہا۔ (اسے صفحہ ۴۰ پر دیکھئے)

پروگرام کا یہ سلسلہ کچھ دیر تک چلتا رہا، اب رات کافی ٹھنڈی ہو گئی تھی اور ایک حد تک سننے والے اور آنے والے "حلقہ ادب اسلامی" کے ماحول سے مانوس ہو گئے تھے، اس لئے اس کے بعد ہی تبصرہ و تنقید اور تجاویز و تبادلۂ خیال کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جس میں حاضرین نے بالکل کھلے دل سے حصہ لیا۔

تجاویز اور تبادلۂ خیال | صدر جلسہ (ابن ندیم وفا) کی تحریک پر حاضرین میں سے جناب غلام دستگیر رشید پروفیسر نظام کالج نے حلقہ ادب کے کام پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا آپ نے کہا کہ "اس وقت تک جو چیز بھی یہاں پڑھی گئی ہے، وہ بڑی حد تک قابل قدر ہے"۔

آپنے مزید کہا کہ "اس میں شک نہیں، کہ جدید اسلامی ادب میں Dominating خیال خدا کی حاکمیت اور اس کے وسیع اقتدار کا ہی ہوگا، اگر اس کے ساتھ ساتھ ہمیں جمالیاتی پہلو سے بھی ادب کو مزین کرنا چاہئے اور اس میں ایسی کشش اور جاذبیت پیدا کرنی چاہئے کہ ہر کس و ناکس کے لئے اس میں دلچسپی اور دلکشی ہو، ہم کائنات میں صرف اللہ تعالےٰ کے با جبروت اقتدار ہی کو نہیں دیکھتے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس وسیع و عریض دنیا میں، مناظر قدرت اور کارخانہ قدرت کی گوناگونی اور اس کا نظر فریب حسن و جمال قدم قدم پر ہماری توجہ کو اپنے اندر جذب کرلیتا ہے، یہ سب چیزیں دراصل اللہ تعالےٰ کی صفت رحم و عدل کی نمائندہ ہیں، اس لئے ہمیں اپنے ادب میں ان سب کی نمائندگی کرنی چاہئے۔

اس اجتماع میں ابتداء سے لیکر آخر تک جو چیز پڑھی گئی ہے، وہ اس اعتبار سے بڑی حد تک کامیاب ہے"۔

جناب غلام دستگیر رشید کا یہ تبصرہ حلقہ ادب کے کام پر ایک ہمدردانہ اور محبت بھرا پیام تہنیت تھا آپ نے ایک حد تک حاضرین کے سامنے ایسے پہلوؤں کو واضح کر دیا، جو اب تک ان کے سامنے نہیں آئے تھے۔

اس مختصر سی تقریر کے بعد خواجہ صفی اللہ نے ایک تجویز پیش کی:۔

(۱) تجویز:۔ "کیا اچھا ہو کہ ہم میں کے باشعور ادیب ہماری صلاحیتوں کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ کون کس موضوع سے فطری مناسبت رکھتا ہے، اور اب تک کے لکھے ہوئے مضامین کا مطالعہ کر کے یہ کام بآسانی کیا جا سکتا ہے، بہتر ہو کہ جو جس موضوع پر لکھنے کے اہل پائے جائیں اس موضوع پر لکھنے کے لئے ان کو معیاری حد تک تیاری کرنے کی ایک باضابطہ مہم شروع کی جائے"۔

اس تجویز پر اکثر دوسرے اصحاب نے بھی اظہار خیال کیا۔

آخر میں ناظم حلقہ نے کہا کہ "یہ بات تو ابتدا سے ہمارے پیش نظر رہی ہے کہ جو شخص جس صنف ادب کے لئے موزوں ہو وہ اپنے آپ کو اسی کے لئے تیار کرے، لیکن ابھی اتنی کم مدت میں اور اس ابتدائی مرحلہ پہ یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ کون کس شعبہ میں زیادہ اچھا کام کر سکتا ہے، چنانچہ جب کچھ دن گذر جائیں گے، تو ہم یہ کام بآسانی کر سکیں گے، ہم ضرور اس کی طرف توجہ کریں گے۔ البتہ اتنی بات اور سمجھ لینی چاہئے کہ ہر شخص کو خود اپنے بارے میں یہ فیصلہ کرنا چاہئے کہ وہ کس شعبۂ ادب میں زیادہ بہتر طریقہ پر کام کر سکتا ہے، اس کے بعد

دوسرے اصحاب بھی مشورہ دیں تو مناسب ہے۔

(۲) تجویز: — دوسری تجویز حلقہ ادب اسلامی کے معتمد عثمانی صاحب نے پیش کی، انہوں نے کہا کہ "جس طرح دوسرے اہلِ قلم محض "ادب" ہی کی طرف متوجہ نہیں ہیں، بلکہ وہ دیگر علوم کا گہرا تحقیقی مطالعہ کرکے ان پر بھی رائے زنی کرتے ہیں، اور اپنے نقطۂ نظر سے ان کی تشکیلِ جدید کرتے ہیں، اسی طرح ہمارے لکھنے والوں کو بھی موجودہ ترقی یافتہ علوم کا گہری نظر سے مطالعہ کرکے ان پر تنقید کرنی چاہئے، اور ان کے متوازی اسلامی نظریات کی بنیادوں پر علوم کو پھر سے مدوّن کرنا چاہئے"۔

اس پر کسی صاحب نے تبصرہ نہیں کیا، ناظم حلقہ نے کہا کہ "یہ کام تو بہرحال کرنے کا ہے، اور اس کے لئے بھی حلقہ ادب اسلامی" میں گنجائش ہے، لیکن فی الواقع ایسے کام "اکیڈمی" میں ہونے چاہئیں، اس وقت ہمارے پیشِ نظر زیادہ تر تفریحی ادب کی تیاری ہے، مگر ایسے مضامین کی تیاری سے بھی ہم گریز نہیں کرتے"۔

(۳) تجویز: — محمد محی الدین صاحب سابق وکیل ضلع میدک دکن نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ "ہمیں زیادہ تر آسان اور دلکش لٹریچر تیار کرنا چاہئے، جس میں لوگوں پر تنقید اور طنز سے زیادہ محبت آمیز دعوت کا پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہو، جیسے "الحسنات" اور "الانصاف" کے اکثر مضامین ہوتے ہیں"۔

اس پر بھی کسی نے تبصرہ نہیں کیا، ناظم حلقہ نے اظہارِ رائے کرتے ہوئے بتایا کہ "اس کام سے ہمیں بھی کب اختلاف ہے، آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ دراصل ہمارے کام کا ایک شعبہ ہے، البتہ ہم کسی ایک نوعیت کے کام پر خاص طور سے زور نہیں دیتے، جو شخص جس طریقہ اور جس ڈھب پر لکھ سکتا ہے، اسی پر وہ لکھے گا، اسے مجبور کرکے کسی خاص راستہ پر نہیں ڈالا جاسکتا، ہر شخص کی افتادِ طبع ایک جیسی نہیں ہوتی، بلکہ پڑھنے والوں اور لکھنے والوں میں مختلف طبائع کے لوگ ہوتے ہیں، اس لئے ہمیں ہر قسم کے کام کرنے ہیں، کسی کو کرنا اور کسی کو چھوڑنا ہمارے پیشِ نظر نہیں ہے"۔

اس کے بعد کوئی اور تجویز نہیں آئی اور نہ کوئی تبصرہ ہوا، نظامیں کافی خنکی پیدا ہو چکی تھی اور رات کا ابتدائی حصہ گذر گیا تھا، لیکن لوگ پھر بھی جمے ہوئے بیٹھے تھے، چنانچہ وقت کے بہت بڑے حصہ کے گذر جانے کے خوف سے آخر میں صدرِ جلسہ حضرت ابن ندیم وفا نے حاضرین سے مختصر سا خطاب فرمایا، خطاب مختصر ہونے کے باوجود نہایت دلچسپ اور پُرمعنی تھا۔

صدرِ جلسہ حضرت ابنِ ندیم وفا کی تقریر

حمد و ثنا کے بعد حضرت ابن ندیم وفا نے فرمایا کہ "میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا، اس کا نصف سے زائد حصہ جناب غلام دستگیر رشید صاحب نے کہہ دیا، اس لئے مجھے کچھ زیادہ کہنے کی حاجت نہیں رہی۔ یوں بھی ادب اور ادبی مشاغل کو چھوڑے ہوئے برسوں گذر گئے، ورنہ ایک زمانہ تھا، کہ میں بھی شعر کہا کرتا تھا، تاہم اتنی بات تو میں اس وقت بھی عرض کروں گا، کہ حیدرآباد میں اور یہاں کے علاوہ دوسرے مقامات پر کچھ نوجوانوں نے اسلامی اصولوں پر ادب کی تعمیرِ جدید کا جو کام شروع کیا ہے، یہ کام ابھی اپنی ابتدائی منزل میں ہے، لیکن اس کی اٹھان سے اندازہ ہوتا ہے، کہ ان شاء اللہ یہ پھلے پھولے گا، اور اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرے گا۔

ہمارے ادیبوں کو یہ بات بھی گرہ میں باندھ لینی چاہئے، کہ ادب میں محض تنقید اور توڑ پھوڑ کے عمل کا تذکرہ نہ ہو، بلکہ تعمیری جذبات کا اظہار بھی کافی ہونا چاہئے، کیونکہ ہم جس دعوت کو لے کر اٹھے ہیں، وہ ایک ہمہ گیر دعوت ہے، جو زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے، اس لئے اس کو مختلف اصنافِ ادب کی شکل میں پیش کرتے وقت اس کی ہمہ گیری کا خیال رکھنا ضروری ہے، بس یہ چند باتیں میں نے عرض کی ہیں، اور اب وقت بھی کافی گذر چکا ہے، اس لئے اسی پر ختم کرتا ہوں، اس پر غور کیجئے، اس سے پہلے ہمارے ساتھیوں نے آپ کے سامنے بہت سے گوشوں کو واضح کر دیا، اور اب اتنا بہت کافی ہے"۔ — — — صدرِ جلسہ کی تقریر کے بعد پروگرام ختم ہو گیا، اس وقت رات کے تقریباً ساڑھے گیارہ بج رہے تھے، آخر میں معتمدِ جلسہ نے "حلقہ ادب اسلامی" کے اجتماعات کی تاریخوں کا اعلان کیا، اور ادب پسندوں کو اس میں شرکت کی دعوت دی اور اجتماع برخاست ہوا۔

امنِ عالم کا راز!

عبدالباسط مقصد

زندگی سرنگوں ہے رقصاں موت — ہر طرف خوف ہے، ہلاکت ہے!
بڑھتے جاتے ہیں کال کے گھیرے — ہر طرف شور ہے، قیامت ہے!
وقت کی آنکھ سے ہے خوں جاری — ہر طرف جنگ ہے، بغاوت ہے!

عصرِ حاضر کا فلسفہ بے نظام! — لوٹ و غارت گری ہے اس کا مزاج
عقل کی رہبری میں دانستہ — چل رہا ہے بہیمیت کا راج
مٹ رہا ہے امن کا نام و نشاں — ہو رہی ہے گلی گلی تاراج

امنِ عالم کے یہ نئے خالے — امنِ عالم مٹانے والے ہیں!
زندگی — زندگی کی عظمت کو — خاک و خوں میں ملانے والے ہیں!
دل دہل جائے جس سے دنیا کا — فتنے ایسے جگانے والے ہیں!

جو کہ ہر دور ہر زمانے میں — مشعلِ زندگی تھا ہے قرآں
راہِ حق اختیار کرنے میں — امنِ عالم کا راز ہے پنہاں
فکر و کردار جب سنورتے ہیں — خود بدلتا ہے زیست کا عنواں

ظلمتِ شب میں راہ دکھلانے — اب بھی قرآن کے سپارے ہیں
عظمتِ بندگی میں پوشیدہ — حق و انصاف کے شرارے ہیں
پُر فریب مادیت کی دنیا میں — ظلم کے تیز تند دھارے ہیں

نور بن کر جہانِ ظلمت سے — پھر صداقت اُبھرنے والی ہے!
نور ہر سمت رسنے والا ہے — تیرگیِ شب کی چھٹنے والی ہے!
وقت کروٹ بدلنے والا ہے — زندگی پھر سنورنے والی ہے!

("حلقۂ ادبِ اسلامی" کے سالانہ اجتماع میں پڑھی گئی) ـ ـ ـ

"پریمی"

محمود فاروقی

جاڑے کی رات تھی، شہر سے پہاڑی دیہاتوں کی طرف جانے والی اس سڑک پر گہرا کُہر چھایا ہوا تھا، جو سانپ کی کنڈلی کی طرح پہاڑی مسافر خانہ کو اپنے نیم دائرہ میں لیئے ہوئے نشیب کی طرف چلی گئی تھی۔

موٹروں کے اڈے سے قریب عمدہ تعمیری لکڑی سے بنا ہوا یہ چھوٹا سا مسافر خانہ موسم بہار کے برعکس اداس اور سنسان تھا، تاہم اس رات مختلف سمتوں میں سفر کرنے والے مسافر جمع ہو گئے تھے، کھانے سے فارغ ہونے کے بعد درمیانی کمرہ کی میز پر وہ گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے، اور کچھ ہی دیر میں رسمی گفتگو گرما گرم بحث میں تبدیل ہو گئی ــــــ ظاہر ہے جاڑے کی سرد راتوں میں ٹھنڈی اور نرم بات چیت کی بہ نسبت تیز تیز گرم بحث ہی وقت گذاری کا اچھا ذریعہ بن سکتی ہے، چنانچہ انگیٹھی کے لپکتے ہوئے شعلوں، کافی کی گرم گرم پیالیوں اور سگریٹ کے مٹیلے دھوئیں میں بحث بل کھاتی ہوئی ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی طرف فرّاٹے بھر رہی تھی، گفتگو میں حصہ لینے والوں کے چہرے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں تمتما اٹھتے تھے۔

میز کے اطراف بیٹھنے والوں میں ایک موٹی ادھیڑ عمر کی سرخ و سپید رنگت والی عورت تھی، جو اس گفتگو سے قدرے بیگانہ، موسٹر بُننے میں مصروف تھی، اس کے قریب کاسنی رنگ کا گرم جسٹر پہنے ایک دُبلی پتلی سادنلے رنگ کی نوجوان لڑکی اپنے ہاتھ میں ایک ناول تھامے تیز تیز گفتگو کر رہی تھی، اس کی آنکھوں کے انداز اور گفتگو میں ہاتھوں کی بے سبب اضطراری حرکت سے اس کے انتہائی جذباتی اور غیر مستقل مزاج ہونے کا اندازہ ہوتا تھا، اس کے ہاتھ میں وہ نیلی کتاب تھی، جس پر سرنامے کے حروف "چٹخارے" دیکھ کر بڑی حد تک اس کے لذت پسندانہ ذوق کا اندازہ ہوتا تھا، اس کے مقابل میں بیٹھا ہوا چھریرے بدن کا شخص ان لوگوں میں سے تھا، جن کے زیادہ تر اوقات مسافرخانوں ہی میں گذرتے ہیں، اور جو ہر محفل میں اپنی جگہ بنا لینے کے گُر سے واقف رہتے ہیں، وہ ایک ماہرِ فن کی طرح مناسب اتار چڑھاؤ کے ساتھ ہر موضوع پر مسلسل بول رہا تھا، اور ساتھ ہی ساتھ وہ اس لڑکی کی آنکھوں کے گرد پڑے ہوئے ہوس ناک حلقوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا ــــــ چوتھی نشست پر ایک، کُبڑا شخص منہ میں گھٹیا تمباکو کا موٹا سا چُرٹ دبائے اور کلپاک کی گرم ٹوپی پہنے اپنے دونوں ہاتھ میز پر پھیلائے ہوئے اس طرح جھکا بیٹھا تھا، کہ کمرہ کی مدھم روشنی میں یہ اندازہ لگانا مشکل تھا، کہ اس کی پوری توجہ ان دونوں کی گفتگو سننے پر لگی ہوئی ہے، یا ان کو گھورنے پر، وہ اس طرح ٹکٹکی لگائے ہوئے تھا، جیسے وہ ان باتوں کی تہہ میں ان جذبات کو کریدنا چاہتا ہے، جو اُن کے ذہنوں میں پوشیدہ ہیں، تھوڑی تھوڑی دیر سے وہ اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتا اور کچھ نہ کچھ نکال کر کھاتے ہوئے آہستہ سے بڑبڑانے لگتا، یوں خاموش بیٹھے دیکھ کر کہ وہ اس ماحول کا ایک فرد بھی ہو، اور بظاہر نہیں بھی، فضا کی سطحیت میں کچھ اس طرح کی گہرائی پیدا ہو رہی تھی، جس سے دوسرے بیٹھے ہوئے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے، چنانچہ موٹی عورت سوئی چلاتے چلاتے ایک آدھ بار اچٹتے ہوئے اُسے دیکھ لیتی اور پھر وہ نفرت آمیز لاپروائی کے ساتھ اپنے کام میں لگ جاتی، کاسنی جسٹر پہنی ہوئی خاتون بھی کتراتی ہوئی نگاہ سے قدرے سہم کر اُسے دیکھ لیتی۔

ایک نشست اور خالی تھی، مسافر خانہ کی عام نشستوں کی طرح کہا نہیں جا سکتا، کہ وہ کب پُر ہو جائے گی اور اس پر بیٹھنے والا کس قماش کا شخص ہوگا ــــــ ایکٹروں لیڈروں، ایکٹرسوں، فلموں اور کتوں سے متعلق کافی گفتگو ہو چکی تھی، موضوع سے تھک کر باتونی لڑکی نے ایک دوسری ہی بات چھیڑ دی۔

کیا آپ نے یہ ناول دیکھا ہے؟

"چٹخارے" ارشد کا لکھا ہوا۔ کیوں نہیں!"

چوتھی نشست والا بوڑھا اپنی انگلیوں کو مروڑتے ہوئے کچھ بڑبڑایا، اور اس نے اپنی جیب سے کچھ دانے نکال کر پھانک لئے۔ اس وقت باہر کا دروازہ کھلا، اور سردی کی ایک
ہر کے ساتھ اکہرے بدن کا دراز قد متوسط عمر کا مسافر اندر داخل ہوا، نووارد سیاہ رنگ کے لانبے کوٹ میں ملبوس تھا اگرم کوٹ کے اٹھے ہوئے کالروں کے درمیان اس کا
ف چہرہ ڈھکا ہوا تھا، صرف جھکتی ہوئی چوڑی پیشانی اور دو گہری نیلگوں آنکھیں نمایاں تھیں، اس نے گوشہ میں رکھے ہوئے چھوٹے ٹیبل پر اپنا بیگ رکھ دیا، اور کھونٹی
اری کوٹ ٹانگتے ہوئے کمرہ کے ماحول پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور آخری خالی نشست پر بیٹھ گیا،
نووارد کی آمد پر گفتگو بند ہو گئی تھی، لیکن خاموشی کو بڑھانے میں سانولی لڑکی نے ایک طرح کی سبکی ہوتی ہے سوچ کر سیاق و سباق کا لحاظ کئے بغیر اچانک کہنا شروع کیا لیکن اس
ع کو محسوس کر کے جو گفتگو کی بے ربطی سے ظاہر تھا، تیسری نشست والا نوجوان قدرے جھینپ سا گیا ـــــ "میں کہتی ہوں" وہ بولی: "ارشد ایک باکمال ادیب ہے،
لی سے متعلق میں نے اس سے بہت کچھ سیکھا ہے" ۔
"زندگی" اس کے مخاطب نے کسلمندی کے ساتھ کہا "میں زندگی کے متعلق سوچنا پسند نہیں کرتا، زندگی گذارنے کے لئے اس قدر سوچنا ٹھیک نہیں ہے"۔
"یہ تب ہی ممکن ہے" لڑکی نے اپنے کالے بالوں کو گھماتے ہوئے کہا "جبکہ ہم سوچ بچار کے بندھنوں سے آزاد ہو کر پرندوں کی طرح بسیرا کرنا جان لیں، ایک بے پروا اور آزاد
لی ـــــ ارشد کے خیال میں بھی زندگی لذت کوشی کا دوسرا نام ہے، زندگی کی لذت کو اگر ظاہری قیود سے آزاد کر دیا جائے تو ہم جنگلی شہد کی مکھیوں کی طرح اس امرت کو
کر سکتے ہیں، جس کی پیاس ہر لمحہ انسان محسوس کرتا ہے، اور جسے سماج قطرہ قطرہ کر کے ہمارے حلق میں ٹپکاتا ہے، ارشد کے ناول اور افسانے سماج کی اس کنجوسی
لاف ایک بغاوت ہیں، وہ بے حس سماج کے ہاتھ سے اس جام کو چھین کر سب کچھ حلق میں ایک دم انڈھیل لینا چاہتا ہے"۔
"لیکن اس طرح" ـ بوڑھے مرد نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا، "حلق میں پھندا جو پڑ جائے گا" یہ کہہ کر وہ بے تکے پن سے ہنسنے لگا۔
"خود ارشد کے حلق میں بھی اسی طرح پھندا پڑ گیا تھا" ـ نووارد نے بظاہر بوڑھے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "یہ بات مجھے اب تک اچھی طرح یاد ہے"۔
"کیا آپ ارشد سے واقف ہیں"؟ یہ کہتے ہوئے اس لڑکی نے قدرے چہرہ کو خم کر کے ایک گہری نظر نووارد پر ڈالی، ساتھ ہی ساتھ وہ اس کے چہرہ کی موزونیت کو دیکھ کر
ئی مائل تھا سب ڈاڑھی کے نرم نرم بالوں سے اور زیادہ باوقار معلوم ہو رہا تھا، قدرے لجا گئی، "ہاں کیوں نہیں"! نووارد نے وہ چبھتی ہوئی جذباتی نظروں کو اپنی بے اعتنائی
قابل توجہ جتاتے ہوئے کہا، جب تک وہ زندہ رہا، اس کی ہر گھڑی میرے ساتھ ہی گذری" ـــــ "اوہ ـ ـ ـ ـ تو کیا وہ مر گیا؟" غیر منضبط طبیعتوں کی طرح وہ
لمشاف پر چونک پڑی، "سچ سچ! اس قدر اچھا لکھنے والا ملک کا خوبصورت ادیب"۔
"خوبصورت" ـ چوتھی نشست پر بڈھا بڑبڑایا ـ "موت بھی خوبصورت ہوتی ہے، زندگی سے کہیں زیادہ ـ ہا ہا ہا ہا"۔
مداخلت کے اس بے تکے پن پر موٹی عورت نے جو اب کرسی کی پشت پر سر رکھے اونگھ رہی تھی، خشمگیں نگاہوں سے بڈھے کو دیکھا اور پھر جماہیاں لیتے ہوئے آنکھیں
میں ـ
"خوبصورت آدمی بھی مرتے ہیں" ـ بڈھے نے جیب سے کچھ دانے نکال کر منہ میں ڈال لئے ـ "موت زندگی سے کہیں زیادہ وزنی حقیقت ہے" وہ کہنے لگا ـ اس
زمانے میں اگر ارشد کی ہم خیالی میں ہم بے سوچے سمجھے زندگی بسر کریں، تو نادان کی یہ بڑی توہین ٹھہرے گی ـــــ ہم سب کی توہین! ـ اس کھلی کائنات میں

ہم ہی تو ایک راز تھے، جسے اس جان کار رازداں نے آشکارا کر دیا ـــــ اس راز کی بے قدری کرنا ـ یہ سوچ کر یہ اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگتا ہے ـــــ تمہارے ان
نے یہ بات جانی ہی نہیں ! ہا ہا ہا ! ـ بے وقوف اس کو یہ حق ہے کہاں کہ وہ ہم کو سمجھ بوجھ والے انسان کی بجائے بے سمجھ جانور قرار دے "کیا تم پسند کرو گے ؟" اس نے تیسری
نشست کی طرف متوجہ ہو کر کہا، میں بدمست دیو بن جاؤں اور تم کو کیا یہ جان کر غصہ نہ آئے گا کہ تم انسان کی بجائے مٹکا گینڈا بن گئے ہو، اور یہ بے تکلفی سے باتیں کرنے
والی لڑکی ہر ایک کی گود میں بیٹھ کر آنکھیں بند کر لینے والی بلی بن جائے، اور یہ خالہ بی اونگھتے اونگھتے بطخ کی طرح قیں قیں کرنے لگ جائیں، اور یہ حضرت اپنی خوبصورت
ڈاڑھی سمیت سحر خیز مرغوں کے ساتھ اذان دینے لگ جائیں ـــــ اور پھر ہم سب اپنی ماداؤں اور نروں کے پیچھے بے حیائی کے ساتھ دوڑتے پھریں، اور لالچی کتوں
کی طرح ایک دوسرے سے ہڈی چھیننے کے لئے ساری دنیا میں دھوم مچا دیں ـــــ جی ! یہ تو اپنی حقیقت پر پردہ ڈالنا ہوا، اس بگڑتی چال کو دیکھ کر ہی تو وقت کے
جوان سال ادیب "پریمی" نے اپنی کہانیوں کی بنیاد ارشد کی بوالہوسی کے برعکس دھرتی کے رازداں اور بالنہار کے پریم پر رکھی ہے ـــــ وہ ارشد کی طرح انسان کا
مطالعہ جانور کی نظر سے نہیں کرتا، بلکہ وہ انسان کے مستقل بالذات وجود کا قائل ہے ـ وہ زندگی کو محض ایک لمحاتی "چٹخارہ" قرار نہیں دیتا، بلکہ اس کے نزدیک زندگی
ازلی محبت کا ایک "دائمی ذائقہ" ہے، ارشد لذتوں کے پیچھے نادیدہ بن کر دوڑتا ہے، اور پریمی قربان ہونے والی لذتوں کو سیر چشمی کے ساتھ نظر انداز کر دیتا ہے، ارشد
بھکاری ہے، اور وہ سماج سے بھیک مانگتے مانگتے لوٹ مار پر اتر آتا ہے، پریمی مستغنی ہے وہ دل کھول کر سماج کو اپنا سب کچھ تقسیم کر دینا چاہتا ہے ـــــ ارشد
عورت کو کرایہ پر خود غرضی کے ساتھ استعمال کرنا چاہتا ہے، پریمی عورت کو نادر تحفہ جان کر اپنے کاشانہ کی رونق قرار دیتا ہے، ارشد کے نزدیک عورت دل بہلائی کا
کھلونا ہے، لیکن پریمی اس کو جذبۂ حیات جان کر اس کی قدر کرتا ہے، ارشد کے ناول انسانوں کو بلندی سے پستی میں دھکیل دیتے ہیں، لیکن پریمی کے افسانے
پستیوں کے راہبر نہیں، بلکہ بلندیوں کے نقیب ہیں، ارشد کے تصورات کا ماخذ حیوانی جبلت ہے، اور پریمی کے خیالات کا مرجع انسانی معنویت ہے، وہ اپنے جیسے
حیوانوں کا ریزہ چین ہے، اور یہ مافوق الانسان علیم و خبیر ہستی کا مہمان ہے ـــــ میں نے زندگی کے وقار کو پریمی سے سمجھا ہے"۔ ـــــ

"کیا آپ پریمی کو جانتے ہیں"؟ نووارد نے بوڑھے کی مسلسل تقریر سے اکتا کر بات بدلنی چاہی ـ

"کیوں نہیں، کیوں نہیں، کون ہے جو اس وقت پر چھائے ہوئے قلم کار کو نہیں جانتا ؛ جو ارشد کے "چٹخارے" پڑھتا ہے، اُسے پریمی کا "امرت" ضرور پڑھنا
ہی پڑتا ہے ـــ لیکن بچے ! یہ تمہارا چہرہ اتنا دلگیر کیوں ہو رہا ہے ؟ لو ! یہ چباؤ !" یہ کہہ کر بوڑھے نے جیب سے ایک ڈبہ نکال کر نووارد کے سامنے رکھ دیا ۔

"تھوڑی فرصت میں یکجا ہونے والے مسافروں کے لئے "پریمی" اور "ارشد" کی بحث بڑی پر جھل بن جاتی ہے، گنگوتری کی سڑک پر اکثر مسافر خانوں میں مجھے یہی
تجربہ ہوا ہے" ـ تیسری نشست والے نوجوان نے بہت دیر تک خاموش رہنے کے بعد کہا ـ

"ویسے تو کوئی حرج نہیں لیکن میں سوچتی ہوں، کسی قصہ کو چھیڑ کر ادھورا چھوڑ دینا کم از کم عورتوں کو تو الجھن میں ڈال دیتا ہے، آپ کچھ ارشد کے حلق میں پھندا پڑنے والی بات
کہہ رہے تھے" ـ سانولی لڑکی نے ناول پر اپنی کہنی کا ٹیک لگاتے ہوئے نووارد سے کہا ـ

"پھندا پڑنا، یہ بات میں نے صرف محاورہ کے طور پر ہی نہیں کہی تھی، بلکہ یہ ایک واقعہ ہے"۔

"در حقیقت" نووارد نے آگے کا جملہ دہرانے سے پہلے اپنے شانوں کو خفیف سا جھٹکا دیا، جیسے وہ اپنے اضطراب کو چھپانا چاہتا ہے "ارشد نے خودکشی کر لی"

"خودکشی کر لی، اُف ! آپ نے کس قدر خطرناک لفظ کہا ہے، کیا ارشد نے خودکشی کر لی ؟ کب ! کیسے ؟"

نووارد نے ان سوالات کا فوراً کوئی جواب نہیں دیا، کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی بجز باہر برف گرنے کی سرسراہٹ اور اندر انگیٹھی میں چٹخنے والے کوئلوں کی آواز خاموش

فضا میں اس طرح سموگئی تھی کہ "خودکشی" کے لفظ سے پیدا شدہ تأثر اور زیادہ گہرا ہوگیا ـــ بڈھے کے چرٹ سے نکلنے والے کثیف دھوئیں میں وہ سب ایسے معلوم ہو رہے تھے، جیسے کچھ دیر کے لئے "سکوت" مجسم ہوکر پانچ نشستوں پر منقسم ہوگیا ہے "۔

"اس رات" نووارد نے بغیر کسی تمہید اور مطالبہ کے اچانک اس طرح کہنا شروع کیا، جیسے وہ سنانے کے لئے نہیں، بلکہ اپنے ذہن کو اس غیر متوقع یاد کے بوجھ سے ہلکا کرنا چاہتا ہو "بس اور وہ ـــ ہاں میں ارشد کے پاس موجود تھا، ایک عورت اپنے ہاتھ میں بستہ اٹھائے ہوئے بوچھے بنا اندر آگئی، وہ کیسی عورت تھی، یہ بتاتے ہوئے میرا دل گھٹتا ہے، میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس عورت کو دیکھ کر کراہیت سے میری طبیعت متلا گئی، اس کے سارے جسم پر سرخ چھالے پھیلے ہوئے تھے، یوں جان پڑتا تھا کہ اس کے جسم میں خون کی جگہ خبیث مادے بھرے ہوئے ہیں، ورم سے تمتایا ہوا اس کا چہرہ سڑے ہوئے ٹماٹر کی طرح پھول رہا تھا، غرض اس نے آتے ہی ارشد کی میز پر وہ بستہ پٹخ دیا اور بے باکی کے ساتھ چھوٹتے ہی بول اٹھی "کیا تم آج میرے ساتھ شب بسری کرسکتے ہو؟!" ـــ

ارشد اپنے بے لگام خیالات اور اطوار کے باوجود بے حیائی کی اس نفرت انگیز ننگی بات کو سن کر کوئی جواب دئے بغیر مبہوت بیٹھا رہا ـــ حیا اور شرم کتنی قیمتی ہوتی ہے! پہلی مرتبہ اس کے دل میں یہ بات جاگ اٹھی ـــ بمشکل یہ جملہ گھٹتے ہوئے لہجہ میں اس نے ادا کیا "تم کو مقررہ جگہ پر پہنچنے میں شاید غلطی ہوی ہے"۔

"غلطی!" وہ تمتا اٹھی! "کیا یہ سب کچھ میری ہی غلطی ہے"؟ یہ کہہ کر اس نے بستہ میں سے کئی ایک کتابیں نکال کر میز پر بکھیر دیں ـــ "چٹکیاں" "بھابی"، "ہم جب سوتے ہیں"، "اقدام"، "چٹخارے" "یہ سب ہاں یہ سارے افسانے اور ناول کیا تم نے یہ غلطیاں نہیں کیں؟ آہ! وہ منحوس دن کہ میں تمہاری ان گندگیوں کو بڑے چاؤ سے میز پر جایا کرتی تھی، اور تمہارے فوٹو کو مختلف قرینوں سے گھورتی رہتی تھی ـــ اف میری وہ راتیں کہ میں اپنے بردبار شوہر کو بے سہارا چھوڑ کر تمہاری ان تباہ کن سوغیوں کے لئے جاگ جاگ کر اپنی آنکھوں کو سرخ کرلیتی تھی، آہ! تم نے یہ سب کیوں لکھا؟ کیوں لکھا تم نے؟ بولو! مجھے جواب دو نا؟" ـــ

ـــ انتہائی طیش سے اس کی آواز بھراگئی، اور وفورِ جذبات سے سانس سینے میں سما نہ سکتا تھا، اور بے اختیار اس کی بے مایہ آنکھوں سے آنسو نکل پڑے ـــ "اُف"! یہاں پہنچ کر نووارد اچانک خاموش ہوگیا، اور خلا میں دھوئیں کے ایک ٹوٹتے ہوئے حلقہ کو دیکھنے لگا ـ موٹی عورت بھی کبھی کبھی جاگ کر اس انوکھی داستان کو بڑی دلچسپی سے سننے لگی تھی، بڈھا اسی طرح ساکت و صامت میز پر ہاتھ پھیلائے نووارد کے چہرہ پر ٹکٹکی جمائے ہوئے بیٹھا تھا، سانولی لڑکی اپنے کاسنی چہرہ میں اس طرح بھونچکی نظر آرہی تھی، کہ جیسے وہ اس دردانگیز تأثر کو بڑی مشکل سے برداشت کر رہی ہے، دوسرا نوجوان بھی اس دلچسپی کے اظہار کو روکنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا، جو لمحہ لمحہ نووارد کی گفتگو سے بڑھتی جارہی تھی ـ

بڈھے کے سگار سے نکلنے والے دھوئیں کا تیسرا حلقہ جب فضا میں ٹوٹ کر پھیل گیا، تو نووارد نے چھوڑی ہوی بات کو جوڑتے ہوئے کہا، کہ!ـ

"ارشد چپ چاپ بیٹھا اس انوکھے حادثہ سے دوچار تھا ـــ اجنبی عورت سسکیاں لیتے ہوئے بولتی چلی جارہی تھی "تم ان غلطیوں سے انکار کرسکو، ایسی کوئی گنجائش تو نہیں ہے ـــ آہ ظالم انسان! خوبصورت بھیڑیئے تو نے مجھے تباہ کردیا، ایک دوسرے کو جانے بنا تم نے اپنے ناولوں اور افسانوں کے ذریعہ مجھے موت کے کنارے لگا دیا ـــ بھلا بتاؤ وہ کون تھا جس نے مجھے اپنے بردبار شریف الطبع شوہر کے خلاف ورغلایا، وہ کون تھا جس نے نومولود بچہ کا اپنے ہاتھوں گلا گھونٹنے پر آمادہ کیا، وہ کون تھا جس نے عصمت اور ناموس جیسی بے بہا دولت کو کھلے بندوں بازاروں میں لٹانے پر آمادہ کیا ـــ پاپی! جادوگر! دیکھ میرے اس گندے جسم کو دیکھ! ان رستے ہوئے ناسوروں کو دیکھ! اس بہتی عفونت کو سونگھ! ان پھولے ہوئے گالوں پر نظر ڈال! شیطان کے ایجنٹ! اس تباہ و برباد ہستی کو دیکھ جسے میں نے ہر بوالہوس کے لئے خوانِ یغما بنادیا تھا ـــ مجھے چوم! میرے شاعر، مجھے اپنے سینے سے لگالے میرے افسانہ نگار! مجھے اپنی آغوش میں

بھینچ لے میرے حسین ظلم کار! ساری دنیا کو سیراب کرنے کے بعد، اپنا سب کچھ دوسروں کے لئے لٹا دینے کے بعد اب میں اپنی آخری تمنا کو اور اس آخری خواہش کو لے کر تیری بارگاہ میں آئی ہوں۔۔۔۔ مجھے پہچان! میں تیرے تخیلات کا مجسمہ ہوں، تیرے تصورات کا مرقع ہوں، تیرے خوابوں کی جیتی جاگتی تعبیر ہوں، تیرے ابہام کی کھلی تفسیر ہوں۔۔۔۔ اب جب کہ ساری دنیا مجھے ٹھکرا چکی ہے، میں تیرے پاس پناہ لینے آئی ہوں!۔۔۔۔ پناہ! نہیں نہیں یہ ایک کمزور لفظ ہے، مجھے تیری پناہ کی ضرورت نہیں ـــــ صرف ایک سودا، ایک برابری کا لین دین ـــ! یا تو تو مجھے وہ سب کچھ واپس دیدے جسے میں نے تیرے سمجھانے پر کھودیا! ـــــ میرا دمکتا ہوا حسن! میرا چڑھتا ہوا شباب! میری شرمائی ہوئی عصمت! میری روشن شرافت! میری سجائی ہوئی نسوانیت، میری آنکھوں کی چمک، میرے سینے میں پلنے والی مامتا، میرا معصوم بچہ! میرا ہر دلعزیز شوہر! اور سب سے بڑھ کر میری وہ معنویت، جس کی آمیزش میں خدا کی محبت اور خوف گھلا ہوا تھا ـــــ جواب کیوں نہیں دیتے کیا تم یہ سب کچھ واپس دے سکتے ہو؟ میں جانتی ہوں، تم ایسا نہیں کر سکتے، تو پھر آخری التجا یہی ہے، کہ تم بھی میرے اس روح فرسا امرت کو نوش کر دو جو تمہارے ہی نفس پرستانہ اور ناخدا پرستانہ نظریوں کا آمیزہ ہے، اور جسے پلا پلا کر میں نے کئی ایک دمکتی ہوئی نوجوانیوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مدہوش کر دیا ـــــ کیا اب بھی تم اس جرم سے انکار کرتے ہو، کیا ان غلطیوں کو تسلیم نہ کرنے کی تم میں ہمت ہے؟ آہ! آہ! تم کچھ نہیں کر سکتے، کچھ بھی تو نہیں"۔

اس قدر کہہ کر وہ بے بس عورت تھک گئی، اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے بھینچ لیا، اس کی پتلیاں سمٹ گئیں اور دیدے پھیل گئے اور ایک دلدوز آہ کے ساتھ وہ غش کھا کر گر پڑی ـــــ ارشد گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا، اور بدقت اس کو بستر پر لٹا کر ہوش میں لانے کی تدبیریں کرتا رہا ـــــ جب وہ خاموش بیٹھا اس مظلوم اور تباہ حال عورت کے بھیانک چہرہ کو دیکھ رہا تھا، تو ایک عجیب طرح کی کیفیت اس پر طاری ہوگئی، اس طرح جیسے سارے حواس اس کی قوتِ ارادی کی گرفت سے آزاد ہو چکے ہیں، اور وہ ان کے استعمال کی قوت سے عاری ہوگیا ہو، بڑی دیر تک وہ ایک کھوئے ہوئے انداز میں بیٹھا رہا، کچھ ہی دیر بعد اس کے ذہن میں دفعتاً ایک قیامت سی بپا ہوگئی، یوں محسوس ہونے لگا، جیسے کوئی عالیشان عمارت زلزلے کے جھٹکوں سے یکبارگی گرنے لگی ہو، ـــــ بڑی مشکل سے وہ اپنے آپ پر قابو پاسکا، اس درمیان میں وہ عورت تھوڑے تھوڑے وقفہ سے اچھل پڑتی، اور اس کی لکھی ہوئی کتابوں کے فقرے بڑبڑاتی رہتی، اس کا ہر فقرہ ارشد کے دل پر تیر بن کر لگ رہا تھا، اور اس کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ ان کو صبر سے اپنے دل پر سہارتا رہے۔۔ ـــ قدرے سکون سے اس پورے واقعہ پر غور کرنے کے بعد عورت کے لگائے ہوئے الزامات کی سچائی اس کے ذہن میں جاگزیں ہوتی گئی، "میں مجرم ہوں" اس کو احساس ہوا، خدا کی محبت اور خوف کو نظر انداز کر کے اس نے مفاد پرستی، بوالہوسی اور نفس پرستی کو پھیلانے میں جو کاوش کی تھی، وہ ایک گہری چوٹ کی طرح اس کے ذہن پر ابھر آئی، جس طرح اس نے انسان کو پیٹ کا اور نفس کا غلام بنایا تھا، اور عورتوں کو بے باکی اور بے حیائی سکھائی تھی، اس کے نتائج اس بے دردی سے منکشف ہوگئے تھے، کہ وہ اپنا پہلو بچانے کے لئے کوئی حیلہ تلاش کرنے سے قاصر تھا، اس کو گذرے ہوئے دور کی ہر جنبشِ قلم، دماغ پر ضرب لگاتی ہوئی اور اس کی لکھی ہوئی تحریروں کی ہر سطر گلے میں پھندا بن کر کھنچتی ہوئی اور اس کی کتابوں کی ہر خوشنما جلد اس کے لئے شکنجہ کستی ہوئی محسوس ہونے لگی، اس کا سر ندامت اور پشیمانی سے جھک گیا، اور اس نے چپکے چپکے سے مدتوں میں پہلی بار خدا کے سامنے اپنی خطاؤں کا اعتراف کیا، اور گڑگڑا کر موت کی دعا مانگی، قبل اس کے کہ وہ عورت ہوش میں آئے۔

لیکن آہ ـــــ صبح صبح وہ ستم رسیدہ، ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی، اس نے ایک بھٹکتی ہوئی نگاہ ماحول پر ڈالی، اور پھر وہ بے اختیار قہقہے مارنے لگی، اور ارشد کو پرے دھکیل کر چیختی، چلاتی باہر نکل گئی، وہ چلا رہی تھی، "مجھے مل گیا، قاہ قاہ قاہ مجھے مل گیا، وہ سب کچھ جو کھو گیا تھا"۔

اس کے جانے کے بعد" ـــــ کہتے کہتے نووارد وفورِ جذبات سے رک گیا، اور اس نے میز کے کنارے کو اپنی مٹھیوں سے بھینچ لیا ـــــ فضا میں عجیب طرح کی گہرائی

پیدا ہو گئی، اور سننے والے جیسے اس گہرائی میں ڈوب سے گئے، رات کی اس آخری حصہ میں تیز سانسوں کے سوا ان پانچ نشستوں پر زندگی جیسے سُن ہو کر رہ گئی تھی

قدرے بعد نوجوان لڑکی نے اچانک جاگ اٹھنے والے احساس کے ساتھ کلائی کے نیچے رکھی ہوئی کتاب کو غیر شعوری حالت میں پرے دھکیل دیا، جیسے وہ کسی زہریلے نفرت انگیز کیڑے سے ڈر گئی ہو ــــ کتاب کھل کر بڈھے کے سامنے پھیل گئی۔ اچانک سب کی نظریں لمحہ بھر کے لئے اس فوٹو پر جم گئیں جس میں ارشد میز پر لکھنے میں مصروف دکھائی دے رہا تھا ــــ "ہاں اس کے جانے کے بعد" نووارد نے کچھ اس طرح بات چھیڑی، جیسے وہ سب کی توجہ ارشد کی تصویر سے ہٹانا چاہتا ہے

ــــ لیکن کلاپک کی گرم ٹوپی پہنا ہوا بڈھا اسی طرح اپنی متجسس نگاہوں سے تصویر کو گھورتا رہا ــــ

"ارشد نے ایک نیم مجنونانہ حالت میں اپنے سارے مسودوں اور کتابوں کو فرش پہ ڈھیر کر دیا اور بے خیالی کے ساتھ اس ڈھیر پر بیٹھ کر آگ لگا دی ــــ دوسرے دن اس کے کمرہ میں سوائے راکھ کے ڈھیر کے اور کچھ نہیں تھا"۔

نووارد کے چپ ہونے پر موٹی عورت بے چینی سے پہلو بدلنے لگی، تیسری نشست والے نوجوان نے اپنے ہاتھوں سے چہرہ کو ڈھانپ لیا، جیسے وہ اپنے آپ سے شرم کر رہا ہو۔ سانولے رنگ والی لڑکی نے ایک درد انگیز آہ کھینچی، اور نیچی نظر کئے منفعلانہ انداز میں اپنی لانبی لانبی انگلیوں سے میز کے روغن کو کھرچنے لگی۔ لیکن ان سب کے برعکس ــــ

وہ عجیب و غریب بوڑھا آدمی اپنی کرنجی آنکھوں سے کبھی "شرارے" کے مصنف کی تصویر کو اور کبھی نووارد کے چہرے کو گھورتا رہا ــــ انگیٹھی میں کوئلے بجھ بجھ کر راکھ ہو گئے، اور باہر ہواؤں کے چلنے کی تیز سرسراہٹ سنائی دینے لگی۔

نووارد نے بھی چند سے توقف کر کے سر ہلاتے ہوئے لہجہ میں کہا "ارشد مر گیا! مگر وہ! اس کی لکھی ہوئی نعشیں انسانوں کی تباہی کے لئے ابھی تک زندہ ہیں، کاش یہ ممکن ہوتا کہ دنیا کے ہر گوشہ سے ان کو جمع کر کے ارشد کی یاد میں اسی طرح جلا دیا جاتا"۔

"ناممکن"! دفعتاً بڈھا بڑبڑایا" اس سے کیا ہوتا ہے، جب کہ ارشد خود زندہ موجود ہے"ــــ

"زندہ ہے"!؟ نووارد کے ساتھ تینوں بیک وقت بول اٹھے ــــ "ہاں" بوڑھے نے پُر اعتماد لہجہ میں کہا "وہ زندہ ہے، اس نے خودکشی نہیں کی ــــ وہ موجود ہے دنیا میں ـــ اب بھی ـــ اس وقت بھی ـــ بلکہ قاہ قاہ قاہ! اس کمرہ میں بھی" ــــ !

"اس نے خودکشی نہیں کی؟ ــــ "وہ موجود ہے!؟" ــــ "اس کمرہ میں؟" ــــ تین مختلف آوازیں باہم الجھ گئیں ــــ

"جھوٹ"! نووارد نے کہا "وہ مر چکا ہے قطعی اس بارے میں مجھے کوئی شک ہے! ایسا تو میں نے کبھی محسوس نہیں کیا"

"لیکن میں" بڈھے نے میز پر زور سے مکا مارتے ہوئے کہا "اسے دکھا سکتا ہوں اسی وقت"

"دکھا سکتے ہو" تینوں حیرت سے بول اٹھے۔

"کیوں نہیں" بڈھے نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کتاب کھول کر ان کے سامنے کر دی۔ "یہ ارشد ہے"!۔

تیسری نشست والا شخص بول اٹھا مسخیانہ ہوئے چاچا جان! یہ تو اس کی تصویر ہے"۔

سانولی خاتون مسکرا اٹھی! اور موٹی عورت نے حقارت سے منہ پھیر لیا ــــ

"ٹھیک ہے نادان بچو!" بڈھے کے پُر اعتماد لہجہ میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ "یہ اس کی تصویر ہے، اور یہ! ــــ" بڈھے نے بالکل ڈرامٹیک انداز میں ایک ہاتھ سے کتاب کو

کھولے ہوئے دوسرا ہاتھ نووارد کے نچلے نصف چہرہ پر اس طرح رکھ دیا، کہ اس کی ڈاڑھی کے کھورے بال پوری طرح چھپ گئے ——— "قاہ قاہ! کیا یہ ارشد کا چہرہ نہیں" وہ فاتحانہ انداز میں غرّایا ———

"بھوت"! سانولی لڑکی سہم کر چیخ اٹھی ——— موٹی عورت ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی نشست پر پھیل گئی، اور وہ نوجوان شخص غیر شعوری طور پر یک لخت اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔

نووارد نے لمحہ بھر کے تذبذب کے بعد نرمی سے بوڑھے ہاتھ کو اپنے چہرہ سے ہٹایا، اور اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہنے لگا ——— "میں ہی ارشد تھا، لیکن اب نہیں!۔ دوستو! یقین کرو ارشد مر چکا ہے، اگرچہ میں زندہ ہوں"۔!

"تم ارشد ہو، ارشد مر چکا ہے، تم زندہ ہو، تم ارشد نہیں، وہ مر چکا ہے، یا عجیب معمہ ہے" دوسرے شخص نے دانت پیستے ہوئے الجھ کر کہا۔

"اُف کس قدر خطرناک مذاق ہے، یہ سوچ کر تو میں کپکپا رہی ہوں"! کہتے ہوئے سانولی لڑکی کے دانت کٹکٹا اٹھے۔

نووارد نے ان باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا، اور اطمینان کے ساتھ اپنا سیاہ گرم کوٹ پہننے لگا۔

باہر سے پرندوں کے چہچہانے اور مرغوں کے بانگ دینے کی آواز صبح کا پیام لے کر آئی، اور مسافر خانہ کی خادمہ نے دروازوں کے پردے اٹھا دیئے! آسمان صاف تھا اور طوفان کا زور کبھی کا ٹوٹ چکا تھا۔ کھلے دریچوں میں سے افق پر صبح کا ستارہ دکھائی دے رہا تھا، اور نسیم سحری کے ہلکے ہلکے جھونکے درختوں کا چھیڑ چھیڑ کر مذاق اڑا رہے تھے، دُور پہاڑیوں کے پیچھے سے صبح کا سہانا چہرہ آہستہ آہستہ ابھرنے لگا۔

نووارد نے پورے وقار کے ساتھ اپنا بیگ اٹھا لیا، اور رخصت ہوتے ہوئے کہنے لگا "جسم کے زندہ رہنے اور مر جانے کی کوئی اہمیت نہیں۔ زندگی اور موت کو پرکھنے کے لئے انسان کی معنویت کو ٹٹولنا چاہئے ——— ارشد کی معنویت مر چکی ہے، اگرچہ اس کا جسم زندہ ہے ایک نئی معنویت کو لئے ہوئے، ارشد کی نئی معنویت صبح کے ستارہ کو پیدا کرنے والے آقا کے ابدی پریم کا ایک انوکھا مرقع ہے"۔

"صبح بخیر! بوڑھے چاچا" اس نے دروازے کے پاس قدرے رک کر کہا "اپنے محبوب قلم کار کو بھول نہ جانا" ——— یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے چرمی بیگ کو دکھاتے ہوئے ان سب کے آگے کر دیا ———

آہ! متحیر آنکھوں میں پانچ سنہرے حروف ابھر آئے ——— "پریمی" ———————

(حلقۂ ادب اسلامی کے اجتماع سالانہ میں پڑھا گیا)

قواعدِ ایجنسی

۱۔ تمام معاملات دیانتداری اور خدا کے سامنے جواب دہی کے تصور سے کئے جائیں۔ ۲۔ زرِ امانت یا پیشگی کی ضرورت نہیں، ہم ہر انسان کی انسانیت پر اعتماد کرتے ہیں۔ ۳۔ کم از کم پانچ پرچے منگوانے ہوں گے۔ ۴۔ کمیشن ہر صورت میں ۲۵ فیصدی دیا جائے گا۔ ۵۔ پرچے ہمیشہ بذریعہ بُک پوسٹ روانہ ہوں گے اور اس کا خرچ دفتر کے ذمہ ہو گا۔ ۶۔ وی پی یا رجسٹری منگوانے کی صورت میں خرچ ڈاک ایجنسی کے ذمہ ہو گا۔ ۷۔ ڈاک کی خرابی کا دفتر ذمہ دار نہیں۔ ۸۔ جو پرچے آرڈر کے مطابق روانہ کئے جائیں گے وہ دفتر کو واپس نہ ہو سکیں گے الا یہ کہ کوئی خاص ضرورت ہو۔ ۹۔ آرڈر کے بغیر روانہ کئے ہوئے پرچے اگر فروخت نہ ہوں تو دفتر کو واپس کئے جا سکتے ہیں، اور واپسی ڈاک خرچ بھی دفتر ہی برداشت کرے گا۔ ۱۰۔ ایسے ایجنٹ حضرات جن کو بطورِ تجربہ پرچے روانہ کئے گئے ہوں، اُن سے دفتر توقع رکھے گا، کہ وہ ان کی اشاعت میں حصہ لیں گے نیز ایسے احباب ایک ماہ کے اندر اپنے ارادہ سے دفتر کو مطلع کر دیں۔ ورنہ انہیں مستقل ایجنٹ قرار دے دیا جائے گا۔ ۱۱۔ جن ایجنٹ حضرات کے ذمہ دو ماہ کی رقم واجب الادا ہو گی، اُن کی خدمت میں تیسرے ماہ کی اشاعت بذریعہ وی پی روانہ کر دی جائے گی۔ جس کا چھڑانا ان کا اخلاقی فرض ہو گا، اور نہ وی پی کی عدم وصولی کی صورت میں ایجنسی بند کر دی جائے گی۔

منیجر انوار

لوگ کہتے ہیں

اصغر عابدی

ان چمکتی ہوئی تلواروں میں
گولیوں میں سنسناتی ہوئی
کوڑیوں میں کھنکھناتی ہوئی
اور کچھ ہڈیوں، پسلیوں کے گوشت میں
اور کچھ خون میں، لڑکیوں، بالیوں کے کچے خون میں
لوگ کہتے ہیں، کہ
سینکڑوں حق ہیں چھپے
ارتقاء تاریخ کے پوشیدہ ہیں!
چاہیں کہ فولاد کے خود
نئے موڑ پر
زندگی کے ہر نئے چوراہے پر
سنتری
قوم کی تاریخ بنانے والے
تیری کے نام پہ مٹنے والے
قوم کے نام پہ سودا کرتے!
سنگ پیٹ کا حل ہو جاتا ہے۔
حل وہ ہوتا ہے تب ہی تو
زندگانی میں حل ہوتا ہے
اور ہم جلوے نظاری کے
پھل کھاتے ہیں کسی
سیٹھ کے پیٹ کا!
لوگ کہتے ہیں، کہ پھر اس پیٹ سے
خون اگلتے ہوئے، بہتی ہوئی روش والے،
ارتقاء زیست کے انگاروں پہ
لوٹ کر، اور اچھل جاتا ہے!

ایک غمناک فضاء
اور "ترنم زا" ہوا
ہر سمت کو چھا جاتی ہے۔
اور پھر "سکھ" ہی "سکھ" تو زمانہ بھر کر
گود میں لیکے سُلا دیتا ہے!!
پیٹ کا مسئلہ تو ایک بات ہے معمولی سی۔
دل کا مسئلہ بھی کیا۔
ہوتا ہے اسی طرح سے حل
اور پھر ذہن رسا بھی کسی دل سے قریب
تو کیا بات نرالی نہ ہوئی۔؟
پیٹ میں فکر کہاں
پیٹ تو قبر ہے ایک غلطی۔
اور کچھ مردہ فضاؤں کے دلوں ڈھانچے ہیں۔
ہاں تو
پیٹ میں فکر کہاں
فکر تو پیٹ سے ہے کوسوں دُور!
لیکن لوگ کہتے ہیں کہ
ان چمکتی ہوئی تلواروں میں
گولیوں میں سنسناتی ہوئی
کوڑیوں میں کھنکھناتی ہوئی
اور کچھ ہڈیوں، پسلیوں کے گوشت میں
اور کچھ خون میں ——
سینکڑوں حق ہیں چھپے!
ارتقاء تاریخ کے پوشیدہ ہیں!!
لوگ جھوٹ کہتے ہیں!!

(حلقہ ادب اسلامی کے سالانہ اجتماع میں پڑھی گئی)

نوازش نامے!

"انوار" کا مطالعہ کرنے والے، اور ادب میں اسلامی رجحانات کو پسند کرنے والے ایک دوست لکھتے ہیں :-

" (۱) اسلامی ادب چونکہ ابھی اپنی ابتدائی منزلیں طے کر رہا ہے، اس لئے ضروری ہے، کہ اس کے اصول و مبادیات کے سلسلہ میں ذرا تشریح سے کام لیا جائے، تحریک اسلامی کے کسی ادیب کے قلم سے فنی حیثیت سے اگر کوئی غلطی ہو تو اس کی نشاندہی کی جا سکے۔ مئی، جون کے "انوار" سے "افسانہ تحریک اسلامی کے ادب میں" کے عنوان سے آپ نے جو سلسلۂ مضامین شروع کیا ہے، وہ بہت مفید ہے، ضرورت ہے، کہ تحریک اسلامی کے شاعروں اور ان کے کلام پر بھی تبصرہ کیا جائے۔ لیکن اس سلسلہ میں ایک بات یاد رکھئے، کہ کسی ادیب یا شاعر کی غلطی کو انگیز نہ کر جایئے، بلکہ اس کو اجاگر کیجئے، تاکہ مسئلہ صاف ہو جائے۔

(۲) "حلقۂ ادب اسلامی" کی ترکیب پر مجھے کچھ اعتراض ہے، میں چاہتا ہوں کہ اپنے شکوک و شبہات آپ کے سامنے پیش کر دوں، ہو سکتا ہے، کہ آپ کی تصریحات سے مجھے اطمینان ہو جائے۔

میرے خیال میں ادب کو کسی مذہب، قوم اور وطن کا پابند نہیں ہونا چاہئے، ادب کو اس طرح سے مقید کرنا شاید مناسب نہیں، غیر مسلموں میں اس ترکیب سے خواہ مخواہ ایک غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے، اگر "ادب اسلامی" کے بجائے "تعمیر پسند ادب" وغیرہ کی ترکیب استعمال کی جائے، تو یہ زیادہ مناسب ہے، دراصل ہم کام چاہتے ہیں، نام سے ہمیں کوئی مطلب نہیں، اس طرح سے دوسروں میں "حلقۂ ادب اسلامی" سے جو بیگانگی اور دوری پائی جاتی ہے، وہ بہت کچھ کم ہو جائے گی۔

ترقی پسند ادیبوں کا اگرچہ ہر مضمون، افسانہ اور ڈرامہ کمیونزم کا داعی اور نقیب ہوتا ہے، مگر سب جانتے ہیں، کہ یہ حضرات انہیں افسانوں اور ڈراموں کا نام "ترقی پسند ادب" رکھتے ہیں، حالانکہ یہ لوگ آسانی سے اس کا نام "اشتراکی ادب" رکھ سکتے تھے، مگر اس سلسلہ میں اس سے عام لوگوں میں جو نفرت پیدا ہو سکتی ہے، ان لوگوں نے اس کا پہلے ہی سے سدباب کر دیا ہے۔

(۳) ایک اور خاص بات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانی ضروری ہے، ادھر کچھ دنوں سے تحریک اسلامی کے متعدد ادیبوں کی طرف سے انبیاء کے حالات و واقعات افسانوی رنگ میں پیش کئے جا رہے ہیں، اس میں شک نہیں، کہ اگر واقعات کو افسانوں کے قالب میں ڈھال دیا جائے، تو لوگ انہیں بڑی دلچسپی سے پڑھتے ہیں، لیکن یہ طرز تحریر اپنے اندر بہت سے مفاسد رکھتا ہے، ظاہر ہے، کہ واقعات کو جب افسانوی رنگ دیا جائے گا، تو انہیں ربط و نظم کی لڑی میں پرونے کے لئے کچھ خس و خاشاک کی بھی ضرورت ہوگی، مضمون میں شیرینی پیدا کرنے کے لئے، اصل واقعات کے علاوہ کچھ اپنی طرف سے

بھی ملا ہوگا، میرے نزدیک جس طرح تاریخ کو افسانوی رنگ دینا غلط ہے، اسی طرح انبیاء کے حالات و واقعات کو افسانوں کے قالب میں ڈھالنا بھی مناسب نہیں ہے ——— اُمید ہے، کہ آپ مذکورۂ بالا گذارشات پر توجہ فرمائیں گے، اور میرے شکوک و شبہات کو رفع فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں گے"۔ ———

آپ نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے، بہت ممکن ہے، اکثر احباب کے دل میں بھی یہی باتیں کھٹکتی ہوں، اس لئے میں کسی قدر تفصیل سے آپ کے خیالات پر تبصرہ کروں گا، توقع ہے کہ اس سے آپ کو جدید ادبی نقطۂ نظر سمجھنے میں مدد ملے گی۔

(۱) آپ کہتے ہیں، کہ اسلامی ادب کا قافلہ ابھی اپنی ابتدائی منزلوں سے گذر رہا ہے، یہ بات ٹھیک ہے، لیکن جیسا کہ آپ نے خود ہی کہا ہے، کہ ہم ابھی "ابتداءِ عشق" کے مصداق بنے ہوئے ہیں، تو پھر یہ نتیجہ تو آپ خود ہی نکال سکتے تھے، کہ اس مرحلہ میں مبادیات کی تشریح اور توضیح کا موقع کہاں؟ اور پہلے سے ان کے تعین کا کیا مطلب؟ اتنا تو ضرور ہو سکتا ہے کہ ادب کے بارے میں قرآن اور رسول کریمؐ نے جو انقلابی نقطۂ نظر پیش کیا ہے اس کی توضیح کر دی جائے، لیکن یہ بات تو خود وقت، فتحِ تاریخ، اور اسلامی اصولوں پر تعمیرِ تمدن کے ہاتھوں طے پائے گی، کہ ہمیں کس ڈھب، کس وضع قطع اور کس لباس و شباہت کا ادب درکار ہے، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس وقت اسلامی تحریک سے متاثر ادیب کھلے بندوں لکھ رہے ہیں، ہم اُن کے قلم پر پہرے بٹھانا نہیں چاہتے، ان کی روشنائی اور کاغذ کا کیمیاوی تجزیہ کرنا نہیں چاہتے، ہمارا یہ ادب روسی غلاموں کا ادب نہیں ہے اور نہ ہمارا ادب جاہلی مذہب کی فرسودہ اقدارِ حیات کے علمبرداروں یعنی پاپاؤں، ملاؤں اور برہمنوں کا ادب ہے، اسلام زندگی کی چند پائیدار اور اَمِٹ حقیقتوں کو ذہن نشین کر کے، اور "نہ ماس خاص مقامات پر" [illegible] "کے بورڈ آویزاں کر کے باقی زندگی میں سماج کو آپ اپنی مرضی سے تعمیر و ترقی اور اجتہاد و ارتقاء کا موقع [illegible] اس بارے میں ان شرعی پابندیوں کے سوا جو آیاتِ محکمات اور سنتِ نبوی سے قطعی طور پر ثابت ہیں اور کچھ نہیں کہا جا سکتا، البتہ جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے، اس ابتدائی دور کے بعد جب اسلامی ادب ایک سچے انقلابی ادب کی شکل میں جلوہ گر ہوگا، تو اس کے اصول و مبادی خود بخود تفصیلی طور پر متعین ہو جائیں گے، لیکن اس میں بھی زیادہ تر تاریخی، اور نفسیاتی تحلیل اور ارتقائی نقاط کو دخل ہوگا، نہ کہ کسی خاص پابندی کو، کیونکہ ادب چاہے کتنا ہی ترقی کر جائے، بہرحال کوئی مخصوص ضابطہ بنا کر اس کے منہ میں لگام نہیں ڈالی جا سکتی، اگر ہم خدا نخواستہ کسی وقت ایسی غلطی کر بیٹھے، تو سمجھ لیجئے کہ اس وقت سے ہمارا ادبی زوال شروع ہو جائے گا تاہم جو "لگامیں" خدا اور رسول نے لگا دی ہیں، وہ ابھی ہیں، اور آئندہ بھی رہیں گی۔

البتہ آپ کی یہ بات ماننے میں مجھے کوئی انکار نہیں ہے، کہ ہمارے ادیبوں کی فنی اور ادبی غلطیوں کو اُن پر واضح کیا جائے، یہ دراصل بہت اہم کام ہے، اور یہ تلخ ہے، اس سے کام و دہن کو لذت ملنے کے بجائے کچھ زبانیں کڑوی ہوتی ہیں، کچھ منہ بنتے ہیں اور کچھ دانت کٹکٹاتے ہیں، لیکن ہمیں یہ کام بہرحال کرنا ہی ہے، اس کے ایک دو آدمیوں کا لکھنا کافی نہیں ہے، بلکہ سب لکھنے والوں کو تنقید و تقریظ کا یہ فرض مل جل کر انجام دینا ہوگا۔ جب ایک ادیب کو مختلف زاویوں اور گوشوں سے دیکھا جائیگا ہی اس کی حقیقی خوبیاں اور سچی خامیاں اس کے سامنے آئیں گی، اور وہ اپنے آپ کو آگے بڑھانے کی کوشش کر سکے گا۔ "انوار" میں جو مضمون "افسانہ تحریکِ اسلامی کے ادیبوں" عنوان سے شائع ہوا ہے، اس میں تنقید اور تجزیہ سے زیادہ میرے پیشِ نظر تعارف اور تبصرہ ہے، پھر بھی کہیں کہیں چند باتیں کہی گئی ہیں۔ ان شاء اللہ کسی وقت اس کا بھی موقعہ بھی آ جائے گا۔

(۲) دوسری بات آپ نے "حلقۂ ادبِ اسلامی" کے بارے میں کہی ہے آپ ایک اعتبار سے ٹھیک معلوم ہوتی ہے، لیکن جتنی وسیع النظری سے آپ نے کام لیا ہے، اگر اُس سے

ایک قدم اور آگے بڑھایا جائے، تو مجھے یقین ہے، کہ آپ بھی اسی نتیجہ پر پہنچیں گے جس پر ہم پہنچے ہیں، "اسلامی تحریک"، یا اس تحریک کے کسی پہلو کی طرف دعوت دینے کا صحیح طریقہ مسائل یہی ہے، کہ ہم لوگوں کو براہ راست اس کی جانب بلائیں، اس میں کوئی چیز لگی لپٹی، ڈھکی چھپی اور نقاب پوشں نہ ہونی چاہیئے، بلکہ ہر بات واضح اور کھلم کھلا طور پر سب کے سامنے پیش کی جائے۔ ہمیں خیال ہے اس سے کچھ فائدے ہیں، جو بظاہر نظر نہیں آتے اس طریقہ سے اول تو ہمارے کام کے بارے میں کسی لوگوں کے شبہات نہیں پیدا ہو سکتے، اور کوئی شخص اس کو اپنے خود ساختہ معنی نہیں پہنا سکتا، اسی "ترقی پسندی" کے لفظ پر غور کر لیجئے کیا اس مبہم اور بے معنی اصطلاح کو استعمال کرنے کا نتیجہ برآمد نہیں ہوا ہے، کہ اس لفظ کو اس کے علم برداروں سے لے کر اس کے معترضوں تک نے لاتعداد معنی پہنائے، اور آج تک بھی اس دوشیزہ کو رات دن نئے نئے جوڑے پہنائے اور اتارے جاتے ہیں، ہم نہ تو ادب میں اس بہروپیے پن کے قائل ہیں، اور نہ زندگی کے کسی دوسرے شعبہ میں۔ کیونکہ ہم سمجھتے ہیں، کہ یہ چیز ہمارے لئے سخت نقصان دہ ہے۔ کام اسلام کا اور نام "غیر اسلامی" یا کام اشتراکیت کا اور نام "غیر اشتراکی"۔ زندگی میں یہ تضاد اور دو غلا پن کسی دیانت دار آدمی کے نزدیک صحیح نہیں ہو سکتا، ہم جو کچھ کرنا چاہتے ہیں، وہی کچھ کہیں گے، اور جو نہیں کرتے وہ نہیں کہیں گے، اگر ہم اس اصول کی بنیاد پر کہ "اسلام" کے نام سے لوگ بدک جائیں گے، غلط فہمیاں پھیل جائیں گی، اور وہ ہم سے قریب ہونے کے بجائے دور ہو جائیں گے، کسی قدر غلو کے ساتھ غور کرنے لگیں تو پھر یہ نتیجہ بھی ہمارے سامنے آئے گا کہ سرے سے اس "اسلام" کے لفظ ہی کو نکال دیا جائے، اور "اسلامی تحریک" کے بجائے اس کے لئے کوئی اور اصطلاح مثلاً "اصلاحی تحریک" اور "انسانی تحریک" وغیرہ استعمال کی جائے، لیکن آپ خود سوچئے کہ کیا اس طرز پر کام کرنے سے ہم اپنے ان مقاصد سے عوام کو روشناس کرا سکتے ہیں، جو در اصل ان کے لئے آب حیات کی حیثیت رکھتے ہیں "اصطلاحات" — Terms — کا کسی تحریک میں ایک خاص مقام ہوتا ہے، اور اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی درخت کہ اس کے خاص قسم کے پھول پھل اور پتے ہوتے ہیں اور وہ انہیں سے پہچانا جاتا ہے۔

لوگوں کی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کو دور کرنے کا صحیح طریقہ یہ نہیں ہے، کہ ہم اُن کی پسند کی خاطر اپنے اندر کوئی تبدیلی کریں، بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے، کہ جس چیز کے بارے میں ان کو شبہ ہو اس کو لے کر صحیح کام کر کے دکھا یا جائے، اور اس کی صحیح تعبیرات لوگوں کے سامنے لائی جائیں ہم سمجھتے ہیں، کہ ابھی اس ملک کے انسانوں کے ضمیر اس قابل ہیں، کہ اگر ہم "اسلام" ہی کے نام سے کوئی حقیقی فائدہ بخش کام کر دکھائیں تو وہ بہت جلد اس کو قبول کر لیں گے۔

تاہم آپ نے جو رائے ظاہر کی ہے، اس کے مطابق نام کی تبدیلی کا موقع اگر کسی وقت آ سکتا ہے، تو وہ صرف اس وقت جبکہ اسلامی تحریک اور اس سے تعلق رکھنے والے ادیبوں اور ان کے کاموں سے لوگ بالعموم واقف ہو جائیں، ایسی حالت میں کسی دوسرے نام سے کام کیا جائے، تو وہ شکوک و شبہات کی نذر نہیں ہو سکتا، اور خود اس کے پیروؤں کو ذہنی الجھنوں میں مبتلا نہیں کر سکتا۔ لیکن اس ابتدائی مرحلہ میں جب کہ نہ صرف ہمارا کام عوام کے سامنے نہیں آیا ہے، بلکہ بہت سے بکھرے ہوئے قلم کاروں کو جمع بھی کرنا ہے، اگر ہم نے اس نام کو چھوڑ دیا، تو پھر اس مطلب دنیا میں سے صالح عناصر کو جمع کرنے کا کیا طریقہ ہوگا، اور ہم کیوں کر اسلام پسند لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکیں گے، میرا خیال یہ ہے، کہ ہماری ادبی تحریک بھی "ترقی پسند" تحریک کی طرح مختلف تعبیرات کی بھول بھلیوں میں کھو جائیگی، یا کوئی ادب نما سیاسی اور شاعرانہ انداز میں ذہنی سر نگوں کا جال بچھانے والی، دہشت پسند پارٹی سمجھی جائیگی، اور پھر اس بہروپیے پن اور دوغلے پن کی بنا پر "بر عکس نہند نام زنگی کافور" کی مصداق بن کر رہ جائیگی۔

(۳) انبیاء علیہم السلام کے واقعات کو تمثیلی اور افسانوی انداز میں پیش کرنے کے بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے مجھے اتفاق ہے، بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا، کہ اس طرز پر لکھی ہوئی چیز میں عام لوگ چاہے عقیدت کی بنا پر دلچسپی سے پڑھ لیں، لیکن ایک اونچے درجہ کا قاری اس میں اتنی دلچسپی محسوس نہیں کرتا، بلکہ اس طرح

مسائلِ حاضرہ

اشارہ ———————— از ادارہ

(یہ تبصرے گذشتہ اشاعت میں چھپنے سے رہ گئے تھے لیکن یہ اس اشاعت کے لئے بھی اتنے ہی تازہ ہیں)

بنگال میں انقلاب : ابھی کچھ عرصہ قبل کلکتہ کے ایک ضمنی انتخاب میں سرت چندر بوس اشتراکی لیڈر کو جو زبردست کامیابی ہوئی ہے، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ہندوستان کے مختلف زعماء نے اس خیال کا اظہار کیا ہے، کہ ایک غیر کانگریسی لیڈر نے جس بھاری اکثریت کے ساتھ کامیابی حاصل کی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ کانگریس دن بدن غیر مقبول اور غیر دلعزیز بنتی جا رہی ہے، عوام کے ذہنوں سے کانگریس کا وہ جادو "جو آزادی" کے نشہ آور نعرے کے وقت چڑھ گیا تھا) اب اتر رہا ہے، اور صاف معلوم ہو رہا ہے، کہ اگر کچھ دنوں یہی لیل و نہار رہے تو ملک کے آئندہ عام انتخابات میں کانگریس کو شکست فاش اٹھانی پڑے گی، اور یہ یک بینی و دوگوش کانگریسی جماعت کو حکومت کے ایوانوں سے رخصت ہو جانا پڑے گا ——— لیکن ان خیالات کا اظہار کرنے والوں میں سے اکثر نے اس بات پر روشنی نہیں ڈالی، کہ آخر کانگریس کی اس عدم مقبولیت کے اسباب کیا ہیں؟ اور کیوں عوام کی توجہ کانگریس کی طرف سے ہٹ کر دوسری جماعتوں کی طرف پھر گئی ہے؟ ہمارے خیال میں ملک کی آزادی کے بعد سب سے بڑا اور اہم مسئلہ یہاں کے عوام کی ذہنی اور فکری اصلاح کا مسئلہ تھا، جس طرح آزادی ہند سے قبل "آزادی" کا نصب العین ایک مشترک مقصد تھا اسی طرح آزادی کے بعد بھی ان کی پوری زندگی کے لئے ایک ہی نصب العین، ایک ہی فکری راستے اور ایک ہی؛ ایسے تمدنی گہوارہ کی ضرورت تھی، جو ہند والوں کے سماجی، طبقہ واری، معاشی اور معاشرتی اختلافات کو دور کر کے اُن کو رہنے بسنے، کھانے، پینے، اٹھنے بیٹھنے اور کاروبار کرنے کے یکساں مواقع دیتا اور ملک کے سب انسانوں کو ایک مشترک تمدن اور مشترک تہذیب کا رکن رکین بنا دیتا، لیکن بدقسمتی سے اول تو ان مقاصد کی خاطر کانگریس نے کوئی جدوجہد نہیں کی، اور کی بھی تو ایسے غلط اصولوں کی بنیاد پر جو لوگوں کو ملانے کے بجائے ان کو ایک دوسرے سے پھاڑنے والے، ان کے مسائل کو حل کرنے کے بجائے ان کو مشکلات کے بھنور میں پھنسا دینے والے اور ان کی زندگیوں کو سکھ اور چین دینے کے بجائے اُن کی راتوں کی نیند اور دن کا سکون حرام کر دینے والے تھے ——— چنانچہ اب کچھ دوسری جماعتیں سوشلزم اور کمیونزم کے اصولوں کا پرچار کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہیں، اور عوام کو اس فریب میں مبتلا کر رہی ہیں، کہ جو کچھ کانگریس انہیں نہ دے سکی وہ سب کچھ ان کے در دولت سے انہیں مل سکتا ہے، اس لئے ہندوستان کے بھولے اور نا تجربہ کار عوام ان کی طرف تیزی سے کھنچ رہے ہیں، لیکن جہاں تک ہم نے غور کیا ہے، سوشلزم اور کمیونزم کی یہ مقبولیت بھی عارضی اور وقتی ہے، کیونکہ فی الواقع یہ لوگ بھی چند "سنہرے الفاظ" کے سوا اور کچھ نہیں رکھتے، انسانیت کے دکھوں کا علاج کرنے کے لئے ان نئے مداریوں کے پٹارے بھی ویسے ہی خالی ہیں جیسے پرانے مداریوں کے تھے، بیماری کی اصل جڑ تو اس خدا ناشناس تہذیب، قوم پرستی، خود غرضی اور پیٹ پرستی کے اندر پوشیدہ ہے، جس کو وطن پرست کانگریس اور سوشلسٹ دونوں یکساں طور پر قبول کئے ہوئے ہیں، اس لئے اگر وہی پرانا نسخہ نئی پیکنگ اور نئے لیبل کے ساتھ استعمال کیا جائے، تو کیا اس کی تاثیر میں کوئی اضافہ ہو جائے گا؟ —

کلکتہ کے ہنگامے! کچھ دنوں سے کلکتہ کے آس پاس اور خود جنوبی کلکتہ میں متعدد ہنگاموں کی اطلاعیں آ رہی ہیں، ان میں لوٹ مار، پولیس سے تصادم، اور مسلح مجموں کے حملوں کے واقعات درج ہیں، اور بعض مقامات پر تو سنا گیا ہے، کہ گاؤں کے گاؤں پولیس کو چیلنج کر رہے ہیں، لیکن پولیس نے ابھی تک ان کا رخ

نہیں کیا ہے، یہ حالات اگرچہ اس وقت صرف کلکتہ ہی تک محدود ہیں، لیکن ہوا کا رُخ بتا رہا ہے، کہ یہ ہنگامے کیا رنگ لائیں گے۔۔ یہ واقعات محض چند بھڑکے ہوئے لوگوں کی شورش پسندی یا کچھ غنڈوں کی لوٹ مار، یا محض کسی خفیہ پارٹی کی سازشوں ہی کا نتیجہ نہیں ہیں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، موجودہ سماجی، معاشی اور اخلاقی نظام کے زوال اور انہدام کی مختلف شکلیں ہیں، اس میں دراصل وقت کے ملحدانہ تمدنی نظریوں اور خدا ناشناس تہذیبی اصولوں کی خامیاں پوری طرح اجاگر ہو کر سامنے آگئی ہیں، خود غرضانہ اور مادہ پرستانہ زندگی کے بخیئے ادھڑ رہے ہیں، اور انسانیت ننگی ہو کر شیطنت اور ابلیسیت کا خونی ناچ ناچ رہی ہے، پھر چونکہ کلکتہ اور اس کے گرد و نواح کی صورت حال تمام ملک میں عام ہے، اس لئے وہ وقت بھی کچھ دور نہیں معلوم ہوتا، جب کہ سارے ہندوستان میں موجودہ مادی تہذیب آپ اپنے خلاف بغاوت کر دے، اور پھر ایک ایسا انتشار برپا ہو، جس میں وقت کے نظامِ زندگی کے تمام شعبے درہم برہم ہو جائیں، اور یہ لاقانونیت اور نراج کا ایسا دور دورہ ہو کہ حکومت کے متولیوں کا کہیں ڈھونڈے سے بھی پتہ نہ چلے، ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے ملک کو یہ روز بد دیکھنا پڑے، لیکن واقعات کا دھارا جس رُخ پر بہہ رہا ہے، اُس سے یہی اندازہ ہوتا ہے، اگست ۱۹۴۶ء میں بھی کلکتہ میں ہندو مسلم فساد ہوا تھا، اور اس فساد نے پورے ہندوستان کے آئندہ ہونے والے فسادات کو مشعلِ راہ بتائی تھی، بعینہ آج بھی یہی ہو رہا ہے، کہ جن لوگوں کی زندگیاں موجودہ سماجی نظام نے دبکر روندی اور کچلی جا رہی ہیں، وہ ہر جگہ کرب و مصیبت میں مبتلا ہیں، اور کلکتہ ان کے لئے دُور سے ایک منارۂ روشنی ثابت ہو رہا ہے، اور انہیں راستہ دکھا رہا ہے، کہ اپنی مشکلات کا حل کس طرح نکالنا چاہئے۔ ابھی یہ سرچشمہ بہت چھوٹا ہے اور ملک میں جو صحیح ذہنیت کے لوگ موجود ہیں، اگر وہ متحد اور منظم ہو کر صحیح قسم کی کوشش کریں، تو اس کو بند بھی کیا جا سکتا ہے، اس وقت ضرورت ہے، کہ انسانوں کی حقیقی بیماریوں کو سمجھا جائے، اور مغرب پرستی اور مادہ پرستی کے اصولوں کو خیرباد کہکر خدا پرستی کی بنیاد پر ایک نئی تعمیری اور انقلابی جدوجہد کا آغاز کیا جائے، تاکہ موجودہ تخریب پسند انقلاب کی تیاریوں کا رُخ بدلا جا سکے، اور ملک کو تباہی کے گڑھے میں گرنے سے بچا لیا جائے۔

ریاستیں اور حکومت ہند! چند ماہ بیشتر ریاست بھوپال کا ہند یونین میں انضمام عمل میں آچکا ہے، اُس کے بعد ابھی حال میں ریاست ٹہری کا الحاق بھی عمل میں لایا گیا ہے، اور معلوم یہ ہوتا ہے، کہ یہ سلسلہ اس وقت تک برابر جاری رہے گا، جب تک کوئی ریاست بھی ہندوستان میں اپنی جُداگانہ حیثیت کے ساتھ باقی ہے۔ ہمارے خیال میں حکومت ہند نے ریاستوں کے بارے میں جو پالیسی اختیار کر رکھی ہے، وہ خود اندرونِ ملک اپنے ہی اعضائے جسمانی کے خلاف محاذِ جنگ کھول دینے کے مترادف ہے، جس کے نتیجہ میں ہندوستان کی مجموعی قوت بڑھنے کے بجائے گھٹ رہی ہے۔ ٹراونکور، کوچین، جوناگڈھ، حیدر آباد اور کشمیر کے بارے میں جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے، وہ بنیادی طور پر ہندوستان کی جڑوں پر ضرب لگا رہا ہے۔ ہر ریاست کا ایک مخصوص حلقۂ اثر ہوتا ہے، ہر راجہ اور نواب کے گرد اس کے پرستاروں اور بہی خواہوں کا ایک طاقتور گروہ ہوتا ہے، اُس کو رہنما اور سردار کا سمجھ کر اس کے پیچھے چلنے والی ایک پوری کی پوری سوسائٹی ہے، لیکن جب ہماری حکومت اس سوسائٹی، اس گروہ، اور اس حلقۂ اثر کے ساتھ کوئی خوشگوار تعلق اور رابطہ قائم کرنے اور ان کی مجموعی قوت کو اپنا دست و بازو بنا لینے کے بجائے ان سے دو دو ہاتھ لڑ لینے کی ٹھان لیتی ہے، اور قوت کو قوت سے ٹکرا دیتی ہے، تو اس طریقہ سے خود ایک ہی ملک کے باشندے ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہو جاتے ہیں، جیسے انہوں نے کسی غیر ملک کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا ہو، حالانکہ اس کے نتیجہ میں ملک کی قومی دولت ضائع ہوتی ہے، ایک حلقہ میں نظم و نسق درہم برہم ہو جاتا ہے اور پھر انتشار اور نراج کے جرثومے پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اسی طرح ایک دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے، تو یہ اصول خود حکومت کے موجودہ نظام اور برسرِ اقتدار جماعت کے لئے بھی انتہائی مہلک ہے، ہماری حکومت معنوی اعتبار سے ایک سرمایہ دار حکومت ہے، یا کم از کم اسکا نظامِ حکمرانی، سرمایہ داری اور سامراج کے اصولوں سے ہٹا ہوا نہیں ہے، اور اسی طرح ہندوستان کی دیسی ریاستیں بھی اسی اصول کی پابند ہیں، لیکن جب حکومت ہند

خود اپنے ان ساتھیوں کے خلاف زہر تھوکنے کے دہانے کھول دیتی ہے، تو گویا وہ اپنے پیر پر آپ کلہاڑی مارتی ہے۔ اور سرخ انقلاب اور تخریب پسند عناصر کے خلاف اس کے واحد مددگاروں اور ہی خواہوں کو وہ اپنے ہی ہاتھوں ملیامیٹ کر کے کمیونزم کے استقبال کی تیاریاں کرنے لگتی ہے، ہم سرمایہ داری اور جاگیرداری کے سخت مخالف ہیں، اور اس کو انسانیت کے لئے ایک مہلک خطرہ سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن ہم اس بات کے قائل بھی نہیں ہیں، کہ کسی ملک کا کوئی نظام بھی تخریبی انداز میں تبدیل ہو، اور اس سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہو، اگر ہماری حکومت ریاستوں، جاگیرداروں اور زمینداروں کے مفادات کی مخالف ہے، تو اسے ان نظامات کے بدلہ میں کوئی دوسرا اصول ایسا وضع کرنا چاہئے، جو سارے ملک میں ایک خوشگوار تبدیلی کا باعث ہو، ورنہ بغیر کسی ایجابی پروگرام (Positive Programme) کے اس طرح کی سلبی کاروائیاں خود حکومت کے نظام اور باشندگان ملک کی مجموعی دولت اور قوت پر ضرب لگانے کے علاوہ تخریب پسند اور سماج دشمن طاقتوں کی امداد کرنے کے مترادف ہے

پاک وزیر اعظم اسٹالن آباد کو! جب سے یہ خبر آئی ہے، کہ پاک وزیر اعظم مسٹر لیاقت علی خان کو مسیو اسٹالن نے دعوت نامہ بھیجا ہے، کہ وہ اور ان کی بیگم صاحبہ "اسٹالن آباد" ماسکو تشریف لائیں، اس وقت سے یہ خبر برابر مختلف آراء و افکار کا نشانہ بنتی رہی ہے، یہ واقعہ کہ ایک ملک کے حکمران نے دوسرے ملک کے حکمران کو بلایا ہے، بظاہر دو ممالک کے درمیان رشتۂ دوستی استوار ہونے کی ابتدائی علامت ہے، لیکن پاکستان کی موجودہ بین الاقوامی پوزیشن اور خود اس کے اندرونی حالات کے پیش نظر اسٹالن کا یہ بلاوا خاص طور پر قابل غور ہے۔ جہاں تک روسی نقطۂ نظر کا معاملہ ہے، وہ تو صاف ہے، کہ اس نے اس وقت لیاقت علی خان کو اپنے پاس بلا کر پاکستان کی دکھتی رگ کو پکڑ لیا ہے، دولت مشترکہ میں پاکستان کی گرتی ہوئی پوزیشن سے یہ صاف معلوم ہو رہا تھا، کہ پاکستان اپنے وقار کو بلند کرنے کے لئے کسی نئے راستہ کی تلاش کرے گا۔ چنانچہ اسٹالن نے نئے راستہ کی طرف اشارہ کر دیا ہے اب اگر لیاقت علی خان اسٹالن کے بتائے ہوئے راستہ پر چل پڑے یا کم از کم اس کے مخالف راستہ سے الگ رہے، تو اس میں روس کو دو فائدے ہیں، ایک طرف اینگلو امریکن بلاک کا اثر مشرق میں کم ہو جائے گا، اور دوسری طرف مسلمان ممالک میں کمیونزم کی تبلیغ کے لئے نیا دروازہ کھولنے میں سہولت ہوگی، اور اس کے لئے ممکن ہے روس افغانستان اور پاکستان کے معاملہ میں ثالثی کا پارٹ ادا کرکے راستہ پیدا کرے۔

اسی طرح خود لیاقت علی خان کا نقطۂ نظر اسٹالن کے دعوت نامہ کو بسر و چشم قبول کر لینے میں کیا ہے؟ یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے، جس کا ایک جزو تو یہی ہے کہ لیاقت علی خان پاکستان کی بین الاقوامی ساکھ کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں، اور اینگلو امریکی بلاک اور روسی بلاک کے درمیان بالکل اسی طرح کا پارٹ ادا کرنا چاہتے ہیں، جیسا کہ گذشتہ جنگ عالمگیر میں ترکی نے جرمنی اور اس کے حریفوں کے درمیان رہتے ہوئے ادا کیا تھا، گویا ایک لحاظ سے وہ ترکی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں، دوسری طرف ماسکو کے دورے کا ایک دور رس نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے، کہ اس وقت پاکستان میں عوام کے مطالبہ نظام اسلامی سے موجودہ برسر اقتدار طبقہ کو جو خوف دامن گیر ہے، اس کے سدباب کے لئے پروپیگنڈہ کے ہتھیار تیز کئے جائیں، اور عوام کی مرعوبانہ ذہنیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی توجہ کو دوسری طرف پھیر دیا جائے۔ چنانچہ بعد کی خبروں سے جب یہ اطلاع ملی کہ طہران میں خود لیاقت علی خان نے اسٹالن سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی، تو اس سے دوسرے خیالات کے ساتھ ساتھ اس خیال کو بھی تقویت پہنچتی ہے، بہرحال ابھی وقت سے پہلے کچھ نہیں کہا جا سکتا، اس وقت تو "انتظار کرو اور دیکھو" کی پالیسی پر عمل کرنا چاہئے، لیکن جہاں تک اس ملاقات اور راہ و رسم کے اس نتیجہ کا تعلق ہے، کہ پاکستان میں کمیونزم کے لئے راستہ صاف ہو۔ ہم پاکستانی عوام سے عرض کریں گے، کہ وہ ابھی سے اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمہ گیر تیاریاں شروع کر دیں، ورنہ دوستی اور الفت کا یہ نیا باب پاکستان کے حق میں اس کی تباہی کا پہلا جھٹکا ثابت ہوگا، جو رفتہ رفتہ پورے پاکستان ہی کو لے بیٹھے گا۔

مسلم لیگ پاکستان میں! پاکستان میں مسلم لیگ کا اثر و رسوخ بعینہٖ اسی طرح زائل ہو رہا ہے، جس طرح کانگریس کا ہندوستان میں، اور یہ نتیجہ بالکل قدرتی طور پر ظہور میں آرہا ہے، آزادی کے بعد کسی ملک کے لئے سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہوتی ہے، کہ اس کے بجائے، عوام کی اصلاح کا پروگرام بنایا جائے، غلامی نے جو ذہنی اور اخلاقی بیماریاں اُن کو بطور تحفہ دی ہوتی ہیں، ان کا سدِ باب کیا جائے، اور پھر کوئی صالح نظامِ حیات ایسا تجویز کیا جائے، جو نہ صرف اس ملک کے گرے ہوئے اور پسماندہ عوام کے اخلاقی معیار کو بلند کرے، بلکہ حکومت کے کل پُرزے بھی ٹھیک طور پر کام کرنے لگ جائیں، معیشت، سیاست، معاشرت، قانون، عدل وانصاف اور تعلیم کے ایسے اصول رائج ہوں، کہ پوری زندگی کی کایا پلٹ جائے، اور رفتہ رفتہ تمام شعبہ جاتِ حیات میں ایک انقلابِ عظیم برپا ہو جائے، چنانچہ آزادی کے بعد جو پارٹی یا جماعت ان کاموں کی طرف توجہ کرتی ہے، اور ایک واضح، قابلِ عمل اور مفید پروگرام پیش کرتی ہے، وہ کامیاب اور کامران ہوتی ہے، اور دوسری پارٹیاں اپنے سارے پروپگنڈے، ممبروں کی کثرت مال و دولت اور مادی طاقت کی فراوانی کے باوجود روبہ زوال ہو جاتی ہیں، عوام میں اپنا اثر و رسوخ کھو دیتی ہیں، اور خود ان کے اندر سے باغی عناصر نکل نکل کر الگ ہو جاتے ہیں، اور اس طرح رفتہ رفتہ ایک عظیم الشان گروہ کی تاریخ اختتام کو پہنچتی ہے۔ آج پاکستان میں مسلم لیگ اپنی اسی منزل سے گذر رہی ہے، اور جلد یا بدیر اس کی تاریخ بھی ختم ہو جائے گی۔

آزادیٔ ملک کے بعد ہونا تو یہ چاہیئے تھا، کہ لیگ کوئی نیا تعمیری اور اصلاحی پروگرام لے کر اٹھتی یا جیسا کہ اس نے پاکستانی باشندوں سے وعدہ کیا تھا، کہ وہ پاکستان میں "اسلامی نظام" قائم کرے گی، اُس کے لئے کوئی مؤثر قدم اٹھاتی، لیکن مسلم لیگ نے اپنے اس وعدے کو نہ صرف بھلا دیا، بلکہ جن لوگوں نے اس کی حمایت میں آوازیں اٹھائیں اور اس کے لئے ایک تعمیری اور اصلاحی جد و جہد کا آغاز کیا، اُن کی راہ میں روڑے اٹکائے، ان کے رہنماؤں کو اس کے وزیروں نے جیلوں کے اندر ٹھونس دیا، پھر یہ تو اُس کے تخریبی اعمال کا ایک رُخ ہوا، دوسرا رُخ یہ ہے، کہ برسرِ اقتدار آتے ہی لیگی رہنماؤں اور سربراہ کاروں نے ہوس پرستی، جاہ طلبی، رشوت خوری، اقربا پروری، ناجائز ذرائعِ آمدنی، اور شریفانہ لوٹ کھسوٹ کا ایسا بازار گرم کیا، کہ پچھلے انگریزی دورِ حکومت میں بھی ایسی بے اعتدالیاں نہیں ہوتی تھیں، صوبہ سرحد میں قیوم وزارت عوام کے جسم میں اپنے پنجے زیادہ سے زیادہ گاڑتی جا رہی ہے، مغربی پنجاب کی لیگی وزارت کے اعمالِ قبیحہ تو اس درجہ کو پہنچ کر ان کا ایک دنیوی آل ہی یہ برآمد ہوا، کہ لیگ وزارت ٹوٹ کر گورنر راج قائم ہو گیا، اور اب سُنا ہے، کہ خان ممدوٹ کے خلاف تحقیقات جاری ہیں، پھر یہی حال سندھ اور مشرقی بنگال کا ہے، ان مقامات پر بھی لیگ تیزی سے روبہ زوال ہے، اور عوام اپنی دوسری تنظیمیں کرنے میں مشغول ہیں، بہرحال آزادی کے بعد ملک کے صحیح مسائل کو نہ سمجھنے اور ایک بے ڈھنگے پن کا مظاہرہ کرنے کے بعد یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے، کہ مسلم لیگ پاکستان میں اب بھی زندہ رہے گی، اور عوام "لیگ زندہ باد" کے نعرے پہلے کی طرح آج بھی لگاتے رہیں گے۔!

حیدرآبادی مسلمانوں کا اقتصادی مسئلہ! آج کل حیدرآبادی مسلمانوں کا اقتصادی مسئلہ انتہائی نازک ہو گیا ہے، لیکن اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے جو تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں وہ اس سے بھی زیادہ نازک اور مکروہ ہیں، حیدرآباد کے مسلم اخبارات، جمعیۃ العلماء کے رہنما اور وطن پرست کانگریس سے تعلق رکھنے والے ایسے اصحاب جن کو مسلمانوں کی ذات سے تھوڑی بہت ہمدردی ہے، مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ حکومت کے درِ دولت پر جھکا رہے ہیں، درخواستوں اور بھیک کے ٹھیکروں کا ایک انبار ہے جو ان لوگوں کی طرف سے مسلسل حکومت کے دروازوں کی جانب بڑھایا جا رہا ہے، یہ لوگ سڑکوں اور گلیوں میں در بدر کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے بھیک مانگنے والوں کو ترحم کرتے ہیں۔ اور ان کی حالت دیکھ کر ان کو ترس آتا ہے، لیکن یہ بہ خود علماء رہنما اور اخبار باز بڑے پیمانہ پر خود بھی تو بھیک اور خیرات کے ٹکڑوں پر ہی گذر بسر کرنا چاہتے ہیں! ہمارے خیال میں ان کے ذہنی افلاس اور فکری قلاشی کی حالت بھی اسی طرح قابلِ رحم ہے، جس طرح ایک سڑک پر ہاتھ پھیلا کر مانگنے والے کی حالت پر خود ان حضرات کو ترس آتا ہے، یہ درست ہے، کہ

(باقی صفحہ ۴۸ پر ملاحظہ ہو)

گل ہائے رنگ رنگ

"افکارِ آزاد" :- مرتبہ، سید عباس حامی مدراسی ۔

ناشر :- شیخ محمد قمر الدین ۔ اندرون موچی دروازہ لاہور ۔

قیمت :- ۲ /ـ

جس وقت مولانا ابوالکلام نے اول اول اپنے قلم و زبان کا سکہ ہندوستان اور دنیا کے اہلِ علم کے دماغوں پر بٹھانا شروع کیا، تو اس وقت ان کی فکری تگ و تاز کے مرکزی نقطے تین تھے، ایک صحیح اسلامی اصولوں پر انقلاب انگیز ہیئتِ اجتماعیہ کی تشکیل، اور ساڑھے تیرہ سو برس قبل کے پیغام کا اعلانِ عام ۔ دوسرے، مسلم قومیت کا احساس جو اکثر اوقات مخالف قوموں سے مسلمانوں کی کشمکش کے وقت "الہلال" اور "البلاغ" میں جھلک گیا ہے ۔ تیسرے، وطنی بنیادوں پر ہندوستانی قومیت کی تعمیر جدید، جس میں اسلام اور مسلمان کے بجائے اصلی سوال صرف وطنی اتحاد اور آزادیٔ وطن کا تھا، اور جو بالآخر پچھلے دونوں جذبات پر چھا گیا اور مولانا کی شخصیت جلیل القدر مدیر "الہلال" اور "البلاغ" کے مقام سے اتر کر قومی لیڈر کا رکن، قیدی اور بالآخر وطن پرستانہ بنیادوں پر ایک خدا سے آزاد سلطنت کے رکنِ رکین کی حیثیت میں کھو گئی ۔ گویا اس طرح پہلا ابوالکلام فوت ہو گیا، اور نئے ابوالکلام نے جنم لیا، زیرِ نظر کتاب میں سید عباس حامی مدراسی نے مولانا ابوالکلام کے ان مضامین کو جمع کیا ہے، جو ان کے پہلے نقطۂ فکر یعنی اسلامی اصولوں پر تجدیدِ ملت و احیاءِ دین سے تعلق رکھتے ہیں، اب تک مختلف لوگوں نے جو مضامین جمع کئے ہیں، وہ زیادہ تر آخری نقاطِ نظر سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان سے ابوالکلام کی شخصیت پر پوری روشنی نہ پڑتی تھی ۔ اب خدا کا شکر ہے کہ ان کے افکار کا وہ حصہ بھی سامنے آ گیا، جو دراصل ایک نقطۂ فکر رکھنے والے انسان کا مرکزی اور حقیقی نقطہ ہو سکتا ہے، یہی انسانیت کا مقصودِ اصلی ہے یہی اس کے حقیقی ارتقاء کا ضامن ہے، لیکن افسوس ابوالکلام نے اسے پا کر کھو دیا، مگر شیخ نے اسے کس طرح پایا تھا، یہ اس کتاب میں موجود ہے۔ اور خوب ہے ۔ البتہ انہوں نے ع

(خطوط ۴۶ کا بقیہ) مسلمان عوام کا یوں دربدر مارے مارے پھرنا کسی کو بھی پسند نہیں ہے مگر یہ طریقہ علاج بھی غلط ہے، جو ان لوگوں نے بزعمِ خود سمجھ رکھا ہے، گذشتہ نام نہاد اسلامی حکومت کے دور میں بھی مسلمانوں کی نو دو فیصدی آبادی حکومت کے سہارے زندہ رہنے کی عادی تھی، اور اس نے آزادانہ زندگی گذارنے اور اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہونے کی عادت پرانے وقتوں کے شہزادوں کی طرح ترک کر دی تھی، حتیٰ کہ ان کی بڑی سے بڑی اور واحد نمائندہ جماعت بھی اس آزاد زندگی کی مخالف تھی، اور اس کو بھی یہی پسند تھا، کہ مسلمان ہمیشہ حکومت کی چوکھٹ پر ناک رگڑتے رہیں، عہدیدار پرستی، اور صیغہ داری کی لعنتوں میں مبتلا رہیں، اور ایک بیوہ عورت کی طرح پڑوسیوں کی خوشامد اور چاپلوسی کر کے زندگی گذاریں، لیکن آج جبکہ حالات بدل چکے ہیں، اور مسلمانوں کے انہی غلط اعمال کے نتیجہ میں حکومت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ سے چھینی جا چکی ہے، اب تو کم از کم پچھلی غلطیوں سے پرہیز کیا جائے اور اپنی تباہی کے اصلی اسباب کو سمجھا جائے ۔

ہمارے خیال میں مسلمانوں کا اقتصادی مسئلہ ہو یا ان کا تعلیمی اور سیاسی مسئلہ سب کے لئے یہ ضروری ہے کہ مسلمان اسلامی اصولوں پر زندگی گذارنے کا تہیہ کر لیں، کیونکہ جب سے مسلمانوں نے اسلامی اصولوں کو چھوڑا ہے، اس وقت سے ان کے اوپر یہ ساری مصیبتیں یکے بعد دیگرے امڈی چلی آ رہی ہیں۔ اسلام زندگی کا ایک مکمل اور جامع پروگرام ہے، اگر ہمارے اخبار نویس اور مسلمانوں سے ہمدردی رکھنے والے لیڈر صاحبان ان اصولوں کو زندگی میں برتنے کی طرف عوام کو توجہ دلائیں اور مسلم کمیونٹی میں اسلامی اصولِ معیشت، اصولِ تعلیم اور دیگر امور کے بارے میں اسلامی احکام و قوانین نافذ کرنے کے لئے کوئی ادارہ تشکیل دیں، تو مسلمانوں کے سارے دکھ اور بیماریاں بڑی آسانی سے دور ہو سکتی ہیں، ورنہ موجودہ طریقہ کار وقتی اور عارضی طور پر چاہے کتنا ہی مفید نظر آتا ہو، حقیقت میں یہ اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں ہے، بلکہ یہ ایک الٹا حل ہے، جس میں فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہے، کیا ہم توقع رکھیں کہ مسلم عوام کے ذہین افراد اس مشورہ کو عملی جامہ پہنانے کی طرف توجہ کریں گے ـــ !